UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222876
UNIVERSAL
LIBRARY

The Drinched Book

text fiy book

text cut book only

مجلہ

مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے مجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عام) فی پرچہ ۶

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (ص) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعاتِ مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحتِ بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس عنایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیلِ زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلشیہ

مجلۂ مکتبہ

جلد (۳) شمارہ (۱)

بابتہ ماہ خورداد ۱۳۳۸ف م اپریل ۱۹۲۹ء

تصاویر

مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم سید عسکری حسن صاحب بیارسٹرایٹ لا

خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین صاحب مرحوم

فہرست

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات		(۲)
سعدی ایک مصری مقالہ نگار کی نظر میں	از جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متخلص	(۵)
غزل	" " حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب اخگر	(۱۵)
گولکنڈہ کا ایک قدیم ترین ادبی شہ کار	" جناب سید غلام محی الدین صاحب زور ایم اے	(۱۶)
رباعی	" حضرت صفی اورنگ آبادی	(۳۰)
فریاد اشک (نظم)	" جناب محمد جلال الدین صاحب اشک بی اے	(۳۱)
تیر بہدف	" جناب سید شبیر حسن صاحب قیس	(۳۳)
مشاعرات (نظم)	" جناب ابوالفاضل راز صاحب چاندپوری	(۳۴)
قفقاز کے شمال کی زبانیں	" جناب محمد عبدالوہاب صاحب مسلم	(۳۵)
ہندی کی ابتدا اور نشوونما پر ایک نظر	" جناب لالہ سیتارام صاحب بی اے	(۴۰)
عزازیل کا دربار (فسانہ)	" جناب الف لیلہ صاحب	(۴۹)
افکار عفو (نظم)	" مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم	(۵۵)
بادۂ دکن (غزل)	" جناب عمر یافعی صاحب	(۵۶)
تنقید و تبصرہ	" ف م	(۶۸)
اشتہارات		

شذرات

مجلہ مکتبہ کی تیسری جلد کا پہلا نمبر ہم اپنے وعدہ کے مطابق وقت پر شائع کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سے اس قسم کی تاخیر نہ ہوگی۔

یہ نمبر زیادہ تر ادبی مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے اکثر دلچسپی سے پڑھے جائیں گے مولوی سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے نے بھی جن کی علمی کاوشوں سے مجلہ مکتبہ کے ناظرین کو واقف رہنے کا خاص طور سے موقع ملتا رہا ہے کمال مہربانی سے ایک معرکتہ الآرا مضمون روانہ فرمایا ہے۔ آپ کی یہ قابلِ قدر تحقیق ضرور ہماری ستائش کی مستحق ہے۔ پچھلے دنوں جب آپ ڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانے میں ریسرچ کر رہے تھے، آپ کو قدیم اردو مرثیہ نگاروں ہی کے متعلق اس قدر کارنامے دستیاب ہوئے ہیں کہ جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے ہمیں اُمید ہے کہ آپ کی تحقیقات کے نتائج جلد عوام کے سامنے آجائیں گے۔

لچھمی نارائن شفیق (اورنگ آبادی) مصنف تذکرہ چمنستان شعرا کے کلام کا انتخاب جو شاعر کے سارے کلام کی روح ہے، گذشتہ نمبر پر ختم کر دیا گیا۔ اور سال نو سے شفیق ہی کے ایک ہم عصر اور اچھے دکنی شاعر سخن اورنگ آبادی کے کلام کے انتخاب کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ہمارے شریک کار مولوی عمر یافعی صاحب نے سخن کے کلام اور حالات کا مطالعہ کر کے اُس کے سخن ہائے گفتنی و شنیدنی کا نچوڑ لے لیا ہے۔ اور شاعر اور اُس کے معاصرین کی نسبت ایسی معلومات فراہم کی ہیں، جس سے اُردو میں اچھا اضافہ ہو سکیگا۔

اس نمبر میں مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم کی تصویر شائع کی جا رہی ہے۔ عفو صاحب مرحوم حیدرآباد کے نہایت پختہ گو اور مشہور شاعر تھے۔ آپ کے پاکیزہ اشعار عرصہ تک اُردو اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو کر پسند عام کا تمغہ حاصل کر چکے ہیں۔ آج کل بھی آپ کے ورثا سے لے کر اُردو کے کئی رسائل اور اخبارات آپ کے کلام سے اپنی زینت بڑھاتے ہیں۔ مرحوم نے سال گزشتہ بڑی عمر پاکر بماہ اردی بہشت انتقال کیا۔ شعر شاعری کے علاوہ آپ کو نثر نویسی میں بھی بڑا ملکہ تھا اور متعدد کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی زبان و ادب سے بھی بقدر ضرورت واقف تھے سرکار عالی میں مہتممی تعمیرات و آبپاشی کے عہدہ پر فائز رہ کر پیرانہ سالی میں وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوئے۔ باقی عمر تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ہماری فیاض حکومت نے آپ کے علمی مشاغل کی قدردانی کرتے ہوئے آپ کو وظیفہ تصنیف و تالیف بھی عطا کیا تھا۔ آپ کی نثری

تالیفات میں حضرت خالد بن ولید اور نور جہان بیگم کی سوانح عمریاں بہت مقبول ہیں۔

اس نمبر کی دوسری تصویر مولوی سید عسکری حسن صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا کی ہے جو موصوف حیدرآباد کے طبقہ وکلا میں ایک ممتاز شخصیت رکھتے ہیں۔ اسی ماہ کے اوائل میں بمقام گلبرگہ شریف وکلا کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں آپ نے ایک مفید خطبہ صدارت دیا۔ اور طبقہ وکلا کی ترقی و تعالی کے لئے مفید تجاویز پیش کیں نہایت مسرت کی بات ہے کہ حیدرآباد کے مختلف ممتاز طبقوں میں ایک طبقہ وکلا ہی ایسا ہے جو اپنی فلاح و ترقی کے لئے سب سے پہلے کوشاں نظر آتا ہے طبقہ وکلا میں جامعہ عثمانیہ کے قانونی طیلسانین سے قوی امید ہے کہ ایک نئی روح پیدا ہو جائیگی۔ اس کے آثار و علایم صاف نظر آرہے ہیں۔ وکلائے گلبرگہ کی سعی سے یہ کانفرنس اس مرتبہ نہایت کامیابی کے ساتھ گلبرگہ شریف میں منعقد ہوئی جامعہ عثمانیہ کے قانونی طیلسانین کے مفید رسالہ مقنن کا ذکر بھی اس موقع پر ضروری ہے۔ مقنن کے کارپردازوں نے ایک خاص کانفرنس نمبر بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ جس میں حکام عدالت العالیہ اور کارکنان کانفرنس کی متعدد تصاویر ہیں۔ ہم کارپردازان مقنن کو اس کامیاب نمبر پر مبارکباد دیتے ہیں۔

تیسری تصویر خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین کی ہے۔ جو کئی نمایاں حیثیتوں کے حامل تھے آپکی تصویر اور حالات ہم اپنے ایک کرمفرما مولوی احمد عبدالحی صاحب کی مساعی کی بدولت شائع کر سکے حالات موصوف ہی کے مضمون کا اقتباس ہیں۔

خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین مرحوم کی ولادت مدراس کے ضلع چنگل پٹ میں ہوئی۔ آپنے بہت سے مفید کام اپنے ملک کیلئے انجام دیئے تھے تو طبیب لیکن شعر سے بھی لگاؤ تھا علمی کتابیں بھی لکھیں اور حکومت برطانیہ سے "خان بہادر" کا خطاب پایا۔ آپ کے والد خواجہ سرور حسین سرور عربی اور فارسی کے زبردست عالم، اور اچھے ادیب شاعر بھی تھے۔ ابتدائی تعلیم السنہ مشرقیہ میں پائی۔ لیکن بعد میں انگریزی تعلیم شروع کی اور اپنے مذاق کے مطابق ڈاکٹری کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اور بعد تکمیل تعلیم سرکار انگریزی کی طرف سے رایا پورم کے دواخانہ میں ڈاکٹر مقرر ہوئے۔ جو ہر دلعزیزی اُن کو غریب بیماروں میں حاصل تھی وہ بہت کم طبیبوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات وہ خود اپنی جیب سے غریب بیماروں کی امداد کیا کرتے۔ اُن کی صداقت کے مدنظر بعد میں ڈاکٹر صاحب مدراس کے علاقۂ اسپاہ میں ان زخمی سپاہیوں کے علاج کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ جو سرکش رعایا میں نظام قائم رکھنے کی غرض سے بھیجے گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس فنی قابلیت کی بنا پر، موجودہ نواب صاحب بیگن پلی کے دادا نواب فتح علیخاں صاحب نے گورنمنٹ کی ملازمت سے سبکدوش کروا کر اپنے دواخانہ میں طبیب مقرر کرلیا اور رفتہ رفتہ محکمۂ صفائی کی کمشنری بھی انہیں کے سپرد کی۔ حیدرآباد کے بعض امرا جنکو بیگن پلی سے کسی قسم کا بھی تعلق تھا۔ اکثر ڈاکٹر صاحب ہی کے زیر علاج رہے۔ انہیں تعلقات کی وجہ سے بلدہ کے اکثر مآدین سے بھی ڈاکٹر صاحب کی گہری ملاقات ہوگئی تھی۔ جن میں نواب احمد حسین سراجین جنگ بہادر، نواب ذوالقدر جنگ بہادر، نواب سردار یار جنگ، نواب شاد یار جنگ بہادر اور نواب عماد الملک بہادر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

نواب مراحمد حسین امین جنگ بہادر کے ڈاکٹر صاحب سے تعلقات کا ایک خاص واقعہ قابل ذکر یہ ہے کہ نواب صاحب کے والد انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے، اس لئے وہ نواب صاحب کو انگریزی مدرسہ میں بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب انگریزی تعلیم کے بڑے شوقین تھے اور تہیدی دوستی کے اثر اور مشورے کی بدولت نواب صاحب کو انگریزی تعلیم کا بڑا شوق ہوا۔ گویا ڈاکٹر صاحب اس طرح ایک جوہر فرد کو اس حلقہ میں نصب کرنے کا باعث ہوئے جس میں وہ اپنی اصلی خوشنمائیاں دکھانے والا تھا۔ خود نواب صاحب کو اس کا اعتراف ہے کہ خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین کی علمی صحبتوں سے آپ نے بہت کچھ اکتساب کیا۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب کو حج بیت اللہ اور زیارت مقامات متبرکہ کا شوق ہوا، جس کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ وہ قافلہ کے طبیب کا کام انجام دیتے ہوئے، حج سے فارغ ہوئے۔

آپ نے ڈاکٹر شیخ محی الدین مصنف "میٹیریا میڈیکا" کو اس کی تکمیل میں بڑی مدد دی۔ "گزیٹیر آف انڈیا" کی تدوین میں بھی بیگن پلی سے متعلق آثار قدیمہ کا مواد فراہم کرنے میں آپ نے جو کاوش کی اس کا صلہ سرکار انگریزی نے "خاں بہادر" کے خطاب کی شکل میں عطا کیا۔

ڈاکٹر صاحب شاعر بھی تھے۔ خواجہ تخلص کیا کرتے تھے کچھ نعتیہ غزلیں آپ کے افکارات سے باقی ہیں۔

سعدی ایک مصری مقالہ نگار کی نظر میں

از جناب ابو المحاسن محمد محسن خاں صاحب متین

ذیل کا مضمون مصر کے ہفتہ وار اخبار "السیاست الاسبوعیہ" (شمارہ (۹۸)) کے لائق مقالہ نگار مصطفیٰ عبد اللطیف السحرتی کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کو ایران کے گرامی قدر مجلہ "تقدم طہران" کے فاضل مدیرین احمد عبد الرحمٰن فرامرزی نے عربی سے دار السلطنت طہران کی سابع الوقت زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ آج دنیا میں ایسا کون ذی علم انسان ہے جو شیخ سعدی کی حکیمانہ نصائح سے بہرہ مند ہو کر ان کی فقید النظیر شخصیت سے متاثر نہ ہوا ہو۔ سعدی کے متعلق انتقادی مقالوں کے قلمبند کئے جانے کی جس قدر ضرورت ہے اس سے ہر صحیح المذاق انسان واقف ہے اور یہ امر بھی محتاج بیان نہیں کہ ابھی اس میدان میں خامہ فرسائی کے لئے بہت کچھ گنجائش ہے۔ بدقسمتی سے اردو میں اس کے متعلق صرف دو یکے "حیات سعدی" کے سوا اور کوئی مستقل کتاب موجود نہیں۔ اگر زمانہ اتنی مہلت دے اور تمام چیزیں ہمارے منشا کے مطابق مہیا ہو جائیں تو انشاء اللہ ہم اس موضوع پر آئندہ کوئی مستقل مقالہ پیش کریں گے۔ لیکن سردست ہم مقالہ مذکور کے ترجمہ پر جو خاص ناظرین "مکتبہ" کے لئے فارسی سے لیا گیا ہے۔ اکتفا کرتے ہیں۔

(ابو المحاسن متین)

تمہید

شاید آپ اس واقعہ سے متعجب ہوں گے کہ ایک پرند اپنے طلسم زا آشیانے سے نکل کر کس طرح آفتاب کے چہرہ کے روبرو قہقہے لگاتا نسیم صبحگاہی کے دوش بدوش اٹکھیلیاں کرتا اور گل و غنچہ کے حسن و جمال کے مقابل غزل سرائی کرتا ہے۔ بارھویں صدی کے اوائل میں ایک ایسے ہی پرندے نے بھی بصورت بشر فضائے وجود میں پرپری لی۔ یہ میٹھے سروں میں گیت گانے والا پرند سعدی شاعر نے شیراز کی فضا میں اپنے راگ الاپے اور جس کے سننے کے اشتیاق میں ایک عالم نے سکوت اختیار کر کے اپنے کان لگا دیئے۔ اس نے عالم تنہائی میں اپنے سحر طراز قلم کو حرکت دے کر اہل دنیا کے

رد بر و جمال و تناسب کو پیش کیا، اس نے خواص و عوام، بادشاہ و درویش، امیر و فقیر کے باب میں گفتگو کر کے، حسن ظرافت میں چار چاند لگا دیئے اس نے بلا لحاظ، حکمت کے وہ انمول موتی، جو شاہوں کے شایان شان ہیں، ہر کس و ناکس کے سامنے بکھیر دیئے۔ اس نے بے تکلف دوستوں اور ہم مذاق ساتھیوں کے سامنے، اپنے لب تبسم کھولدیئے۔ اہل ذوق نے شوخی و ظرافت اور شیرینی و حلاوت کو یہیں سے حاصل کیا۔

یہ وہ شاعر ہے جس نے سطح ارض کو اپنی شعاعوں سے جگمگا دیا اور اقطاع عالم کو عطر میں بسے ہوئے پھولوں کی بو سے مہکا دیا تھا، وہ نہ دل آویز چہرہ رکھتا تھا اور نہ خوبصورت جسم نہ بنفشی رنگ کے بال جس سے لوگوں کے دل دام میں آجائیں۔ بلکہ وہ ایک سادہ سیدھا شیخ تھا جو سر پر ایک عمامہ رکھے، جسم میں لاجوردی رنگ کا لباس پہنے اور ہاتھ میں ایک عصا، فقیروں کی مانند لئے ہوئے رہتا تھا۔ لیکن اس کی جس چیز نے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور عقلوں کو مسحور و مفتون بنا لیا، بلاشبہ وہ اس کا صاف دل، پاک وجدان اور متوالی روح ہے۔ سعدی لڑکپن میں اپنے ہمعمروں میں ممتاز رہا ہے، وہ جوانی میں ایک زبردست زبان آور اور بڑھاپے میں ایک عارف ربانی تھا۔ اس دنیا کے نامور ترین شخص نے اپنی تصانیف میں اس طرح زندگی کی تصویر ماہرانہ انداز میں کھینچی ہے کہ اس سے بہتر کھینچنا ناممکن ہے ہم خوشگو پرندنے عہد تاریک میں پر و بال نکالے، سکون و آرام کی حالت میں ایک غزلخوان بلبل اور موسم خزاں و خشک سالی کے زمانے میں ایک ہنستا ہوا پھول بنا رہا۔

۲۔ اس کا وطن اور محل تربیت

اس کا اصلی نام مشرف الدین اور اس کے والد کا نام مصلح الدین عبداللہ[1] ہے۔ سعدی تخلص اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے والد سعد زنگی کے ہاں ملازم تھے اسی وجہ سے سعدی کے تخلص کو اسکی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کو بچپن ہی میں باپ کے گزر جانے کی وجہ سے یتیمی اور بے پدری کا مزا چکھنا پڑا[2]۔ اسی باعث سے وہ یتیموں پر ترس کھاتا اور دل جوئی کرنے اور ان پر شفقت رکھنے کے متعلق اپنی مؤلفات میں لوگوں کو وصیت کرتا ہے[3]۔

---

[1] اکثروں نے اس کے برعکس لکھا ہے۔

[2] مرا با شد از درد طفلان خمیر۔ کہ در طفلی از سر بر نہم پدر (بوستان باب دوم)

[3] پسمردہ را سایہ بر سر فگن۔ غبارش بمشکان و خارش بچین (بوستان باب دوم)

باپ کے انتقال کے بعد تحصیل علم کے ارادہ سے، وہ بغداد روانہ ہوکر (یہ وہ مقام ہے جو ان ایام میں تربیت و تمدن اور علوم و عرفان کا مرکز بنا ہوا تھا) حصول علم میں مشغول ہو گیا مذاہب اربعہ کے علوم سے فارغ ہونے کے بعد اس کا رجحان عرفان کی جانب ہوا اور اس نے شیخ شہاب الدین رح کا دامن تھام لیا۔ خلاصہ یہ کہ سعدی تیس برس تک تحصیل علم و فضل میں مصروف رہا اور آخر کار وہ ایک بزرگ ترین مفکر ہو گیا۔

۳۔ اسکی سیر و سیاحت

جب وہ تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تو سیاحت و جہان نوردی کی آتش شوق اس کے سینے میں بھڑک اٹھی اور مدتوں وہ مسافرت میں مشغول رہا۔ اس نے زندگی کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، اس کو ہر طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس نے مختلف اقوام کی خصوصیات اور نوع انسانی کی عادات و خصائل سے واقفیت پیدا کی تھی۔[۱]

اس کو ہر ایک چمن سے گلہائے یاسمین کے چننے، ہر ایک شخص کی زبان سے گفتگو سننے اور ہر ایک خرمن سے خوشہ چینی کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔[۲]

پہلے پہل وہ ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔[۳] پھر وہاں سے ترکستان کی راہ لی اس کے بعد یمن کے ہرے بھرے چمن زاروں اور اس کی خوشگوار آب و ہوا کی کشش نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہیں سے وہ حبش کی جانب روانہ ہوا۔ مکہ اور مدینہ کی بھی زیارت کی۔ پہلی مرتبہ جب وہ مکہ کی زیارت سے مشرف ہوا ہے، یہ شرف اس کو اپنے محترم استاد شیخ عبدالقادر گیلانی کی معیت میں نصیب ہوا۔[۴] بیان کیا جاتا ہے کہ سعدی نے پندرہ دفعہ سے زیادہ کعبۃ اللہ کے حج کئے ہیں ان میں سے اکثر پیادہ کئے ہیں، اس کے بعد اس نے

---

[۱] وز اقطار عالم گشتم بسے۔ بسر بردم ایام با ہر کسے۔

[۲] تمتع ز ہر گوشۂ یافتم۔ ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم۔ (دیباچہ)

[۳] بتے دیدم از عاج در سومنات۔ مرصع چو در جاہلیت منات الخ (بوستان باب ہشتم)

[۴] چونکہ گیلانی کی وفات ۵۶۱ھ میں ہوئی ہے اور سعدی کا تولد ۵۸۰ھ میں۔ اس اعتبار سے سعدی ان کے زمانہ میں نہیں ہوا۔ شاید گلستان میں جو اشارہ شیخ سے ملاقات کرنے کے واقعہ کی طرف پایا جاتا ہے وہ تحریف کتاب کی وجہ ہے۔

شام کی جانب عنان عزیمت پھیر دی اور عرصۂ دراز تک دمشق میں زندگی تیر کی اور وہیں پر اس نے عام شہرت حاصل کی۔ اس طور پر کہ بعلبک[1] میں، اس کی مجلس وعظ میں حاضر رہنے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے لیکن آخر کار اس نے دمشق میں رہنے سے بیزار ہو کر صحرانشینی اختیار کی اور ایک زمانہ تک بیت المقدس کے صحرا میں گھومتا رہا۔ اس اثنار میں ولندیزیوں کے ایک دستہ نے اس کو گرفتار کر کے طرابلس[2] کو بھیج دیا۔ ایک مدت تک وہاں کے قلعہ میں اس سے سخت کام لئے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ حلب کے کسی ذی ثروت امیر نے اس کو دس دینار کے عوض خرید کر اپنی بیٹی اسکے حوالے کی۔ لیکن سعدی کا دل اس عقد سے بجائے خوش ہونے کے ہمیشہ ناراض ہی رہا۔ اس واقعہ کی کیفیت کو یہی بہتر ہے کہ ہم اس کے اپنے معجز اثر بیان پر چھوڑ دیں۔

"دمشق کے دوستوں کی صحبت سے مجھے رنج پہنچا' میں نے "بیابان قدس" کی جانب روانہ ہو کر بانوروں سے انس پیدا کیا۔ اس کے بعد مجھے فرنگیوں کی قید میں گرفتار ہونا پڑا۔ طرابلس کی خندق میں یہودیوں کے ساتھ مجھے مٹی اٹھانے کے کام پر مقرر کیا گیا' یہاں تک کہ اس طرف سے حلب کے ایک رئیس کا (جو مجھ سے پہلے سے متعارف تھا) گزر ہوا۔ اس نے مجھے پہچان کر کہا۔ یہ کیا حالت ہے اور ایسے کیوں گزار رہا ہے؟ میں نے کہا میں لوگوں سے بیزار ہو کر اس خیال سے پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف بھاگا کرتا تھا۔ کہ خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ مشغول نہ رہوں تو ہی اندازہ کر کہ اس وقت میری کیا حالت ہوگی' جب کہ مجھے نامردوں کے طویلے میں گزارنا پڑتا ہے!۔

پائے در زنجیر پیش دوستاں به که با بیگانگان در بوستاں

اس نے میرے حال پر ترس کھایا اور دس دینار کے عوض مجھے قید سے رہائی دلائی اور اپنے ساتھ حلب لے گیا۔ اس کے ایک بیٹی تھی جس کو اس نے میرے عقد نکاح میں دیا' مدتوں اس کا سود نیار مہر مجھ پر چڑھا رہا۔ لڑکی بدخو' لڑاکا اور نافرمان تھی اس نے

---

[1] گلستان کے دوسرے باب میں اس مجلس وعظ کا خود شیخ نے اس طرح ذکر کیا ہے۔ در جامع بعلبک وقتے کلمۂ چند بمی گفتم بطریق وعظ باجماعت افسردہ دل مردہ راہ از عالم صورت بعالم معنی بردہ۔ دیدم کہ نصیحم در نمیگیرد و تاثیرم در نمیگیرد' دریغ آمد تربیت سنوران و آئینہ داری بدرمحلت کوران و نمکین' اندھی بازبود و سلسلۂ سخن دراز (تبیین) [2] اس سے مراد طرابلس الشام ہے۔ (تبیین)

زبان درازی شروع کر دی اور میرا عیش تلخ کر دیا جیسا کہ عقلا نے کہا کہ :-

زن بد در سرائے مرد نکو ہم درین عالم است دوزخ او

ایک دفعہ اس نے طعنہ دیکر کہا :- کیا تو وہ آدمی نہیں ہے جس کو میرے باپ نے "قید فرنگ" سے دس دینار میں خریدا ؟ میں نے کہا۔ ہاں سو دینار کے عوض اس نے مجھے تیری قید میں گرفتار کرا دیا[1]"

اگرچہ سعدی نے اس عورت کی بدولت بہت بڑی ثروت حاصل کی مگر سیر و سیاحت کے پیچھے پڑ کر ایشیائے کوچک کا طول و عرض کھوند ڈالا۔ بیان کرتے ہیں کہ اس نے یورپ کا بھی سفر کیا تھا۔ بہر صورت سعدی دوسرے تیس سال بھی اسی طریقہ پر سیر و سیاحت میں مصروف رہا۔

۴۔ اس کی زندۂ جاوید مؤلفات

سعدی نے پہلے تیس سال تحصیل علم میں اور دوسرے تیس سال سیر و سیاحت میں صرف کئے جس وقت وہ ستر سال کی عمر کو پہنچ کر اپنے اصلی وطن شیراز کی جانب لوٹا تو دیکھا کہ ملک بادشاہ عادل ابوبکر سعد کے زیر سایہ امن و آرام میں ہے۔ سعدی کو یہ حالت پسند آگئی شہر کے قریب ہی ایک چھوٹا سا مکان لیکر رہ پڑا۔

سعدی کی ذہنیت اپنی مانوس خلوت گاہ سے نکل کر عرصۂ ظہور میں آئی وہ پھول جن کی عطر آگین خوشبو کے سونگھنے سے کوئی شخص سیر نہیں ہوتا تھا یہیں دستہ کی صورت میں بندھے ہوئے آپہنچے۔

سعدی نے اپنی سب سے پہلی کتاب یعنی "بوستان"[2] بیاسی سال کی عمر میں نظم کی۔ اس کے ایک سال بعد ایک اور بینظیر کتاب "گلستان" یعنی پھولوں کا باغ کے نام سے بعجلت تمام تالیف کی۔ اس نے اس کتاب کو جس کی تکمیل کے لئے کئی ایک سال کی مدت درکار تھی ایک ہی سال میں تمام کی[2] سعدی کی حقیقت آرا و افکار اور اس کی حکمت

---

[1] اصلی مقالہ نگار نے اس عبارت کو السنہ خارجہ سے ترجمہ کیا ہے لیکن ہم نے بجائے اس کے گلستان کی یہ عبارت جسے درج کر دی ہے۔ (چونکہ ہماری اردو زبان فارسی نہیں ہے اس لئے ہم کو بھی اصل مقالہ نگار کے تتبع میں بجائے گلستان کے اصل عبارت نقل کرنے کے اردو میں ترجمہ کرنا پڑا۔ مترجم)

[2] سعدی نے خود گلستان کے دیباچہ میں یہی لکھا ہے اس کتاب کے تمام ہونے میں دو تین ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ اس سے کہ اس نے اوائل بہشت کے اوائل میں ابتدا کی اور بہار کا موسم گذرنے سے پہلے تکمیل کر دی۔ چنانچہ کہتا ہے۔ "ہنوز از گلستان بقیتے ماندہ بود کہ کتاب گلستان تمام شد"

نہ ختم ہونے والے چشموں کی بنیاد یہی دو کتابیں ہیں[1]۔ مدت ہائے دراز سے یہ دونوں کتابیں ادبا رکے الہام کا سرچشمہ اور گمراہوں کے لئے شمع ہدایت بنی رہیں جن کی شعاعوں سے مشرق اور مغرب کے فضلا نے استفادہ کیا اور کئے جا رہے ہیں۔ سعدی ایک اور کتاب بھی رکھتا ہے جو بندا نامہ[2] کے نام سے موسوم ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کتاب بھی اس کی پر ذوق کتب سے ہو گی۔ بوستان میں تمام کے تمام شعر ہیں لیکن ان تینوں کتابوں میں سب سے اچھی کتاب وہی پھولوں کا باغ (گلستان) ہے یعنی یہ کتاب ایسا مجموعہ ہے جو اخلاقیات، فلسفہ اور حکایات پر مشتمل ہے۔ اس نے اس میں نظم و نثر کے ذریعہ حسن و ظرافت کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے ساحرانہ اسلوب میں قلمبند کیگئی ہے جس سے قاری کے دل میں شرکت اٹھتی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ جو حصہ جاذب توجہ نظر آتا ہے وہ عشق اور عشاق کا باب ہے۔ حقیقت میں سعدی نے موثر ترین جذبات کا انتخاب کر کے انسان کے حساس ترین اعصاب کا پتہ چلایا ہے۔

درحقیقت وہی شخص اس کی قدر و قیمت اور ان کے علمی پایہ کا اندازہ کر سکتا ہے جس نے ان کو اچھی طرح پڑھ کر جمال عبارت اور کمال معنی کا مطالعہ کیا ہو۔

اہل مشرق پر واجب ہے کہ اس مشرقی فلسفہ کی چاشنی سے لذت اندوز ہوں۔ خاصکر اس صورت میں جب کہ اہل مغرب ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر کے اس کی سرچشموں سوتوں سے سیراب ہوئے ہوں۔

"اڈورڈ براؤن" نے اس کے اکثر حصوں سے استفادہ کیا ہے۔ یورپ کا یگانہ روزگار فسانہ نگار "لافونتن" نے بھی اس کی کتاب کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے اس کی حکایات میں سے ایک حکایت کی نقل کی ہے۔

یورپ کے اکثر شعرا نے بھی ہمیشہ گلزار سعدی سے عطر میں بسے ہوئے پھول چنے ہیں اور چنتے رہیں گے۔ چنانچہ ان کا ہمعصر فرانسیسی شاعر "پول خوزے" جو دلنواز صدا البلبل ہے

---

[1] چونکہ فاضل مقالہ نگار زبان فارسی سے واقف نہیں ہے اور نہ سعدی کی غزلیات کی علاوہ دوسری زبانوں میں اتنی شہرت ہے (یہ وجہ ہے کہ اس نے غزلیات کی حقیقت کا پتہ نہیں لگایا۔

[2] ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے کونسی کتاب مراد ہے شاید اس سے مراد وہی بدائع ہو گی لیکن ہم اپنے قیاس کی بنا پر کہتے ہیں کہ شارح نے اس نام کے پڑھنے میں غلطی کی ہے۔ بندامہ در اصل پند نامہ کا معرب ہے جس کی صورت تعریب کی وجہ سے بگڑ کر اس طرح ہو گئی ہے۔ (مترجم)

وہ سعدی ہی کے ساز سے متعلق ہے اور اس حقیقت کو فرانس کے ایک ادیب نے آشکارا کیا ہے۔ فی الحقیقت سعدی کی کتب نے قرون وسطیٰ سے لیکر تا حال روئے زمین کو مہکا دیا ہے۔ یہ عشق و جمال، پند و حکمت، اخلاق و فلسفہ اور تمام چیزوں کی ابتداء سے انتہا تک آدمیوں کو تعلیم دیتی ہے۔

جو شخص شمع اور پروانے کی حکایت پڑھتا ہے وہ کچھ دوستی و وفاداری اور دوستوں کی محبت کے ساتھ ایثار نفس کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔[۱]

"حکایت جوانمرد و تنگدست" ہم کو جوانمردی و انسانیت کے تعلیم دیتی ہے[۲] اور "حکایت بادشاہ بیمار" سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ سعدی ظالموں اور ستم پیشہ درحاکموں کے ظلم سے کس قدر متاثر ہوا ہے۔[۳] حکیمانہ مقالوں کو پڑھنے والا، سعدی کے تبحر کے عالم کا، اس رسم و رواج کے ذریعہ ــــ کہ نوعمر لڑکیاں بوڑھے کمسٹ آدمیوں کو دی جاتی ہیں ــــ بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔[۴]

خلاصہ یہ کہ سعدی کی تمام کی تمام حکایتیں پر لطف، دل کو موہ لینے والی بلند معانی اور بلند پایہ فلسفہ کی حامل ہیں۔ شاید، یہ بات نامناسب نہ ہوگی اگر ہم یہاں اس کے بعض اقوال نقل کریں، وہ گلستان کے آخر میں کہتا ہے:[۵]

"ای کہ بنجاہ رفت در خوابی ــــ مگر این پنج روز دریابی"

"مخل آنکس کہ رفت و کار نساخت ــــ کوس رحلت زدند و بار نساخت"

.....

"رفتن و نشستن بہ کہ دویدن و گسستن"

"اسب تازی دو تگ رود بشتاب ــــ شتر آہستہ میرود و شب و روز"

---

[۱] کسے گفت پروانہ را کے حقیر ــــ برد دوستی در خور خویش گیر (بوستان باب سوم)
[۲] یکے را کرم بود و وقت نہ بود ــــ کفافش بقدر مروت نہ بود
کسے را کہ ہمت بلند اوفتد ــــ مرادش کم اندر کمند اوفتد (بوستان باب دوم)
[۳] یکے را حکایت کنند از ملوک ــــ کہ بیماری رشتہ کرد شان چو تک (بوستان باب اول)
[۴] زن جوان را تیرے در پہلو نشیند بہ از آنکہ پیرے ..... (گلستان باب پنجم)
[۵] یہ ابیات گلستان کے شروع میں ہیں، ہم نے بجائے ان کے کتاب کے اکثر نسخوں کی مانند خاتمہ نقل کر دی ہیں۔

بداندیش را خوے شیریں ببین کہ ممکن بود زہر در آنگبین" (بوستان)

.....

وقتیکہ محبوبہ سر بہ سینہ ات نہادہ دست را از روے محبت فشارد و برائے افیکہ ترا بوسہ سد برق شکر خندہ از میان دندان ہائے مروارید گونش پرید۔ فوراً لب بلبش نزدیک کن زیرا نمیدانی در پشت آن خندۂ شکرین چہ پنہان باشد[1]"

مختصر یہ کہ سعدی نے حکمت کو شوخی کے لباس اور شیریں عبارت میں کچھ اس طریقہ کے ساتھ بیان کیا ہے، درآں حالے کہ وہ نادر ہے۔ ہنوز ہماری زبان میں اس شاعر کی کتابوں کا جو در اصل حکمت و عملی فلسفہ ہیں، پورا ترجمہ نہیں ہوا ہے[2]۔ برخلاف اس کے خیام کے اس فلسفہ کا جو ماوراء الطبیعہ سے متعلق ہے ترجمہ ہو چکا ہے!

۵۔ سعدی کی شاعری

سعدی، تمام مشرقی شعراء میں جو تمغائے امتیاز رکھتا ہے بلاشبہ، وہ دوستانہ حقیقت اور جوش و صداقت پہ مبنی ہے یعنی گلہائے سعدی، گلہائے حقیقت ہیں نہ کہ گلہائے خیال، لیکن اسی طریقہ پہ فطرت کے مطابق یہ پھول کانٹوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

جس وقت کوئی شخص اس کے شیریں قصائد اور غزلیات کو پڑھتا ہے تو وہ ان پر وحی الٰہی اور الہام آسمانی کا گمان کرتا ہے۔ کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ پھول کسی انسان ہی کے دل سے نکلے ہیں اور ان آسمانی راگوں کو کسی انسان نے ہی الاپا ہے۔

جس چیز نے زیادہ تر سعدی کے شعر میں جان ڈالدی ہے اور اس کو یہ رونق و جمال بخشا ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ اس کے طول و طویل سفر ہیں[3] جن کے باعث اس نے ہر ہر طبقے کے آدمیوں سے ربط و ضبط بڑھا کر اقسام اقسام کی معاشرتوں سے واقفیت بہم پہنچائی اور مختلف اقوام میں قسم قسم کے محاسن اور جمال و تناسب کے مظاہر کے مشاہدے کئے ہیں۔

سب سے آخر یہ بات قابل ذکر ہے کہ سعدی سر تا پا حکمت و تناسب کا نمونہ ہے

---

[1] ہم نے اس معنی کی کوئی چیز سعدی کی کتابوں میں نہیں پائی۔

[2] عربی میں گلستان کا دو تین دفعہ ترجمہ ہو چکا ہے شاید مقالہ نویس اس سے آشنا ہے۔

[3] سعدی سفر کے فوائد کے متعلق کہتا ہے۔ تا بدکان نانمی گردی۔ ہرگز ای خام آدمی نشوی۔

لوگ، جب تک حکمت و تناسب کو دوست رکھیں گے سعدی کے والہ و شیدا بنے رہیں گے۔

۶۔ اس کا عرفانی مسلک

جو شخص، گلستان کا، سطحی نظر سے مطالعہ کرتا ہے وہ اپنی جگہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ سعدی ایک عیاش اور شہوت پرست شخص تھا۔ ایسی صورت میں، جب کہ اس کی حقیقت سوائے اس کے نہیں کہ اس نے اقوال کو شوخی و بذلہ سنجی کے ساتھ ملا دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے فلسفہ کو لوگوں کے قلوب میں داخل کر کے، مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس طور پر کہ کوئی طبیب، کڑوی دوا کو شیریں اجزاء کے ساتھ ترکیب دیتا ہے تاکہ اس کا علاج طبیعتوں کو پسند آجائے۔

سعدی اس ذات ذو الجلال سے عشق رکھنے والا عارف ہے جس نے اس مسلک کے بارہ میں، برسوں جامع دمشق میں، نہایت پر قیمت درس دئے ہیں۔ اس نے گلستان و بوستان میں اس لئے قرآنی تخم بوئے ہیں کہ اپنی شیریں عبارتوں اور حکایتوں کو کتاب مجید کی آیتوں کے ذریعہ دیدہ زیب بنائے۔ سعدی شخصی تدین میں متعصب اور خشک واقع نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ حقیقت دین نیکوکاری اور نفع انسان کی خدمت گذاری و محبت ہے نہ کہ تسبیح و سجادہ و دلق۔[1]

۷۔ اس کے اخلاق و اوصاف

سعدی بڑا سخی اور فیاض شخص تھا۔ اس طور پر کہ اس کی فیاضی اسراف کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ وہ بڑا خوش مزاج، خوش معاشرت شیریں زبان، بذلہ سنج، خوش طبع، وجیہ، روشن رو، اور پاک وجدان حریت خواہ اور صلح پسند مسلک کا شخص تھا! اس کی آزادی پسند طبیعت اس کے اکثر اشعار میں اپنی جھلکیں دکھاتی ہے۔ وہ اس بات کا معتقد تھا کہ جماعت انسانی کی تنظیم و اصلاح اصل (جڑ) ہے اور بادشاہ و رئیس بمنزلہ پتوں اور ڈالیوں کے ہیں[2] نفس الامر میں یہ لوگ بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے مقرر کئے گئے ہیں[3]

سعدی نہایت ذہین، طباع اور حاضر جواب تھا، اس باب میں اس کی جن حکایتوں کر

---

[1] عبادت بجز خدمت خلق نیست — بتسبیح و سجادہ و دلق نیست (بوستان باب اول)
[2] رعیت چو بیخ است و سلطان درخت — درخت ای پسر! باشد از بیخ سخت (" ")
[3] بادشہ پاسبان درویش است — گرچہ نعمت بزر دولت اوست
گو سفندند رائے چوپان است — بلکہ چوپان برائے خدمت اوست (بوستان باب اول)

نقل کیا گیا ہے ان کے منجملہ ذیل کی حکایت بیان کی جاتی ہے جس وقت وہ تبریز میں وارد ہوا تو وہاں کے ایک شاعر نے پوچھا تو کہاں کا رہنے والا ہے؟ اُس نے کہا "شیراز جنت طراز" کا! تبریزی نے کہا کہ تبریز میں شیرازی اس کثرت سے ہیں کہ ان کی تو تعداد کتوں سے بھی "بیشتر" ہے۔ سعدی نے کہا کہ مگر شیراز میں تبریزی کتوں سے بھی کمتر ہیں۔

۸۔ اس کی عمر کا آخری حصہ

سعدی نے اپنی عمر کے اواخر کو شیراز میں گذار کر اپنی سکونت کے لئے ایک مکان بستی سے دور کسی گوشہ میں تجویز کیا مختلف طبقے کے لوگ عموماً ہر طرف سے اس کی ملاقات کے لئے آتے بالخصوص ذی رتبہ بادشاہ اپنے سرنیاز کو اس کے آستانے پر جھکاتے اور نذرانے اور تحفے اس کے لئے لے آتے لیکن وہ بندۂ خدا سوائے کھانے کی چیز کے اور کچھ قبول نہیں کرتا۔ وہ بقدر سدِ جوع لے کر باقی کو زنبیل میں رکھ چھوڑتا اور اس کو کھڑکی میں لٹکا دیتا کہ فقرا اور مساکین آکر اس کو اٹھالیں۔ سعدی کی گوشہ نشینی و زہد کے خصوص میں ایرانیوں نے ایسی بہت سی حکایتیں نقل کی ہیں جن سے اس کی کرامات و تصرفات پر روشنی پڑتی ہے۔

۹۔ اس کی وفات

لوگوں کو سعدی کی عمر کے بارہ میں اختلاف رہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ نوے سال تک جیا بعض بیان کرتے ہیں کہ سو سال تک اور ان کے سوا بعضوں کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ۔ بہرصورت سعدیؒ نے دنیا سے رحلت کی اور ایک نہایت حسین و خوش مقام پر یعنی اسی جگہ پر جہاں اس نے اپنی عمر کا آخری حصہ گذارنے کے لئے سکونت اختیار کی تھی مدفون ہوا۔ اور کثیر ادبی ثروت کو، جو ختم ہونے والی ہے، اپنی یادگار میں چھوڑا۔ اس کی روح نے مدتوں روئے زمین کو مہکا دیا تھا اُس نے آسمان کی طرف پرواز کر کے بہشت برین کو بھی معطر کر دیا۔ سعدی وہ مردِ کامل تھا جس نے اپنے عطر آگین پھولوں کو دنیا کے روبرو بکھیر دینے کے بعد اہل دنیا کو جمال و تناسب کی تلقین کی۔ اس نے حکمت کے باغ ان کے گوش وجود تک پہنچا دیئے اور وہ وجود ہمیشہ ان کو دہراتا رہے گا۔ گلہائے سعدی ہمیشہ تر و تازہ رہنے اور خوشبو دینے والے ہیں اور اس کے روح پرور نغمے بھی ابد تک گرانبہا عزیز اور مرغوب طبع رہیں گے!

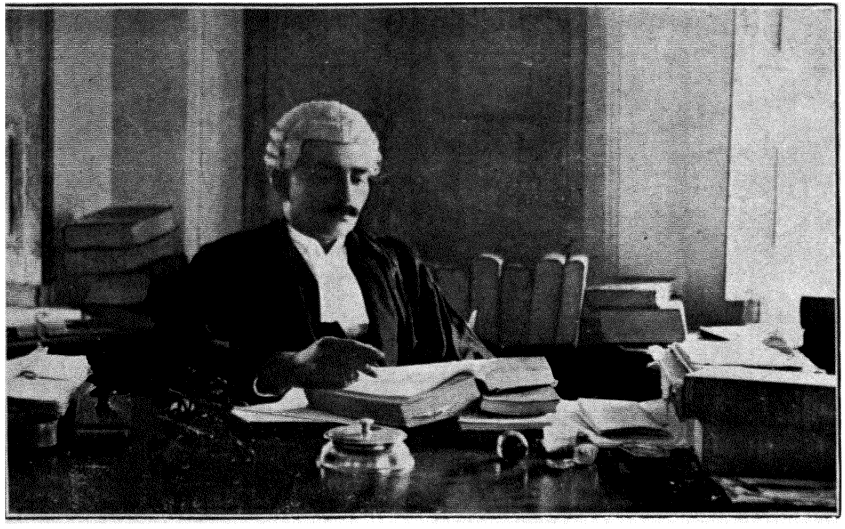

سید عسکری حسن اسکوئر۔ ایم۔ اے۔ بیرسٹر

غزل

علامہ حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب اخگر حیدرآبادی

کوئی ہم سے یہ پوچھے — بے خودی میں کیا پایا — زیست کی ملی لذت — وصل کا مزا پایا
دل کی آرزو دل میں — رہ گئی ہوس بنکر — کہو کے اس کو پہلو سے — خوب مدعا پایا
بے پتا نشان اس کا — گم ہے آگہی اپنی — عقل کو بھی اس رہ میں — کچھ نہ رہنما پایا
ہم نہ کہتے تھے دل سے — ہے جفا شعار اس کا — پھر کوئی شکایت کیا — جس نے جو کیا پایا
حسن و عشق یہ دونوں — مجمع مظاہر ہیں — اس کو جا بجا دیکھا — اس کو جا بجا پایا
عقل کا ہے کیا امکان — منزل تجسس میں — اس کو جس قدر ڈھونڈا — کچھ نہ یکسر پایا
کیا ہوا کہ واعظ کو — آج صحن مسجد میں — ہوش اڑا ہوا دیکھا — دل گیا ہوا پایا
دیر میں حرم میں بھی — جا کے جا بجا ہم نے — ڈھونڈھکر اوسے زاہد — کیا کہیں کہ کیا پایا

ظلم کی گئی شوخی — رحم آگیا اوس کو
در پہ اپنے اخگر کو — یوں لہو بھرپیڑا پایا

گولکنڈہ کا ایک قدیم ترین ادبی شہ کار

از

مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے

مولوی زورؔ صاحب یورپ میں لسانیات کی تحقیقاتی تعلیم کے ساتھ اردو ادب اور بالخصوص دکھنی یا اردوئے قدیم میں جو مہتم بالشان ریسرچ فرما رہے ہیں اس سے ناظرین مکتبہ بخوبی واقف ہیں اور کسی مزید صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ آپ نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی نایاب مخطوطات اردوئے قدیم و جدید کے تحقیقی مطالعہ کے بعد ان کتب خانوں کے کٹلاگوں کی تصحیح بھی کی جس کو مستشرقین یورپ نے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ نیز آپ نے پیرس اور ویانا کے کتب خانوں میں دکھنی ادب کی نایاب مخطوطات کا جن سے اردو دنیا بالکل ناواقف ہے محققانہ مطالعہ کر کے اردوئے قدیم میں حیرت انگیز انکشافات فرمائے۔ انشاء اللہ آپ کی یہ معرکۃ الآراء ادبی تحقیقات قریب میں شایع کی جائیگی۔ ذیل کا مضمون مولانا وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" پر آپ کی ایسی ہی فاضلانہ تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ آج تک اس مثنوی کا اردو دنیا کو کوئی علم نہیں تھا۔ کٹلاگون کے مطالعہ سے بھی اس کتاب کا کوئی حال کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا۔ مولوی زورؔ صاحب کی سعی مشکور ہے کہ نہ صرف نایاب اور نہایت ہی قدیم مثنوی دریافت ہوئی بلکہ قطب شاہی اردو ادب کے ایک گم شدہ شہ کار کا تفصیلی علم بھی عام ہو گیا۔ آپ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ مضمون عدم فرصت کی وجہ سے سرسری طور پر لکھا گیا ہے۔ آپ آئندہ مزید تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ اس پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں مگر ہمارے خیال میں یہ صورت موجودہ یہ مضمون مکمل اور کافی معلومات سے پُر ہے۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ مولوی زورؔ صاحب اپنے اجاسانی مطالعہ کے سوا اپنے ذاتی شوق اور اردو کی خدمت گذاری کے مخلصانہ جذبہ سے اپنی فرصت کا وقت ایسی اعلیٰ اور

مفید تحقیقات میں مصروف فرما رہے ہیں جامعہ عثمانیہ اپنے اس فرزند پر جس قدر فخر کرے بجا ہے۔

"مکتبہ"

وجہی گولکنڈہ کے نہایت قدیم اور اول درجہ کے ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں۔ دکھنی ادب کے قدر دان ان سے ضرور واقف ہوں گے کیونکہ ان کی نثر "سب رس" کے متعلق دو تین دفعہ مضمون شایع ہو چکے ہیں لیکن شاید ہی کوئی ہوں جنہوں نے ان کی مثنوی "قطب مشتری" کا ذکر سنا ہو۔ اس کو اردو زبان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ یہ اہم شعری کارنامہ زمانہ کی دست برد سے بچ گیا اور اس طرح اب ہم اس قابل ہیں کہ آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس پہلے کی اردو کی ایک بہت زیادہ تصنیفوں پر زبان اور ادب دونوں کے لحاظ سے تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈال سکیں۔

(۲)

مصنف سب رس اور قطب مشتری کا

قطب مشتری، جیسا کہ مثنوی کے آخری شعروں سے ظاہر ہے ۱۰۱۸ھ کی تصنیف ہے، اور سب رس اس کے تقریباً ۲۷ سال بعد یعنی ۱۰۴۵ھ میں لکھی گئی۔ دو کتابوں کی تصنیف کے زمانوں میں اس قدر زیادہ فرق کا پایا جانا مصنف کے ایک ہی ہونے کے متعلق شبہ پیدا کر دیتا ہے لیکن یہ اس طرح دور ہو جاتا ہے کہ:۔

(۱) "سب رس" کا وجہی، غواصی کا ہمعصر تھا کیونکہ "سب رس" کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے اور "طوطی نامہ" اور "سیف الملوک" کے سنین تصنیف ۱۰۴۹ھ اور ۱۰۴۵ھ ہیں۔

(۲) "قطب مشتری" کا وجہی بھی اندرونی شہادتوں کے لحاظ سے غواصی کا ہمعصر تھا "قطب مشتری" کے حسب ذیل اشعار اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ کس طرح اس کا مصنف اپنے ایک ہمعصر غواصی کی طرف اشارہ کرتا ہے:۔

جو لک برس کوئی سر لیوے رچ کون — بناوے کدہیں اس جیسے گنج کون
ہوا جیو جب شعر یو بولنے — خزینے لگیا غیب کے کھولنے
اگر غوطے لک برس غواص کھائے — تو لیک گوہر اس دھات اس لک پائے
یو موتی نہیں وو جو غواص پائیں — یو موتی نہیں وو جو کس ہات آئیں

غواصان کئی غوطے کھا کھائے کر — موے ہیں سو اس سمد میں آئے کر
اپنے ہو کے لیا نا سو ہے جھوٹا سب — خدا غیب (تجے) دیوے تو کیا عجب
کہ ہنس نمنے (نمنے) تج سمد یک جائے تو — مرے ڈوب تل سیر (پر) پانوں ہو (ورق ۹۶۹)

(۳) ۱۰۴۱ھ میں ایک شخص وجہی زندہ تھا جو شاعر کی حیثیت سے مشہور تھا اور جو غواصی ہی کے ساتھ کا درباری شاعر تھا۔ اس کا ثبوت نظام الدین احمد کی اس اہم تاریخ سے ملتا ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد حکومت پر لکھی گئی ہے اور جس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس میں ۱۰۴۱ھ میں بادشاہ کو لڑکا پیدا ہونے کے ذکر کی ذیل میں لکھا ہے۔

وجہی از شعرا تاریخہائے کہ یافتہ بودند بسامع جاہ و جلال خسرو یوسف جمال رسانیدند (ازان جملہ این) سہ تاریخ مرقوم گردید۔ اول تاریخ کہ ملا وجہی شاعر دکنی یافتہ است ع

"آفتاب از افتاب آمد پدید" (۱۰۴۱ھ) و ملا غواصی کہ در شعر دکنی از شامل خود ممتاز است این حکم را مادہ تاریخ ساختہ است "محفوظ باد" (۱۰۴۱ھ) (ورق ۳۵۴ ب) یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مورخ وجہی کو شاعر لکھتا ہے نہ کہ صرف انشا پرداز۔ پس سب اس کا وجہی شاعر بھی تھا۔

(۴) سب رس کے لکھے جانے کے پینیس سال بعد یعنی ۱۰۸۳ھ میں گولکنڈہ کا ایک شاعر طبعی اپنی مثنوی "بہرام و گل اندام" کے دیباچہ میں ایک شاعر وجہی کا ذکر کرتا ہے جس کی اندرونی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ قطب مشتری کا وجہی ہے کیونکہ طبعی نے وجہی کے حسب ذیل اشعار

کہ فیروز آخواب میں رات کون — دعا دے کے چومے مرے ہوت کون
کہا ہے توں یو شعر ایسا مسدس — کہ پڑھے کون عالم کرے سب ہوس
توں یوں کر کہ فصلت یو تج آئے نا (دیکھا) — کہ توں خوش رہے اور کسے بھائے نا
توں ایسی طرز دل تے (ہے) نچا؟ انوی — کہ دسرے کریں سب تری پیروی
وجہی تا ذہن جون برق ہے — تجے اور بعضیاں میں کئی فرق ہے
ترا شعر سن دل لگتا ہے یوں — کہ پانی تے (ہے) بلورج گلتا ہے جیوں
توں وجہی کیا شعر کئی دھات کا — ہوا زیارت تجہ تے فرہاد کا
شعر بولنا گرچہ (دیکھا) اپرو ب ہے — ولے خانا کہنے تے خوب ہے (فہمنا) (ورق ۹۶۹)

کی تقلید میں اپنی مثنوی میں اس طرح انہی مطالب کو ادا کیا ہے:۔

لگیا میں جو یو مثنوی بولنے — یو موتیاں کچھل وحال یو رولنے
یو وجہی مرے خواب میں اے کر — مکہ اپنا سورج تاذ کھلائے کر
سراسر سینیا جو مری مثنوی — کیا بات طبعی ہے نبرہا (نتا) لی
ہو خوش حال سن کر یو باتاں مرے — اکیس (اکھیں) کے لے باتاں من باتاں مرے
پڑے پیار سو آپنا یو مشل — سینیا (سنا) سو پڑیا خواب سے میں اچھل

پھر اسی سلسلہ میں وجہی کے حسب ذیل اشعار بعینہٖ اپنے ہاں نقل (درج) کر لئے ہیں:۔

کہتا ہوں سنو کان دھر لوگ ہو — کہاوت منے بات ہوتو آئے سو
اگر شعر کوئی (کہتا) خوب کہہ کر جو لائے — تو خوباں کو وہ بس اشک البتہ آئے
یکس کوں سو یک دیک سکتے نہیں — یکس کوں سو یک مان رکتے نہیں
اگر کچھ کہے تو کہ (دیکھو) ہر کا کدھر — کہے تو کتے ہیں اسے بیچ کر
ارانی (؟) میں اسکوں جیوں دھیر تے — فضیحت کریں پا نو لگ سیر تے
اگر خوب جو بولے تو دوں رہے — وگر جو برا بولے تو یو ن اہے

اگر وجہی نام کے دو ادبی آدمی گذرے ہوتے تو طبعی اس قدر سادگی اور بے پروائی کے ساتھ اپنے منظور نظر شاعر کا ذکر نہ کرتا۔ وہ سب رس کے وجہی اور قطب مشتری کے وجہی میں امتیاز کرنے کا ضرور خیال رکھتا۔

(۵) یوں بھی اس بات کو عقل نہیں مانتی کہ اس قدر کے قریب کے زمانہ میں ایک ہی دربار کے دو شاعر ایسے گذر سکتے ہیں جن کا تخلص ایک ہی ہو!

ان دلیلوں پر غور کرنے سے یہ نتیجے نکلتے ہیں کہ:۔

(۱) سب رس اور قطب مشتری دونوں کا مصنف ایک ہی شخص تھا جس کا تخلص وجہی تھا۔

(۲) وجہی نے ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) کا زمانہ دیکھا تھا۔ اور ممکن ہے کہ اسی وقت سے شاعری بھی شروع کر دی ہو۔ کیونکہ قطب مشتری بالکل وضاحت کے ساتھ ثابت

---

(۱) قطب مشتری میں یہاں "جو" ہے۔ (۲) قطب مشتری میں یہاں "اپس میں اپنے" ہے (۳) قطب مشتری میں یہاں "کو چ
(۴) " " " "کہو نا" ہے (۵) " " "کا" ہے۔ کا کو چ کدھر کا کدھر ہے

کرتی ہے کہ اس کا مصنف ایک مشاق اور مشہور شاعر ہے۔ اگر ابراہیم کی وفات اور محمد قلی کی تخت نشینی کے وقت (یعنی ۱۰۱۸ھ میں) اس کی عمر ۱۵ سال کی فرض کی جائے تو قطب مشتری کی تصنیف کے وقت (یعنی ۱۰۳۵ھ میں) وہ ۴۵ سال کا اور سب رس کی تصنیف کے وقت (یعنی ۱۰۴۵ھ میں) ۲۷ سال کا تھا۔

(۳) غواصی نے بھی محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ ہی سے شاعر کی حیثیت سے چمکنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کا زمانہ پیدائش بھی وجہی کے قریب ہی ہوگا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ غواصی، وجہی سے عمر میں بہت چھوٹا ہو کیونکہ اگر اس کی بھی عمر ۱۰۴۵ھ میں ۲۷ سال کی ہوتی تو وہ غالباً اس قدر ضعیف العمری میں قطب شاہی دربار کے ایلچی کی حیثیت سے بیجاپور کا سفر نہ کر سکتا جس کی نسبت اس مضمون میں آئندہ ذکر کیا جائے گا۔

(۴) وجہی نے اس قدر شہرت حاصل کر لی تھی کہ اس کی وفات کے شاید پچیس برس بعد بھی ایک شاعر اس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے خواب میں آکر تعریف کرنے کو اپنی شاعری کی خوبی و عمدگی کے لئے سند سمجھتا ہے۔

(۳)

وجہی کی زندگی

وہ غالباً ابراہیم قطب شاہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے اور کم عمری ہی سے شاعری شروع کر دی ان کی نشو و نما اس زمانہ میں ہوئی جب کہ گولکنڈہ میں اردو ادبیات کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور غالباً چند اچھے شاعر بھی پیدا ہو چکے تھے۔ خصوصاً جب انھوں نے قطب مشتری لکھی عام طور پر اردو شعر و شاعری کا چرچا ہو چکا تھا اور کئی شاعروں سے وجہی کی چشمک بھی تھی جس کے متعلق ان کے ان شعروں سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جن کو طبعی نے اپنی مثنوی کے دیباچہ میں داخل کر لیا تھا اور جو پیش کئے جا چکے ہیں لیکن اس زمانہ کی علمی و ادبی فضا کے متعلق وجہی کے کلام سے اور جو روشنی پڑتی ہے اس کے ظاہر کرنے کے لئے ہم قطب مشتری سے چند اور انتخابات یہاں پیش کرتے ہیں۔

اپنے ہمعصر عام شاعروں کی نسبت وجہی کی یہ رائے تھی کہ۔

یو سب شعر کہتے یو سب شعر نین — کہ یو لان کدہر ہور معنی کہیں
شعر گرچہ یے لوگ جوڑے (ہیں) ہیں — بُرے بھوت ہور خوب تھوڑے ہیں

ایک جگہ اپنے کلام کا دوسرے شاعروں کی شاعری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اس میں اپنی خوبیاں بیان کرتے وقت اس بات پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں کہ خود ان کی شاعری اپجی ہے انہوں نے کسی اور جگہ سے اپنا مضمون اور خیالات اخذ نہیں کئے۔ اس کے برخلاف ان کے ہمعصر دوسروں کے ممنون منت تھے۔ وہ اپنی ذات سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس بات سے ان کا اشارہ غالباً فارسی کے ترجمہ کی طرف ہوگا۔ وجہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر اب آگے کوئی شاعر اپچی کتاب لکھے بھی تو اس کو کوئی فخر نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ ایسے کام کی ابتدا کا سہرا تو صرف انہی کے سر رہے گا بعض شعر یہ ہیں

دو جگ جس اتم ہیرے کا مول ہے — دو (وہ) ہیرا سو ہرا ایک مرا بول ہے
رتن بے بدل یو مرے جاں بکائیں — وہان (جہاں) چاند سورج دلالی نہ پاہیں
بچن موتی یو دیک پنت لاجتے — سمد پانی گل کر ہوا لاج (تے) تے
جکو (جو) ہی جوہری (جھکر) ہے سو پچھان کر — ننگے گا رتن کوں قدر جاں کر
پرکھ (جو کوئی) دیک توں کاچ ہور پاچ کون — برابر نہ کر دو دہور چھاچ کون
بہا اک نیں کاچ ہور پاچ کون — لذت دیک ٹک دو ہور چھاچ کون
جہان پاچ اچھے گا وہاں کاچ کیا — جہاں دو دا اچھے گا وہاں چھاچ کیا
نہ یو بات ہر ایک کے سات ہے — جکو (جو) کوئی عارف ہے اس کون یو بات ہے
تو پرکھ پاچ دیک ہور لذت کون خام — نکر ہول سب کا سنگٹ تین دام
جوکر تا کیں کا ہنر دیک (دیکھ) کر — ہنر (ہنر کر) وند اُسے پن کہتے ہیں ہنر (ہیں کہتے)
نو اول تے لیانا ہے مشکل (کٹھن) کہنا — کہ آسان ہے دیک کر بولنا
جو کوئی یوں کرے اس میں کچ (کہیا) خام مین — ہنر دیک سکتا بڑا کام مین
ہنر وند اسی کوں کہیا جائے (جاتے) گا — جو کوئی اپنے دل تے نو (نئے) لیائے گا
فرق (فرقہ) ہے اول ہور آخیر (کہیا) میں — تفاوت اہے نیر ہور شیریں
ہنر دیک سکتا ہے استاد کا — فہم چوہے آدمی زاد کا

اسی سلسلہ میں وہ اس کا بھی اظہار کر دیتے ہیں کہ میں اپنے کلام کو ناحق ترجیح نہیں دیر ہا ہوں بلکہ میں اپنے ہنر کی باریکیاں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ لوگ انصاف سے کام لیں۔ اور کسی کی تعریف یا طرفداری خواہ مخواہ نہ کریں۔

ہنر کیان ہیں یو باریکیاں لاف نین — وو ادمی نہیں جس میں انصاف ہیں
کہ انصاف دیوے وہی (کئی جنے) است ہے — کہ انصاف طاعت تلے (نہیں) ریاست ہے
نکر بات تون نا سمجھ امنا — بہوت مشکل ہے بات کوں (بھی) فامنا

اسی سلسلہ میں حسب ذیل شعر بھی آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کی ذاتی کشمکشیں کہاں تک انہیں پریشان رکھتی تھیں نیز یہ کہ انہیں بعض وقت سرے سے شاعری ہی ترک کر دینے کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ وہ کہتے ہیں:۔

ہوا شعر کا اس وصفا کام جب — تو اب شعر کہنا (دشنج) کیا سبب
دلے جیو رہتا نین کہے باج یو — عجب سرکش ہے اچنوی راج یو
شعر خوب کہہ کر جو (نہیں) لیا نا ہے — اپس پر بلا ایک بسانا ہے
ہنر میں ہنر کوی جو تا نین — ترک کرنے گئے تو بھی ہوتا نہیں
یو بلو ند بخن اس میں بل بہوت ہے — سمجھے تھوڑی لوگاں میں جہل بہوت ہے

وجہی نے غالباً کسی شاعر کی شاگردی نہیں کی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے ہمعصروں پر جو چوٹ کی ہے اس سے کچھ اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ شاعری میں کسی کو استاد نہیں مانتے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے دیباچہ میں دو اردو شاعروں کے نام پیش کئے ہیں جو اس وقت زندہ نہیں تھے لیکن ان کی وہ عزت کرتے تھے اور انہیں اس قابل سمجھتے تھے کہ ان کے ذریعہ سے اردو شاعری کو بہت رواج ہوتا نیز یہ کہ صرف وہ دونو ہی ان کی نظروں میں بڑے شاعر تھے اور ان کے علاوہ جتنے شاعروں کو وہ جانتے تھے یا جو اس وقت موجود تھے وہ ان کے ہاں بالکل ہیچ تھے وہ کہتے ہیں:۔

کہ فیروز محمود اچھتے جو آج — تو اس شعر کون بہوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونو بی اس کام میں — رکھیا نیں کسے (کسی نے) بول اچھوں نام میں

فیروز اور محمود کی شہرت (بھی) اور ان کے اردو ذوق ادب کی نسبت ہمیں ایک اور دکھنی شاعر کے ذریعہ سے بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ ابن نشاطی نے پھول بن کے خاتمہ میں جہاں چند متوفی اردو شاعروں اور

قدر دانوں کا ذکر کیا ہے ان دونوں کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ پھول بن کے حسب ذیل شعروں سے فیروز اور محمود کے اوصاف کے متعلق ناظرین کی معلومات میں ضرور کچھ اضافہ ہوگا۔

نہیں (وہ) دو کیا کروں فیروز استاد — جو دیتے شاعری کا کچ پری داد
رہے صد حیف جو نہیں (نہیں) سید محمود — کہتے (کہنے) پانی کوں پانی دود کوں دود

(مخطوطہ انڈیا آفس ورق ۱۳۱)

قطب مشتری میں وجہی نے ابراہیم قطب شاہ کی اس طرح تعریف کی ہے کہ گویا وہ تصنیف کے وقت زندہ تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

ابراہیم قطب شاہ راجا دہراج — شہنشاہ ہے شاہ شاہاں میں آج
عدل بخشش ہور داد اس تے اچھے — سدا خلق سب شاہ اس تے اچھے
جتے بادشاہاں ہیں سنیار کے — بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے
سلیمان (جتنے) تے فاضل ہے اس بخت بل — پڑے دیو جن سب ہیں اس حکم تل
اسی شاہ عادل کے عصہ تے ڈر — لیا ہے گگن کوں پون پیٹ پر
یتا بل ہے اس عدل کے فن منے — کہ بجلیاں کھڑیاں کن پتیاں کھن منے

لیکن (انھا) اس کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا فی الحال خلاف تحقیق ہوگا کہ وجہی نے ابراہیم کی زندگی ہی (وشیر) یہ مثنوی کہنی شروع کر دی تھی۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ہی چمکنے لگے ہوں گے۔ اور چونکہ بادشاہ خود دکھنی زبان کے شاعر تھے ان کی رسائی بھی دربار میں بہت جلد ہوگئی ہوگی۔ مثنوی قطب مشتری جس موضوع پر لکھی گئی ہے خود وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ کوئی شاعر خود بادشاہ سلامت کو ہیرو بنا کر اس وقت تک کوئی عشقیہ قصہ نہیں لکھ سکتا جب تک کہ بادشاہ اس کے ساتھ غایت درجہ مانوس نہ ہو گئے ہیں۔

قطب مشتری کی تصنیف کے وقت وجہی کی شہرت اور مقبولیت یقیناً عروج حاصل کر چکی تھی اگرچہ اس وقت کئی شاعر موجود تھے، اُن میں سے بہت سوں نے متعدد قصے بھی نظم کئے، لیکن ان سب کا وجہی جس حقارت سے ذکر کرتے ہیں۔ وہ شاہد ہے کہ دربار میں کوئی ان کے پلے کا نہ تھا اگر ان کے سوا ایک بھی بادشاہ کا منظور ہوتا تو وجہی تمام شاعروں کی اس طرح بے دھڑک مذمت کرنے کی ہرگز جرارت نہ کرتے۔

اور غالباً یہی غیر معمولی قدر دو منزلت اور احساس یکتائی ہوگا جس نے انہیں ایک حد تک خود ستا اور مغرور بھی بنا دیا تھا۔ اگرچہ اکثر جگہ ان کی خود ستائی حق بہ جانب بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس قسم کے شعر قطب مشتری کے دیباچہ میں اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ایک سرسری مطالعہ کرنے والا ان کو پڑھ لینے کے بعد وجہی کے اخلاق کے متعلق اول اول کوئی اچھی رائے نہیں قائم کر سکیگا۔ ان کی خود ستائیوں کے بعض نمونے یہ ہیں:—

(۱) نہ پہنچے نہ پہنچیا ہے گن گیاں میں — سو طوطی منج ایسا ہندوستان میں
کہ باتاں یو سن کر مرے گیان گیان — رہیاں تھک ہو قرباں خراسانگیاں
جتے شاعران شاعر ہو آئیں گے — سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے

(۲) نہ منج کچے بڑائی نہ منج لاف ہے — ولے عارفان پاس انصاف ہے
دکھن میں اتھا کئی طرح ہور میں — ویا یوں سلاست کو بھی زور میں

(۳) جتے عقل و درڑائے انداز سون — کیا نین کنے بات اس ناز سون
نہ کین (نہیں) ویک کر کس تے پایا ہوں میں — تو تاز (کچی) طرح دل تے لیایا ہوں میں
جکو ی فہم میں ٹک فہیاں رہیں — سو دو سریاں کے دو خوشہ چینیاں رہیں
اگر لک بود و دن لبند دھانوں کوں — اڑ دن جگ کون سب باندکر پانوں کوں

(۴) اگر کس تے تل خاص کچ جانتا — اسے دل میں استاد کر مانتا
ہنر سے ہنر اس دینا (دیکھ) کس تے — نکر سے قدم کوں انگے اس تے
اگر کوئی گیانی چتر گیان ہے — یدے، یا نچ گو یا نچ میدان ہے
دکھن میں جو دکھنی مٹھی بات کا — ادا نین کیا کوئی اس دھات کا
او ایوں اتال ہوے تو کیا عجب — کہ عالم سینا ہے یو چو پھیر سب
جو قائل ہے یو بات مانے وہی — قدر اس ادا کی پچھانے وہی
دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کا — کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار آ
کہاں بات و چنچل ہوا چلبلی — کہ دل کوں نمو ان سوں کر سکے گلی
مری بات سن، بات اس دھات بول — کہ جیو کون خوشی ہو دل کوں کھول
یو نہ سول ہے، بات اسے بول نین — ہر یک بول ہے وحی، یو بول نین

سخن گو وہی جس کی گفتار تھے — اوچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے
یو بولیا ہوں سب گنج نا رنج ہے — اچھوں میرے دل میں بہت گنج ہے
جو لک برس کوئی سہ لیوے رنج کون — نپاوے کدیں اس پچھے گنج کون

اظہار خود نمائی اور ہمعصر شاعروں کی عام تحقیر کے باوجود یہ ضرور ہے کہ وجہی غواصی کی بڑھتی ہوئی شہرت اور شاعری سے غافل نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ زمانہ تک ٹکے رہنا آسان کام نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی کہ اپنے ملاحتی تیروں کا اصل نشانہ غواصی ہی کو بنائیں لیکن ان کی ہمت نہ ہوئی کہ صاف صاف ان کا اور ان کے کارنامے کا (جو غالباً کسی فارسی قصہ کا منظوم ترجمہ ہوگا) مضحکہ اڑائیں انہوں نے غواصی کی نسبت جن اشعار میں اشارہ کیا ہے وہ پیش کئے جا چکے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کی قدر و منزلت کی معراج اور ملک الشعرائی محمد قلی ہی کے دم کے ساتھ تھی محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) کے پندرہ سالہ زمانہ کی درباری قدر دانیاں ابھی تک نامعلوم ہیں لیکن عبد اللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے حالات ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت غواصی نے وجہی کو پیچھے ہٹا کر خود ان کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ وجہی بھی دربار میں موجود تھے تاریخی قطعے اور قصیدے لکھا کرتے تھے اور موقع بموقع بادشاہ کی عنایتوں سے سرفراز ہوا کرتے تھے لیکن ان کے کم عمر مدمقابل غواصی کی شہرت اور شاعری نے ان کی قدیم عظمت پر نقاب ڈال دیا تھا۔ اس کے ثبوت میں اس زمانہ کے مورخ نظام الدین احمد کا وہ بیان پیش کیا جا سکتا ہے جس میں ایک ہی جگہ وجہی اور غواصی دونوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غواصی کی زیادہ تعریف کی گئی ہے اس بارے میں خود نظام الدین کے الفاظ پیش کئے جا چکے ہیں۔

اس امر کا ایک اور ثبوت نظام الدین احمد ہی کے بیان کردہ ایک دوسرے واقعہ سے ملتا ہے۔ یہ واقعہ ملا غواصی کو بیجاپور کے دربار میں ۱۰۴۵ھ میں ایلچی بنا کر روانہ کرنے سے متعلق ہے۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۰۴۵ھ میں عادل شاہ نے اپنے دربار کے ایک مشہور شاعر ملک خوشنود کو (جن کی مثنوی کا میں نے مکتبہ ہی کے ایک مضمون میں ذکر کیا تھا) گولکنڈہ روانہ کیا تھا تاکہ عبد اللہ قطب شاہ کی اس مدد کا جو عادل شاہ کی جانب سے شکریہ ادا کریں جو خواص خاں کو بیجاپور کی حکومت سے بے اقتدار کرنے کے لئے روانہ کی گئی تھی۔ ملک خوشنود کی عبد اللہ نے خاصی قدر و منزلت کی اور جب وہ واپس

ہونے لگے تو ان کے ساتھ غواصی کو بھی بیجاپور تک روانہ کیا جس کا ذکر خود مورخ کے الفاظ میں یہ ہے۔

"بعد از یک چندے ملا غواصی شاعر دکنی را رفیق اور ساختہ باتحفہ و یادگار روانۂ بیجاپور ساختند و بعد از قتل خواص خاں ..... حضرت عادل شاہ میرزین العابدین پسر شاہ ابوالحسن صاحب تعلیمی را ہمراہ ملا غواصی شاعر نمودہ و دیگر فیل بزرگ و شش راس اسپ عراقی و دو صندوق مقفل از تحف و ہدایا ارسال داشتند و مشارٌ الیہا بشرف بساط بوسی مشرف و سرفراز شدند"

(دستور صداقۃ السلاطین مخطوطہ برٹش میوزیم ورق ۲۶۹ ب)

ان دونو تاریخی بیانات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت غواصی کی زیادہ قدر و منزلت کی جاتی تھی حالانکہ وجہی زندہ تھے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ غواصی کی ترقی اور وجہی کی کم قدری کرنے میں موخر الذکر کی طویل عمری نے بھی کوئی حصہ لیا ہو۔

(۴)
وجہی کی شاعری

وجہی کئی باتوں کے لحاظ سے دکھن کے ایک واحد ادیب ہیں۔ ان کا موضوع خود انہی کی دماغی پیداوار ہے۔ ان کو اس بات پر فخر تھا کہ انہوں نے اور شاعروں کی طرح دوسروں سے مضمون اخذ نہیں کیا۔ دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنا یا دوسرے مضمون کو ماخذ قرار دینا ان کی نظروں میں چوری اور دغا بازی جیسا جرم تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے موضوع کے اچھے ہونے اور دوسروں کی تصنیفات کے ماخوذ ہونے کی نسبت جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کو اوپر نقل کر دیا گیا ہے۔

وجہی وہ خوش قسمت شاعر ہیں جن کے کلام سے نثر اور نظم دونوں کا نمونہ اس وقت موجود ہے اور حسن اتفاق سے دونوں ان کی اعلیٰ قوتوں کے بہترین ثبوت ہیں۔ ان کی نثر "سب رس" کی خوبیوں سے اہل ذوق ناواقف نہیں اور ان کی نظم "قطب مشتری" کی خصوصیات کی نسبت اگرچہ اس مضمون میں کوئی تفصیلی بحث نہیں کی جا سکتی تاہم کچھ لکھا گیا ہے اور اس کے جتنے شعر پیش کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے ایک حد تک صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وہ اس لحاظ سے بھی گولکنڈہ کے ایک واحد بڑے شاعر ہیں کہ اقسام نظم میں سے ان کی صرف مثنوی ہی نہیں بلکہ غزل اور رباعیوں کے بھی چند نمونے قطب مشتری میں موجود ہیں جن کا مطالعہ واضح

کرتا ہے کہ وہ دراصل دکھن کے ایک اصلی درجہ کے شاعر تھے۔ ان کی اکثر غزلیں شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون پر لکھی گئی ہیں جس کی وجہ سے ان میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ ان میں بالعموم جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے اور ان کا اسلوب نہایت پاکیزہ اور فطری ہے۔ ان میں تکلف اور رسمی خیالات کو کوئی دخل نہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول اردو شاعروں نے ہندی شاعری کی تقلید شروع کی تھی۔ اور یہ کہ اگر وہ اسی پر قائم رہتے تو شائد ان کی شاعری آج کسی دوسرے ہی رنگ میں ہوتی۔ وجہی کی غزلوں اور رباعیوں کے نمونے یہ ہیں:۔

(۱) پیو پانے کوں نکسا جی میں پنس پنے دیکھی سو کیر — جب پیو چلتا سٹ مسیج منج تب موتے اٹھی ویکر
ہاتھ بڑھا اپنا سارنے منج چل لاگیا مارنے — نا جاؤں سائیں کارنے بھی ہنون کیا کیا ہو کیر
ناپوچھوں پہن جو سے کب ملنا پیو سوں ہوسے — غم برہا سب ہی ہوسے نا جانے دکھ یو کو کیر
کیوں ٹالوں نا جھال سکی نیں بکتی ہوں سنبھال سکی — اب کیوں کر پاؤں ال سکی جو بیٹھی ہت نے کھو کیر
یکتائیں سہیلی مرا دل وجے پر نا دہرنا — اس پیو کون اپنا کرنا اس جاچی جیو کون کھو کیر

(ورق ۷۳ ب)

---

(۲) چلو ناجائیں اے سہیلیاں ہمارا لال جاں (جہاں) اچتا — وے کوئی جانتا نیں ہے کہ بھوندو دو کہاں اچتا
نشان نین بے نشان ہے دو نشان سکا نہ کوئی منج کون — سکی اڑ جائیں پنکی ہوا گر اس کین نشان اچتا
دو تن کی بول ری سب ساری اے باوچپ رہ (کرلی) — اگر تجہ کام ہے تو کہہ مرا دو پیو (کہیں) کان اچتا
کسی پر انت دیوں میرا کھلے اب بخت کیوں میرا — نہ ہوتا حال یوں میرا اگر دو مہربان اچتا
ہوئے لب خشک نیناں تر کہے جگ منج عاشق کر — کہ مستی ہور نیہ ہور چھپ سکی یو نیں نہاں اچتا (نہیں)

(ورق ۷۴ ب)

(۳) طاقت نہیں دوری کی اب تون بیگی آ اے پیا — تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل اے پیا
کھانا نہ کیتی ہوں میں پانی انچھو پیتی ہوں میں — تج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل اے پیا
ہر دم تون یاد آتا منجے اب عیش نیں بھاتا منجے — برہا پیو ستاتا منجے جی تل تل سے پیا
منجیں پیش جا بے تمیں منج ٹھار جیو لا نے نہیں — منج دل تد ہر مانے نہیں کیتا ہے منزل اے پیا
تو جیو میرا میں ہو دل تج سات رہنا کیوں نہ مل — دن رات میں ہوں ایکل میں تج تے غافل نہ پیا

(ورق ۱۰۷ ا)

رباعیوں کے نمونے

(۱) خوشحال ہو جیو آج خوشی پاتا نہیں — پیتا ہوں شراب ہور اثر آتا نہیں
کانٹیا کے عرب ڈستے ہیں پھل سب — تج باج سکی باغ منجے بھاتا نہیں

(ا-۹۷)

(۲) تج یاد بنا ہور منجے کام نہیں — نس جاگتے جاتی ہے دن آرام نہیں
میں تو تجے منگتی اوں کہ جیو ولے — توں کیوں منجے منگتا ہے سو کچ خام نہیں

(ا-۱۰۸)

دنیا کے سو لوگاں ہیں وفا دستا نہیں — دھند دیکھے جفا باج جفا دستا نہیں
بے مہر بنی آدم ہے اس سوں اسکی — دل باندنے میں کچ نفا دستا نہیں

(ا-۱۱۱)

وجہی کی متفرق اقسام نظم کے نمونوں کے بعد دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر شعر و شاعری کے متعلق ان کے ذاتی خیالات بھی پیش کر دئے جائیں۔ ذیل کے شعروں سے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ وجہی کا معیار شاعری کیا تھا بلکہ یہ بھی کہ آج کے اور آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے کے اردو شاعروں کے ذوق میں سیکڑوں سیاسی اور لسانی تبدیلیوں کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

کتا ہوں تجے پند کی ایک بات — کہ ہے فائدا اس تے دھات دھات
جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس — بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلاست نہیں جس گھڑی بات میں — پڑیا جائے کیوں جز لیکر ہات میں
جسے بات کے ربط کا فام نیں — اسے شعر کہنے سوں کچھ کام نہیں
نکو کر توں لے بولنے کا ہوس — اگر خوب بولے تو یک بیت بس
دو کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے — کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے
اسی لفظ کوں شعر میں لیائیں توں — کہ لیا یا ہے استاد جس لفظ کوں
اگر فام سے شعر کا تج کوں پھند — چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
رکھیا ایک معنی اگر زور ہے — ولے بھی مزا بات کا اور ہے

اگر خوب محبوب جیوں سور ہے — سنوارے تو نورؐ علیٰ نور ہے
اگر لاکھ عیباں اچھے نار میں — ہنر ہو وے خوب سنگار میں
ہنر مشکل اس شعر میں بوج ہے — کہ تھوڑے اچھیں حرف معنی سو کہئے
۳ دیوانا ہوں میں اس رنگی بات کا — کہ ہر دل میں جیو ہو کرے ٹھار آ
کہاں بات و پنچھل ہور چلبلی — کہ دل کوں نھواں سوں کرے گدگدی
۴ سخن گو وہی جس کی گفتار تہے — اچھل کر پڑے ادھی ٹھار تہے
نکو بولی معنوں توں ہور کا — کہ کالا ہے دو جگ میں ہوں چور کا
جتا چوری کر چور اپنے سا وہوئے — دغا باز اچلے کوں مانے نکوئے
چھپا کر چھاتا نہ کہے چور کوئی — یو باتاں سمجھتے سو ہیں ہور کوی

"قطب مشتری" کا قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ پاکیزہ نسخی قلم سے لکھا گیا ہے مثنوی تقریباً دو ہزار شعر پر ختم ہوئی ہے۔ اور اس کے آخری شعر میں تاریخ تصنیف اور اس کا نام وغیرہ بیان کئے گئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

قطب مشتری میں جو بولیا کتاب — سو ہوی جگ میں روشن کہ جیوں آفتاب
اول ہور آخر کے کاماں پچھان — دنیا میں رکھیا ہوں میں اپنا نشاں
نشانی رہے باج چار انہیں — کہ دائم کوئی رہنہارا نہیں
سنوارو کے سنے کے نقاں گھڑیا — تن معنی چن چن اتن بہ جڑیا
جنے شعر بولیا اسے کیا ہے غم — کہ جیتیا رہے نانون اس جگ میں جم
تمام اس کیا دیس بارہ منے — سنہ یک ہزار ہور اٹھارا منے

(ورق ۱۲۱ ا)

میں مثنوی کے قصہ کا پلاٹ طوالت کے خوف سے یہاں نہیں بیان کر سکتا۔ انڈیا آفس کے مرتب کیٹلاگ نے جنہیں مثنوی اور اس کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چل سکا اس کا مختصر سا پلاٹ نقل کیا ہے جس کے دیکھنے سے اس ادبی شہ کار کی کم و بیش نوعیت معلوم ہو سکتی ہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے وقت میں اپنے ہم وطن جو شیلے دوستوں کی تواضع کے لئے دکھنی کے چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جن کے مطالعہ سے وہ ضرور محظوظ ہوں گے۔

دکھن سانیں ٹھار سینسار میں — ہے نیچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینا انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینا ہی لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب سماج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
دکھن ملک بھو تیج خاصا رہے — تلنگانہ اس کا خلاصہ رہے

(ورق ۱۱۵ ب)

رباعی

حضرت علی اورنگ آبادی

تکلیف کا رنج ہو نہ راحت کی خوشی
حضرت کا ملال ہو نہ عشرت کی خوشی
میرے مالک! بھیجے تو اپنا کر لے
دوزخ کا خوف نہ بہشت کی خوشی

فریادِ اشک

از

جناب محمد جلال الدین صاحب اشک بی اے

شاہدِ صبح کے انداز دکھانے والے — تلذذِ عیش کی موجوں کے اٹھانے والے
بادۂ عشق کے خم خانے لٹانے والے — بزمِ قدرت میں نئے رنگ جمانے والے
چاہتا ہوں کہ سناؤں تجھے فریاد اپنی
کیوں ہو پابندِ سکوں ہمتِ آزاد اپنی

عہدِ طفلی ہی سے جنگل کا تمنائی ہوں — بزمِ قدرت کے تماشوں کا تماشائی ہوں
ایک مدت سے میں آوارہ و سودائی ہوں — دشتِ پرخار کے کانٹوں کا تولائی ہوں
عمر گذری ہے میری بادیہ پیمائی میں
عتبۂ شاہدِ قدرت کی جبیں سائی میں

لذتِ دشت نوردی سے خبردار ہوں میں — حسنِ فطرت کے کرشموں کا طلبگار ہوں میں
شاہدِ صبح کی صورت کا پرستار ہوں میں — ساحتِ دشت کے شایاں ہوں سزاوار ہوں میں
راحتِ گوشۂ صحرا کوئی مجھ سے پوچھے
لذتِ موجۂ دریا کوئی مجھ سے پوچھے

دشت و کہسار سے وابستہ ہے قسمت میری — دامنِ دشت نہیں ہے یہی جنت میری
شفقِ شام میں پاتا ہوں میں دولت میری — کوئی دیکھے تو سہی آکے یہ وحشت میری
پاؤں پائے ہیں مجوب بادیہ پیما میں نے
طے کیا کتنی دفعہ دامنِ صحرا میں نے

ہائے قسمت سے مرا عیش یہ دیکھا نہ گیا — مجھ کو قدرت کے نظاروں سے جدا کر ہی دیا
جب کبھی یاد وہ آجاتی ہے جنگل کی فضا — دل پکڑ کر میں کیا کرتا ہوں یوں آہ و بکا
"ہائے تقدیر نے چھینی میری دولت مجھ سے
ہائے تقدیر نے لی میری جنت مجھ سے"

ساحتِ دشت کو گلزار بنایا تو نے گل کو خوش بوئے محبت میں بسایا تو نے
آبشاروں کو بلندی سے گرایا تو نے جلوۂ برق کو بادل میں دکھایا تو نے
مری قسمت کو لپیٹ دے مجھے شاداں کر دے
دامنِ کوہ میں گلزار بداماں کر دے

روح پھر مستِ مئے ذوقِ تماشا ہو جائے پھر میسر مجھے جنگل کا نظارا ہو جائے
پھر مجھے دشت نوردی کا اشارا ہو جائے حشر جذبات کا پھر سینے میں برپا ہو جائے
وحشتِ دل کو میں پھر سلسلۂ جنبان دیکھوں
دامنِ کوہ میں پھر ابرِ بہاران دیکھوں

سلطان محمود غزنوی کی بزم آد

از

مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم اے

سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت (۱۲۰) صفحے کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت صرف بارہ آنے

ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ دکن اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

خان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین صاحب مرحوم

تیر بہدف

از جناب سید شبیر حسن صاحب قیس

دنیا سیاہ چادر میں ملفوف ہو چکی تھی ——— میرے دل میں ایک خفیف سی مسرت کی لہر دوڑی ——— "شائد وہ آج آجائے"۔ میرے ہجران نصیب دل نے آہستہ سے کہا۔ رات کے آٹھ بج گئے لیکن وہ نہ آئی۔

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک ہوک دل میں اٹھی۔ ایک درد سا قلب میں محسوس ہوا۔ میرے داغ دار دل کو تسکین نہ دیگی۔ کیا میں مایوس ہو جاؤں ——— قطعی ——— کیا اب میری آنکھیں جو عرصہ سے اس کے رخ زیبا کے لئے تڑپ رہی ہیں اس کو نہ دیکھ سکیں گی۔

دس بج گئے۔ لیکن میں ہمہ تن انتظار بنا ہوا تھا۔ میں اکیلا ساکت کھڑا تھا ——— سامنے کی جھاڑی میں سے سرسراہٹ سی ہوئی۔ امید میں جھلک دل میں مسرت پھر ایک بار گی خیالات میں ہیجان ہوا۔

کوئی آتا نظر آیا۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ میں نے کیا دیکھا۔ ماحول کا چپہ چپہ کسی نور سے جگمگا اٹھا۔ گویا کوئی آسمانی حور تھی کہ بڑھی چلی آ رہی تھی۔ میری روح کو بشاش کرنے والی دوشیزہ اپنے دہقانی لباس میں ملبوس میری طرف نہایت سرعت سے بڑھی۔ "آہ میری ملکہ ——— میری شہزادی ——— تو ——— تو ——— آگئی" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ میرا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اور وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے اپنے بازو پھیلا دئے۔ ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے اپنے بلوریں سینہ سے چمٹا لیا۔ اور اس کے یاقوت خام میرے رقصان ہونٹ سے مل گئے اور میں اس کی زلف عنبریں کو چومنے لگا۔

ہم دونوں علحدہ ہوئے اور سبزہ پر بیٹھ گئے۔

چاند نکل رہا تھا۔ اس کی شعاعیں پہلے سے زیادہ روشن و منور تھیں۔ شاید وہ ہماری مسرت پر ہنس رہا تھا۔

"میری عزیز ترین لبنیٰ۔ اب کی تمہاری جدائی نے بہت طول کھینچا، میں نے خیال کیا تھا کہ شاید میں اب تم سے نہیں مل سکونگا۔"

"ہاں میرے ہاشم۔ حقیقتاً تمہیں میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔ میں امان جان کے ساتھ مصر گئی تھی۔ مجھے چلتے وقت ذرا بھی موقع نہیں ملا کہ تم سے مل لیتی اور روانگی سے آگاہ کرتی۔ میرا قصور معاف کرو بیشک میں قصوروار ہوں، میں نادم ہوں" اس نے پشیمان ہوتے ہوئے کہا۔

نہیں میری لبنیٰ۔ تم میرے دل کی مالک ہو۔ میں تمہارا غلام ہوں۔ تمہارے معافی چاہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میں اپنی کامیابی پر شاداں و مسرور تھا۔ وہ روز آجایا کرتی ہے اور دل خوشکن باتوں سے دل کو لبھا جاتی ہے۔

اس نے مجھے بار ہا کہا" پیارے ہاشم تم مجھ کو سب سے زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہو، میں تمہیں جاں سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں، میرے قلب پر ہاتھ رکھکر دیکھو تو معلوم ہوگا یہ جام تمہاری ——— فقط تمہاری ہے الفت سے لبریز ہے۔"

مشاہدات

از

جناب ابوالفاضل رازؔ چاندپوری

جب سارا جہانِ راز سو جاتا ہے (۱) اک عالم بیخودی میں کھو جاتا ہے
ہوتا ہے نیاز اس سے حاصل مجھ کو بیدار مرا نصیب ہو جاتا ہے
سالک کا اگر قیام ہو جاتا ہے (۲) کھانا، سونا حرام ہو جاتا ہے
ہلنے لگتی ہے اس کے دل کی دنیا برہم سارا نظام ہو جاتا ہے

قفقاز کے شمال کی زبانیں

مترجمہ محمد عبد الوہاب صاحب مسلم

مضمون کے آغاز سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قفقاز کے جغرافیہ اس کے مقام وقوع اور حدود اربعہ پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے۔

اس کے شمال میں مملکت روس، مشرق میں بحیرہ خزر، جنوب میں عراق و ترکی اور مغرب میں بحر اسود ہیں اسی خطہ ملک میں کوہ قاف کی مشہور پہاڑیاں ہیں جن کے متعلق اب بھی بوڑھی عورتیں بچوں سے اکثر کہتی رہتی ہیں کہ وہاں پریاں اور دیو رہتے ہیں۔ دیو تو خیر لیکن پریوں کے متعلق کہنے میں کوئی شک ہی نہیں کیونکہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کی عورتیں حسن اور خوبصورتی میں یہاں کی عورتوں سے زیادہ ہوں۔

یہ مقام ایشیا اور یورپ کے درمیان میں واقع ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اونہ قدیم میں جب مشرق سے مختلف آریائی قبیلے نکلکر مغرب کی طرف گئے تو راستہ میں سلسلہ کوہ ملنے کی وجہ سے اول اول انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی لیکن جوں جوں دوسرے قبیلوں کا ان پر حملہ اور غلبہ ہوگیا وہ آگے بڑھتے گئے حتی کہ یہ آریائی نسلیں تمام یورپ پر چھا گئیں۔

اس آمد و رفت اور خلا ملا کی وجہ سے اس ملک کو بہت کچھ اہمیت حاصل ہوگئی کیونکہ وجو قبائل جو وقتاً فوقتاً ایشیا سے یورپ گئے ان میں سے کچھ نہ کچھ لوگ اکثر یہاں مسکن گزین ہوگئے انہی مختلف قبائل کی سکونت یہاں کے لسانی اختلافات کا سبب ہے۔

پہاڑی مقام ہونیکی وجہ سے یہاں کے لوگ بہت محنتی، جفاکش اور طاقتور ہوتے ہیں یہاں کا سب سے بڑا شہر باکو ہے۔ بحیرۂ خزر کے کنارے باکو میں تیل کے چشمے ہیں۔ جنگ عظیم سے پیشتر یہ ملک روس کی عملداری میں شامل تھا لیکن جنگ کے بعد سے اس میں کئی جمہوری ریاستیں قائم ہوگئیں جن میں سے جارجیا کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔

زبان کے ارتقاء اور تحقیق کے لحاظ سے جو اہمیت اس خطہ عالم کو حاصل ہے غالباً دنیا کے

عرب کے جغرافیہ اور تاریخ نویسوں نے قفقاز کو "زبانوں کا پہاڑ" خطاب دیا ہے اور واقعی قفقاز اس لئے بہت مشہور ہے کہ وہاں کے باشندے پچیس تیس مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ یہ لوگ تین مختلف نسلوں پر منقسم ہیں۔ آرمی، ترکی، قفقازی، قفقاز کے جنوب میں چند زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک، ایک وسیع رقبۂ ملک کی حکمران ہے۔ ان زبانوں میں سے گرجی ارمنی اور ترکی آذری بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ماہرین لسانیات نے بہت کوشش کی کہ گرجی زبان کا تعلق کسی مشہور نسل سے ثابت کریں لیکن ان کی کوشش بیکار ثابت ہوئی اور وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ زبان گرجی ایک مخصوص نسل کی زبان ہے جو صرف مملکت قفقاز میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ازمنہ قدیم میں یہ زبان بہت مشہور و معروف تھی اور اس کا اثر رقبہ بہت وسیع تھا۔

ارمنی زبان کی لغت اور اس کے قواعد صرف و نحو علماء لسانیات نے بآسانی مدون کر لئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس زبان کا تعلق اری زبان کے صرف و نحو سے ہے اور اسی بناء پر ابتداءً قیاس کیا گیا تھا کہ ارمنی زبان اری کی ایک شاخ ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ واقعہ کچھ اور تھا یعنی سوا لغت اور صرف و نحو اری کے ارمنی زبان کی ایک اور شاخ بھی ہے جس کا اری سے کوئی تعلق نہیں۔ پس اسی بناء پر لازم ہوا کہ ارمنی زبان کو ایک مخلوط زبان مانیں جو لغت کے اعتبار سے دو شاخون یعنی غیر اری اور مخلوط اری پر مشتمل ہو۔ ارمنی، اری سے اس قدر مخلوط ہو گئی ہے کہ سوا علمی تحقیقات کے اور کسی طرح اس کا جدا کرنا غیر ممکن ہے۔ یہ زبان ان دونوں زبانوں سے اس طرح ملکر بنی ہے جس طرح زبان فارسی، عربی و ایرانی سے ملکر ارمنی مخلوط زبان کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اور علمی تحقیقات کی نظر سے ماہرین لسانیات کی نظر میں اہمیت رکھتی ہے۔ ان کو بہت کد و کاوش اور غور و خوض کے بعد معلوم ہوا کہ ارمنی قدیم اور گرجی حقیقت میں ایک ہی ہیں۔

ماوراء قفقاز کی تیسری زبان ترکی آذری ہے۔ یہ زبان مملکت آذربائیجان میں دوسری زبان کی بہ نسبت دیر میں آئی۔ اس کے آنے کا سبب ترکوں کے ایک قبیلے کا آنا تھا جن کی وجہ سے اس کی تخلیق ہوئی۔ ترکی آذری ترکی نسل کی زبانوں میں سے عثمانی، ازبکی اور تاتاری کے مانند ہے تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں ایرانی آذری کا عنصر اس وقت تک موجود ہے۔ اہل آذربائیجان اور شیروان ترکوں کے آنے سے قبل ایرانی بولتے تھے یہ صرف تحقیق علمی ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے

ورنہ یہاں کے تلفظ میں اس قدر فرق ہو گیا ہے کہ فرق معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔

ایران کی گم شدہ زبان کے آثار اب تک کافی طور پہ دریافت نہیں ہوئے ہیں لیکن ایران شناسی کے لئے اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ تقریباً دو سال پیشتر آقائے سید محمد تبریزی کا ایک اہم رسالہ "زبان آذری یا زبان پاستان آذربائجان" اس موضوع پہ شایع ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ رسالہ مذکور تحقیقات زبان آذری میں سب سے پہلا رسالہ ہے جو علمی تحقیق کے لئے ایک نیا دروازہ کھولدیگا۔

مندرجہ بالا تینوں زبانیں دولت ادبی سے مالامال اور اس وقت بھی مائل بہ ترقی ہیں۔ تلفظ کے لحاظ سے تینوں ایک دوسرے سے جدا دوسری مختلف حیثیتوں سے ایک ہی ہیں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ محققین لسانیات کو نہیں معلوم ہوتا کہ کسی مقام کے تلفظ کو زبان کا اصلی تلفظ سمجھنا چاہیے یا کسی دوسرے مختلف زبان کے۔ پہاڑی مقامات میں تلفظ کا مختلف ہونا قدرتی ہے کیونکہ ان کی وجہ سے مختلف قبائل ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں اور چونکہ اکثر کو مستانوں میں آمد و رفت آسان نہیں ہوتی اسی وجہ سے پہاڑی قبیلے ایک دوسرے سے بہت کم اجتماعی اور اقتصادی تعلقات رکھتے ہیں جس کی وجہ سے لسانی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ ..... کسی مقام کے "عوام" کا تلفظ وہاں کے اقتصادی اور اجتماعی حالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر یقین ہوتا ہے کہ فلان مقام کے "عوام" کا تلفظ بہ اعتبار لغت اور قواعد کے قدیم تلفظ اور زبان کے آثار کو محفوظ کئے ہوئے ہوگا۔ جو اکثر علما و فضلا کی زبان میں متروک اور تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ماہرین لسانیات کو چاہئے کہ جس طرح ماہر نباتات ہر درخت اور ماہر حیوانات ہر حیوان کا معائنہ کرتا ہے۔ اسی طرح ہر زبان کا گہرا مطالعہ کریں۔ مورخ اور ماہر لسانیات کا فرض ہے کہ وہ تمام زبانوں کو اپنی تحقیقات کا مرکز قرار دے (خواہ وہ علمی ہوں یا نہوں) کسی حالت میں بھی بغیر کافی تحقیق کے نہیں کہا جا سکتا کہ فلان زبان کی تحصیل و تحقیق بیکار اور بے فائدہ ہے بلکہ اس کے خلاف یہ امید رکھنی چاہئے کہ اس زبان کی تحقیق انسانی زندگی پر ایک نئی روشنی ڈالے گی۔

اب ہم اور اے قفقاز، اس کے پہاڑی سلسلوں، اور شمالی خطۂ ملک کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جہاں صرف چند قبیلے آباد ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت قلیل ہے اسی خطۂ ملک میں بعض اوقات ہم کسی قبیلے سے ملتے ہیں جو کسی خاص زبان میں گفتگو کرتا اور صرف

پانچ چھ قریوں میں سکونت رکھتا ہے اور اس کے اطراف و اکناف میں رہنے والے اس کی زبان سے ناآشنائے محض ہوتے ہیں۔

شمالی مشرقی قفقاز یعنی داغستان میں چھ زبانیں ملتی ہیں جن میں سے ہر ایک صرف ایک ایک گاؤں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے (کوباچی یا زرہ گران، ارچی، تبلیق، تکیتا، تیندی اور خواشی) ان میں سب سے بڑی زبان کوباچی یا زرہ گران ہے جو فقط تین سو خاندانوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

لسانی اختلافات کا سبب کوہستانی زندگی بھی ہے لیکن چونکہ یہ اختلاف اقتصادیات اور اجتماعیات کی ترقی میں مانع اور سدّ راہ ہوتے ہیں اس لئے ہمسایہ قبائل کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے واقفیت حاصل کریں یا اپنی زبانوں کے علاوہ کسی دوسری زبان کو مشترکہ طور پر حاصل کریں اور اس طرح لسانی اختلافات کی مشکلوں کو آسان کریں۔ یہی سبب ہے کہ اس ملک کے جو قبیلے محدود اور غیر معروف زبانیں بولتے ہیں بچپن ہی سے علاوہ مادری زبان کے ایک دوسری زبان جو وہ اور ان کے ہمسایہ سمجھ سکتے ہیں حاصل کرتے اور اپنے ہمسایوں سے ربط و ضبط قائم رکھتے ہیں۔ اس ملک کی عورتیں صرف مادری زبان حاصل کرنے پر اکتفا کرتی ہیں گویا اس ملک کے باشندوں کی مادری زبان حقیقت میں مادری زبان ہوتی ہے

بعض مقامات پر روسی زبان نے اشتراکی زبان کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن قفقاز مشرقی کی مختلف قومیں ترکی زبان کی ایک شاخ کو استعمال کرتی ہیں بحرِ خزر (Caspian Sea) کے شمال یعنی شہر دربند میں دبان قمق (ترکوں کی زبان جو وہاں رہتے ہیں) اچھی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر ہم شہر دربند کے جنوب میں جائیں تو ہم کو ان مقامات میں ترکی اوزبکی کی اہمیت نظر آئیگی۔

داغستان کی پہاڑیوں میں ایک اور اشتراکی زبان ملتی ہے جو وہاں کے سب سے بڑے قبیلہ آوار کی زبان ہے (یہ قبیلہ صحرائے شمال سے گرجستان تک قفقاز کی پہاڑیوں کے دونوں جانب مسکن گزین ہے) چونکہ لوگ شمالی قفقاز اور سلسلۂ کوہ کی مختلف زبانوں سے اچھی طرح واقف نہیں اس لئے ہم اس جگہ تمام معلوم شدہ زبانوں کو درج کرتے ہیں۔

بحرِ اسود کے ساحل اور جبال قفقاز کے جنوب میں انجلو اور اسوان نامی دو قبیلے رہتے ہیں

ان میں سے قبیلۂ اسوان کی زبان گرجی زبان سے بہت مشابہ ہے اور اسوانی تمدن بھی گرجی تمدن کا خوشہ چین معلوم ہوتا ہے۔ قبیلۂ انجاز جس زبان کو استعمال کرتا ہے اس کو گرجی یا نواح کی چرکسی زبانوں کی زنجیر اتحاد کہہ سکتے ہیں۔

چرکسی قبائل روسیوں کے ہاتھ سے شکست کھانے کے قبل بحر اسود کے سواحل اور قفقاز کی پہاڑیوں کے شمال میں جھیل کوبان تک پھیلے ہوئے تھے۔ روسیوں سے سخت اور خونریز جنگوں کے بعد یہ لوگ اپنے ملک کا ایک بڑا حصہ ان کو سپرد کرنے پر مجبور ہوئے ان میں سے کچھ تو اپنے ملک سے ہجرت کر کے ترکی یعنی اپنے مسلمان بھائیوں کے ملک میں چلے گئے اور کچھ اپنے وطن میں روس کے زیر اثر رہتے ہیں۔ قبیلۂ قبارداجو قفقاز کے شمالی پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا ہے ایک زبان استعمال کرتا ہے جو چرکسی زبان سے بہت مشابہ ہے۔ اسی حصۂ ملک میں دو اور قبیلے بھی پائے جاتے ہیں جو ترکی نسل سے ہیں اور تاراجائی اور باتقار کے نام سے موسوم ہیں۔

مذکورۂ بالا قبائل کے مشرق یعنی راہ شوسہ گرجستان میں کہ شہر ولاد یانقفاز سے گرجستان کے پایۂ تخت یعنی تفلس تک جاتی ہے، قوم السنتی کا مسکن ہے۔ یہ قوم جو جبال قفقاز کے وسط میں رہتی ہے اس وقت تک ایرانی آری زبان بولتی ہے۔ تحقیقات لسانی سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم السنتی ایرانی نسل کا ایک بڑا حصہ ہے یہ قوم بہ زمانہ قدیم میں روس کے جنوبی جنگلوں میں بھٹک کر وہاں کے پہاڑوں میں مسکن گزین ہو گئی تھی۔ (اس کو اس زمانہ میں ساکا یا اسکیٹ کہتے تھے) مرور زمانہ اور دوسری قوموں کے خلاملا سے جو اکثر ایشیا سے روس کے جنوبی جنگلوں میں جا کر بس گئیں اس قوم کا نام صفحات تاریخ سے قریب قریب محو ہو گیا ہے لیکن ابھی بالکل نہیں مٹا کیونکہ ان کی اولاد اس وقت بھی وسط جبال قفقاز میں پائی جاتی ہے۔

زبان السنتی بھی مثل ارمنی زبان کے ایک مخلوط زبان ہے جس کا ایک جز یرانی اور دوسرا غیر ایرانی ہے۔ علمی تحقیقات اور ایران شناسی کے لئے زبان السنتی کافی اہمیت رکھتی ہے اور شاید کسی وقت محققین ایرانی کی نظر اپنی طرف ضرور متوجہ کر کے رہیگی۔

ہندی کی ابتداء اور نشوونما پر ایک نظر

از

جناب لالہ ستیارام صاحب بی اے صدر شعبہ ہندی آل انڈیا اورینٹل کانفرنس

جناب لالہ ستیارام صاحب کی شخصیت ہندوستان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور فرانسیسی وغیرہ مختلف زبانوں کے ماہر ہیں کئی سنسکرت ڈراموں اور شاعری کے کتابوں کا ہندی نظم و نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ ذیل میں آپ کا وہ فاضلانہ خطبہ شایع کیا جاتا ہے جو آپ نے بحیثیت صدر شعبہ ہندی سوئم مستشرقین ہند کے اجلاس نہم (آل انڈیا اورینٹل کانفرنس) میں بمقام لاہور علماء و فضلا کے ایک بڑے مجمع کے آگے پڑھا تھا۔ ہم اس کے لئے اپنے مکرم دوست مولوی غلام رسول صاحب مدگار پٹی کالج کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس کو ہندی سے اردو کا جامہ پہنایا۔ (مجلۂ مکتبہ)

اورینٹل کانفرنس کی استقبالی کمیٹی کے صدر نشین! خواتین اور برادران!

پانچویں اورینٹل کانفرنس کے ہندی شعبہ کی صدارت کے انتخاب کے لئے میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ حضرات نے مجھ سے بڑے عالم کو صدارت کے لئے منتخب کیا ہوتا، تو بہت اچھا ہوتا لیکن گو میں قابلیت میں کم ہوں تاہم یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں ہندی کی خدمت کرنے والوں میں سب سے قدیمی ہوں پچاس برس ہوئے میرا بھارتیندو (ہلال ہند) ہریشچندر سے تعارف ہوا تھا اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ موجودہ ہندی کے باوا آدم کہلانے کے ہر طرح کے مستحق ہیں۔ اس سے پہلے میں اودھ اخبار کی ادارت کر چکا تھا۔ جناب منشی نول کشور سی آئی ای اس کے بانی تھے اور یہ اردو اخبارات میں بہترین پرچہ شمار کیا جاتا تھا، منشی نول کشور پہلے کوہ نور کے دفتر میں تھے وہ لاہور سے لکھنؤ آئے تھے اور وہیں بس گئے تھے۔ میں نے ۱۸۸۹ء میں دیکھا تھا منشی ہرسکھ رائے پر منشی نول کشور کی بڑی نظر عنایت تھی۔ منشی ہرسکھ رائے اس کالیستھ قوم کی کانفرنس کے صدر تھے۔ جو الہ آباد میں ہوئی تھی۔ بھارتیندو ہریشچندر کے اثر اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے میرے دل میں

ہندی کی محبت پیدا ہوگئی۔ اسی محبت کے سبب میں تقریباً نصف صدی تک ہندی کی خدمت کرتا رہا ہوں اس کے علاوہ آپ حضرات واقف ہی ہوں گے کہ کچھ ایسے حقوق ہیں جو مجھے اپنے بزرگوں سے ملے ہیں۔ کچھ ایسے امتیازات ہیں جنھیں خود میں نے پیدا کئے ہیں۔ اور ایک بات تو ایسی ہے جسے خود سری رام چندر جی نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ میری مراد اپنے وطن سے ہے۔ میری پیدائش اسی شہر میں ہوئی ہے جہاں خود سری رام چندر جی نے اوتار لیا تھا۔ اجودھیا میں پیدا ہونے کا مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے اور ہندی کے قارئین نے اکثر دیکھا ہوگا کہ میں اپنے نام اور دستخط کے ساتھ اجودھیاوی لکھتا ہوں۔

اس شہر کو سری رام چندر جی کے دوسرے صاحبزادے لب نے بسایا تھا۔ اسی لئے یہاں آنے میں دراصل مجھے بہت مسرت حاصل ہوئی ہے۔ اگر میں استقبالیہ کمیٹی کے سکرٹری کے حکم کی تعمیل نہ کرتا تو میری ناموری نہ ہوتی۔ استقبالیہ کمیٹی کے سکرٹری کا نام لکشمن ہے اور سیتا رام کو بہت عزیز ہے۔

اب میں ہندی کی ابتدا کے متعلق عرض کروں گا۔ ہندی سے میری مراد ہندی ادب کی زبان ہے صوبہ جاتی زبانوں سے نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے بعضوں کو یہ حیرت و استعجاب ہوگا۔ ممکن ہے آپ حضرات میں سے کچھ اسے اپنے صوبہ کی حمایت سمجھیں۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے سات سو سال قبل صوبہ متحدہ کا نام "کوشل" تھا۔ اس زمانہ میں یہاں سورج بنسیوں کی حکومت تھی مگر ان کا پایہ تخت اجودھیا نہیں سراوستی تھا۔ آج کل سراوستی کے کھنڈرات گونڈہ ضلع کی مغربی سرحد پر "بہت" میں پائے جاتے ہیں۔ بدھ مت ازدیا کا مصنف لکھتا ہے کہ کوشل کی سلطنت آج کل کے صوبہ متحدہ سے بھی کچھ بڑی تھی۔ کوشل کی وسیع سلطنت میں نظم و نسق بہت اچھا تھا کوشل کی سلطنت میں پیر برابر (سیلانی فقرائے کامل) ادھر ادھر گھوما کرتے تھے۔ کیونکہ اس سلطنت سے پہلے ان فقراء کا وجود ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں ملک کی سیاسی حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ ان فقراؤں کی بدولت عام زبان کی بدھی اور تاریخی حصوں کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی چلی گئی۔ اس طور پر ظاہر ہے کہ ان فقراء نے کوشل سلطنت کے زیر سایہ عوام الناس کی زبان کو بڑی ترقی دی۔ اس زمانہ میں سراوستی میں عام لوگوں کی ایک زبان تھی۔ اسی زبان میں سراوستی کے باشندے آپس میں بات چیت کرتے تھے سلطنت ۔۔۔ کے

عہد ہ دار اسی میں کام کرتے تھے۔ تجارت پیشہ لوگ اسی کا استعمال کرتے تھے اور علماء بھی اسی زبان کے ذریعہ اپنی قابلیت کا اظہار کرتے تھے۔ اس زبان کا دائرہ صرف کوشل حکومت تک ہی محدود نہیں تھا۔ بلکہ اس کا پھیلاؤ دلی سے پٹنہ اور سراوستی سے اوتی تک پایا جاتا تھا۔

آپ حضرات اس بات کو کامل توجہ سے ذہن نشین کرلیں کہ یہ فقرے کامل در اصل اچھے سادھو اکرتے تھے۔ اور کبھی کبھی بہت بڑے عالم بھی۔ جہاں تک میرا حافظہ ساعدت کرتا ہے سوامی دیانند سرسوتی جو آریہ سماج کے بانی ہیں۔ پربراجک چاری ہی کہلاتے ہیں۔

گوتم بدھ نے بھی اسی عوام الناس کی زبان میں اپنی تعلیم و تلقین کی تھی اور تین صدیوں کے بعد اشوک نے بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اسی زبان میں چٹانوں پر تحریرات کندہ کروائی تھیں جو لوگ ان کتابوں کو ذرا سی توجہ سے بھی پڑھیں گے۔ انہیں اس تبدیلی کا پتہ چل جائیگا۔ یہ کتبات مشرق میں گنجام سے لے کر مغرب میں ستھوار گڈھی افغانستان تک اور شمال میں کالسی (ہمالیہ کی ترائی) سے لے کر جنوب میں سدھاپور (میسور) تک لکھے گئے تھے۔ اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ سرکاری ملازمین اور پبلک انہیں سمجھیں۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ اشوک کے عہد حکومت میں سب لوگ اس زبان کو سمجھتے تھے۔ اسی زبان سے ہندی کی ابتداء ہوتی ہے۔ در اصل ہندی کے معنی ہند کی زبان ہے۔ ان سب وجوہ سے ہم لوگوں کو اسے ہندی کہنا چاہئے۔ اور یہی مناسب بھی ہے۔ اردو تو ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی فیصل شدہ نہیں ہیں۔ اس لئے اس زبان کو اردو کی بہ نسبت ہندی کہنا زیادہ مناسب و موزوں ہے۔ میں نے پورانوں کا مطالعہ کیا ہے اور میں مسٹر پارجیٹر کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ ہندوستان میں شمال مغربی گوشہ سے آریوں کا حملہ کبھی نہیں ہوا۔ آریوں نے مشرق کی طرف کبھی کوچ نہیں کیا۔ آریوں کی قوت کا مرکز الہ آباد اور کوشل تھے۔ اور وہ یہیں سے آریہ لوگ چاروں طرف گئے اور پھیلے۔ ایسی روایت بھی ہے کہ دریوہ بھی آریہ تھے اور یہ شمال مغربی گوشہ کی طرف افغانستان اور اس کے آگے بھی چلے گئے تھے۔

دریوہ بیاتی کے پانچ بیٹوں میں سے ایک تھا بیاتی پرتشٹھاپور کا راجہ تھا۔ جو آج کل جھوسی کے نام سے مشہور ہے۔ جھوسی الہ آباد کے سامنے گنگا کے دوسرے کنارے پر ہے۔ بیاتی کے اور بیٹوں کے نام یدو، ترسو، انو اور پرو تھے۔ پرو پرتشٹھاپور کی گدی پر بٹھایا گیا۔ یدو کو جنوب مغرب کی، ترسو کو جنوب مشرق، دروہیو کو مغرب کی اور انو کو شمال کی سلطنت ملی تھی۔

چندر بنسیوں میں شنشونڈو ایک مشہور راجہ تھا اور غالباً اس نے دریوہوں کو پنجاب کی طرف بھگا دیا تھا۔ شنشونڈو کی بیٹی کا بیاہ ماندھاتا سے ہوا تھا۔ اسی ماندھاتا کے عہد حکومت میں اجودھیا کو بڑی ترقی ہوئی تھی۔ ماندھاتا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی حکومت میں سورج کبھی نہیں ڈوبتا تھا۔ پنجاب میں انگر نامی دریوہ راجہ تھا۔ ماندھاتا سے اور اس سے لڑائی ہوئی تھی اور آخر میں اس نے انگر کو شکست دی تھی۔ اسی لئے کانپے کیمبوجن اور یونن کے ملکوں نے ضرور اس کی بڑائی کو تسلیم کیا ہوگا۔ انو نبسی بھی شاید اس کا ولی مان گئے تھے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے دشمنوں پر حملہ کیا تھا یا نہیں۔ کیونکہ شنشونڈو اس کے سالے تھے۔ دریوہ راجاؤں میں سے ایک کا نام گاندھار تھا اور یہ گاندھار ملک کا راجہ تھا۔ یہاں دریوہ راجاؤں کا اقتدار دائمی رہا ان کے بارہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پانچ پشت کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اور یہ بہت طاقتور ہو گئے اور تب انہوں نے اپنی حکومت ہندوستان کے شمالی نیچے ملکوں پر قائم کی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک پوران کا قصہ ہے۔ لیکن قصے جعلی نہیں ہوتے ہیں۔ ان سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ ہندوستان میں آریوں کے دو حملے ہوئے تھے۔ اور اس سے ہندوستان میں دو طرح کی زبانوں کی ابتدا ہو گئی اشوک کے عہد حکومت سے لیکر سری ہرش کے زمانہ تک کا تاریخی مواد پورے طور پر نہیں مل سکتا اس لئے میں ٹھیک ٹھیک یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس عام زبان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ کیسی کیسی ترقیاں ہوئیں اور آخر میں اس نے کیسی صورت اختیار کر لی۔ شیو سنگھ سروج کے مطابق ہندی کی پہلی کتاب سری ہرش کے زمانہ میں لکھی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب فن شاعری پر لکھی گئی تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے اس زبان میں نظمیں بھی لکھی گئی ہوں گی۔ جو لوگ اس بات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ اشوک کے زمانہ کی پراکرت نے موجودہ ہندی کی شکل کیسی اختیار کر لی انہیں بدھ اور جین دھرم کی کتابوں کا کامل توجہ سے مطالعہ کرنا چاہئے جینوں کے انگ نام کی کتاب عوام کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اور یہ یقین کیا جاتا ہے کہ قبل مسیح کی چوتھی صدی کے اخیر اور تیسری صدی کی ابتداء میں یہ لکھی گئی تھیں مگر ان کا وجود ۴۶۶ء کے اختتام ہی میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب کتابیں یا تو پراکرت میں لکھی گئی ہیں یا اردھ ماگدھی میں اردھ ماگدھی کا دوسرا نام اودھی یا کوشل کی زبان ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندی ادب کی سب سے قدیم کتابیں اسی اودھی زبان میں پائی جاتی ہیں، تو آپ حضرات کو تعجب نہیں کرنا

جاتے ہیں۔ حال کی تحقیق اور انکشاف اس بات کو اور بھی زیادہ مستند کرتے ہیں۔ بھال نے (سنہ ۱۰۰۰ھ) میں سری مدبھگود گیتا کا ترجمہ اودھی زبان میں کیا تھا لیکن کچھ علما اس تاریخ کو مستند نہیں مانتے دوسرے مشہور مصنف امیر خسرو ہیں جو چودھویں صدی بکرمی میں ہوئے تھے یہ اجودھیا میں دو برس تک رہے اور مشہور کتاب خالق باری کو اودھی زبان میں اجودھیا میں ہی تصنیف کیا تھا۔ ان کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی کبیر داس بنارس میں نمودار ہوئے اپنے بول اور نصائح کو اسی زمانے کی اودھی زبان میں لکھا۔ اس کے بعد کئی سنتوں نے بھی اودھی زبان میں شاعری کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان سنتوں کی زبان پر اپنے اپنے صوبوں کی بولی کا بھی ضرور اثر پڑا تھا لیکن اصل میں ان کی بڑی زبان اودھی ہی تھی۔ یہ لوگ عوام کے فائدے کے لئے لکھتے اور عام لوگوں کی زبان کا ہی استعمال کرتے تھے میرے پاس ایشور داس کی ایک کتاب اودھی زبان میں ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ کتاب مذکور سن ۱۵۵۸ء میں دلی میں لکھی گئی اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ سولہویں صدی کی ابتدا میں بھی برج بھاشا کا وجود دلی میں نہیں تھا۔

اودھی زبان پر مغربی ممالک کا اثر یقینی پڑا تھا اسی اثر کے سبب مغربی اودھی بیسواڑی کہلاتی ہے۔ اس بات سے کچھ عالموں نے یہ قیاس کیا ہے کہ اودھی پر برج بھاشا کا اثر پڑا ہے۔ لیکن یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ ولبھاچاریا کے "کرشن سپردائے" کے پہلے ادبی زبان کی حیثیت سے برج بھاشا کا وجود ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ مگر ولبھاچاریا کے مشہور چیلے سورداس نے اپنے غیر فانی کلام میں برج بھاشا کا استعمال کیا اور اس وقت سے برج بھاشا کا شمار مشہور زبانوں میں ہونے لگا۔

ان سب بیانات سے میرا یہ منشا نہیں کہ میں برج بھاشا کی عظمت کو نہیں مانتا یا اس کی برائیاں ہی گنانا منظور ہے۔ ہرگز نہیں ایسا کرنے سے میرا منشا اپنی صوبہ کی زبان کے بارے میں ایک غلطی کی اصلاح کرنا ہے۔ موجودہ زمانے میں کھڑی بولی میں صرف نظم ہی نہیں لکھی جاتی نثر بھی لکھی جاتی ہے۔ لیکن کھڑی بولی اور سورداس کی زبان میں کچھ بھی رشتہ نہیں ہے۔

اس میں کچھ بھی شبہ نہیں کہ آج کل برج بھاشا میں پوری کامیاب نظم لکھی جاتی ہے بابو جگناتھ داس رتناکر نے "گنگا وترن" نام کتاب پر ہندوستانی اکاڈیمی کی جانب سے انعام حاصل کیا ہے۔ کیونکہ آخری سال میں یہی کتاب بہتر سمجھی گئی ہے۔ سرکار لیوگی ہری کو بیرسٹ سنگھ پرشاد

پرشاد انعام ملا ہے۔ یہ انعام ہندی ہیئتہ سمیلن ہر سال عطا کرتا ہے۔

اب میں اس بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں ہندی ادب میں کیا ترقی ہوئی ہے۔ آٹھ برس ہوئے کلکتہ یونیورسٹی کے اس وقت کے چانسلر اور مشہور ماہر تعلیم سر آشوتوش مکرجی کے حسب ایما میں نے ہندی ادب سے متعلق انتخابات مرتب کیا تھا۔ اس میں سات حصے تھے۔ اور میں نے ہندی ادب کی مندرجہ ذیل چھ عنوانات کے تحت تقسیم کی تھی۔

(۱) چارن کاوے (چارن کی شاعری) (۴) سنت کاوے

(۲) کرشن کاوے (کرشن کی شاعری) (۵) سایتیے شاستر (علم ادب)

(۳) تلسی داس۔ (۶) اتے کوئی (دو جلدوں میں)

پہلے عنوان کے سوا کل دوسری نظموں کا تعلق دھرم سے زیادہ تر ہے۔ اس لئے یہ وھارمک (مذہبی) کہی جاسکتی ہے۔ اس میں تو کچھ بھی شبہ نہیں ہے کہ کرشن کاوے، رام کاوے، اور سنت کاوے دھارمک ہیں۔ لیکن ہندی ادب میں شرنگار رس (تغزل کا رنگ) سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ ہندی کے شاعروں نے اسکاٹ کی نظموں کو بھی مات کر دیا ہے اور عشق و محبت کے بیان کرنے میں اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اسکاٹ کہتا ہے کہ "عشق ہمیشہ نغمہ ساز کے جذبات کو ابھارتا رہا ہے" ایسے مضمون کی نسبت میں کیسے کم مایہ کہہ سکتا ہوں۔ ہندی کے ان شاعروں نے اپنے کو صرف فروتر ہی ثابت نہیں کر دیا ہے۔ بلکہ یہ فاتحی مرد بن گئے۔ اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ ہندی کے کچھ شاعر ڈرائیڈن کی طرح ہوتے تھے۔ ڈرائیڈن کے متعلق مندرجہ ذیل امور بیان کئے جاتے ہیں:۔

لچھے راجا اور بدمعاش درباری شاعروں کو تھوڑا چھیڑتے دیتے تھے اور یہ ان کا دل لبھانے کی کوشش کرتے تھے۔ شعرا ان کے نفسانی جذبات کے لائق بیہودہ شاعری کرتے تھے۔ یہ بہت ہی لچر رمز، گیت، اور نظمیں کہتے تھے۔ بہرحال یہ شاعری کے مقصد سے بے خبر تھے۔ اسے دھوکا دیتے تھے اور الیشور شکتی کو ناپاک کرتے تھے اسی طرح یہ اعلیٰ خیالات کا خون کرتے تھے یہ شاعر بھی لاعلمی سے کرشن کو نایک اور رادھا کو نایکا مان کر شاعری کرتے تھے ہندی ادب میں کرشن کا وہی درجہ ہے جو تورات ہندیں زیڈ کا۔ اس ادب میں کرشن، پریم نیتی کی ہر خطا کو کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ داس ہندی شاعری میں بہترین تھے لیکن وہ بھی لکھتے ہیں:۔

آگے کے سکوی رہی ہیں تو کبتا ئی۔ نہ تو رادھیکا کنہائی سمن کو بھانو ہے

لیکن ملک میں مغربی تعلیم کی اشاعت سے ایسے شاعروں کی کمی ہوتی چلی جاتی ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ انکی تعداد گھٹ رہی ہے۔ ہندی ادب نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا ہے۔

کاشی نگری پرچارنی سبھا نے سب سے پہلے ہندی کی حمایت کی اور اس کی ترقی کے لئے جد وجہد کرنا شروع کیا۔ آخری تیس برسوں میں اس نے کئی مشہور کتابوں کو شایع کیا ہے۔ ان میں کچھ قدیم ہیں اور کچھ جدید۔ مثال کے طور پر ہندی لغت "ہندی شبد ساگر" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت جلد مکمل ہو جائیگا۔

اسی سبھا کے باہمت اراکین نے ساہتیہ سمیلن کی بھی بنیاد ڈالی تھی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں سمیلن کے اٹھارہ اجلاس ہو چکے ہیں اس کا ایک صدر دفتر الہ آباد میں ہے۔ سمیلن کئی قسم کے کام کرتا ہے وہ امتحان لیتا ہے اور اسناد بھی دیتا ہے۔ اس نے کئی کارآمد کتابیں بھی شایع کی ہیں ہندی اہل قلم کا کام صرف سبھا اور سمیلن تک ہی موقوف نہیں ہے۔ سرسوتی، مادھری، سُدھا، مہارتھی اور وشال بھارت جیسے مشہور رسائل کے علاوہ دس سال (۱۹۱۷ تا ۱۹۲۶ء) میں مختلف موضوع پر صرف صوبجات متحدہ آگرہ اودھ میں (۱۲۸۷۹) کتابیں شایع ہوئی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

صنعت و حرفت ..... (۲۶)	مصری ..... (۱۴۲۴)
سیر و تذکرہ ..... (۲۷۱)	شاعری ..... (۵۶۰۹)
ڈراما ..... (۳۰۰)	سیاست ..... (۳۶۸)
افسانہ ..... (۱۲۸۲)	فلسفہ (نفسیات و اخلاقیات) ..... (۶۸)
تاریخ ..... (۵۶۱)	مذہب ..... (۸۰۰)
السنہ ..... (۱۲۰۷)	سائنس (ریاضی اور آلات سے متعلق) (۳۸۶)
قانون ..... (۶۸)	سائنس (مطالعہ قدرت اور دوسری مجردی بحثیں) (۳۶)
ویدک ..... (۲۶۴)	جملہ عنوان (۱۲۸۷۹)

اس میں کلام نہیں کہ یہ ملامت بخش ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ علماء نے اور میں نے ہندی کی ضروریات سے متعلق ایک بڑی بھاری فہرست بنائی ہے۔ اور اسے میں نے ہندوستانی اکاڈیمی کو بھیج دیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو لوگ ہندی زبان میں ترقی کرنا چاہتے ہیں وہ کامل توجہ سے اسے پڑھیں گے۔ اور ان ضروریات اور کمی کو پورا کریں گے۔ اور

ہندی کو بھی اپ ٹو ڈیٹ بنانے کی سعی کریں گے۔ سائنس اور اس سے تعلق رکھنے والے مضامین کے لکھنے والوں کی راہ میں یہ دشواریاں حائل ہوتی ہیں کہ موزوں اصطلاحات نہیں ملتیں۔

ایک اور مضمون پر میں بہت ہی زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔ وہ تاریخ ہے اس کا خوب مطالعہ کرنا چاہیے۔ دورِ متوسط کی تاریخ اکثر فارسی نویسوں کے ذریعہ لکھی گئی ہے۔ اور ہندوستان کے فارسی مورخین ان ہندوؤں کی بھی بہت ہی کم تعریف کرتے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو دلی کی گدی دلانے میں امداد دی تھی صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کی تاریخی بحثا میں میں نے دو مقالے پڑھے تھے۔ ان میں سے ایک میں میں نے اس زمانے کی ہندی تاریخ کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی تھی کہ فرخ سیر نے دلی کا تخت تاگروں کی امداد سے حاصل کیا تھا۔ دوسرے مقالے میں میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ بیر سنگھ دراصل ایک بہت ہی اچھا حکمران تھا۔ یہی بیر سنگھ دیو مدارس کی تاریخی کتابوں میں ڈاکو اور لٹیرا لکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیر سنگھ دیو نے اکبر کے وزیر اعظم ابوالفضل کو مار ڈالا تھا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ بیر سنگھ دیو نے خود ایسا نہیں کیا بلکہ ابوالفضل نے اپنے جاسوسوں سے ایسا کرنے کے لئے بیر سنگھ دیو کو بے تاب کر دیا تھا۔ سر آتوش مکرجی کا بیان ہے کہ چارن کاویوں میں تاریخی مضامین ایک مصرع سے لیکر آٹھ یا دس ہزار مصرعوں تک پائے جاتے ہیں انکی اہمیت تاریخی ہونے کے سبب اور بھی شاندار ہو جاتی ہے کسی چارن کاوے سے کسی تاریخی واقعہ کا پتہ چلتا ہے تو کسی سے کسی مورخانہ تاریخ کا۔ کبھی کبھی یہ تاریخی واقعات کو ثابت کرنے میں بھی مدد دیتی ہیں ایسے چارن کاویوں کا کچھ مجموعہ میری منتخب کتابوں کے پہلے حصہ میں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے پایا جاتا ہے

دوسرا مضمون جس کی جانب ہندی اہل قلم کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں وہ ہندی ادب کی اصلاح و درستی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی کا لغت بہت ہی جامع و بسیط ہے۔ اس میں صحیح معانی کے اظہار کا سب طرح کا مسالہ موجود ہے۔ ہندی کی قدیم شاعری میں تخیلات کی بلندی ہے۔ اور اس میں مذہبی خیالات بہ احسن وجوہ ظاہر کئے گئے ہیں۔ ایشیا کے مذاہب کی تباہی کا تذکرہ اس شاعری میں خوب کیا گیا ہے۔ اس میں فلسفہ اور ادب سے متعلق مختلف کتابیں بھی ہیں۔ ان میں سنسکرت کی کتابوں کی طرح اعلیٰ مضامین جن طریق پر بیان کئے گئے ہیں اور باوصف اس کے ایسا کرنے میں سنسکرت کے الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندی میں الفاظ کی کچھ کمی نہیں ہے۔ اظہار بیان کی قوت بھی انگریزی سے کم نہیں ہے۔ تاہم یہاں

کچھ ایسی چال چل پڑی ہے کہ لوگ عوام کے لئے کتابیں نہیں لکھتے اور اکثر اپنی قابلیت کا اظہار کرنے کے لئے دقیق و مشکل الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام جن کی تعداد کئی لاکھ ہے اسے نہیں سمجھ سکتے اسے صرف سنسکرت کے عالم ہی سمجھ سکتے ہیں جن کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

ایک دفعہ انگلستان میں رومانوی مصنفین کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس کے خلاف بڑی بھاری یورش ہوئی۔ پہلے لوگ سچی باتوں کو ملمع سازی سے بیان کرتے تھے۔ اس کی مخالفت میں انگلستان کے باشندوں نے صدائے احتجاج بلند کیا۔ اور مصنوعی زبان کی ساری برائیوں کو دور کر دیا۔ جب انگلستان میں "رائل سوسائیٹی" کی بنیاد پڑی۔ تو اس میں زیادہ تر صفائی، سادگی اور سلاست پہ زور دیا گیا۔ سوسائٹی کے اراکین نے ان سب باتوں کو تحریر کے بارے میں اپنا مقصد ٹھیرا لیا اور وہ کامیاب ہوئے۔

روچیسٹر کے بشپ "رائل سوسائٹی" کے اولین مورخ تھے صاحب موصوف نے ایک بار لکھا تھا "رائل سوسائٹی نے اپنے ممبروں کو صاف ستھرا، فطری، موافق مضمون پیرائے کی طرف خاص توجہ کرنے پر بہت ہی زور دیا ہے۔ سوسائٹی کے اراکین نے ساری باتوں کو علم حساب کی طرح صریح الفہم صاف اور روشن بنانے کی ہدایت کی ہے۔ وہ لوگ عالموں اور بناوٹی زبانوں کی نسبت صناع، عوام اور تاجروں کی زبان کو زیادہ پسند کرتے ہیں"۔

میرے بیان کرنے کا منشاء یہ ہے کہ ہندی کے اہل قلم کو بھی اسی طرح عمل کرنا چاہئے۔

اب میں اپنی تقریر کو اسی پر ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ مختلف ساہتیہ سمیلنوں کے صدر نشینوں نے ہمارے قومی ادب کی ترقی کے بارے میں آرا کا اظہار کیا ہے اور صلاح دی ہے اس میں کلام نہیں کہ ان کی رایوں اور مشوروں سے ہندی کے اہل قلم نے استفادہ بھی کیا ہے لہٰذا مجھے کامل یقین ہے کہ وہ دن کچھ دور نہیں جب کہ دنیا کے ادب العالیہ میں ہندی ادب ایک اونچا درجہ حاصل کر لیگا۔ اب میں اورنیٹل کانفرنس کی کامل کامیابی کے لئے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرتا ہوں اور اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

عزازیل کا دربار

از جناب "الف لیلہ"

یوں تو ملاحوں کے قصے دلچسپ ہی ہوتے ہیں۔ جیسے "سندباد کا قصہ" لیکن ہمارے شط العرب پر دریائی تفریح کے دوران میں ایک عجیب و غریب ملاح سے ملاقات ہوئی جس نے ایک روز شام کا کھانا کھا چکنے کے بعد اپنا پائپ پیتے ہوئے ایک نیم فوق فطری قصے کا آغاز اس طرح کیا:۔

"بلال بڑا سخت جان انسان تھا" وہ ہماری برادری ہی کا ایک قوی ہیکل تھا لیکن بے حد درشت مزاج یقین مانئے چین سے لیکر آفریقہ تک کوئی ایسا ساحلی مقام غالباً بندرگاہ نہیں تھی جس سے وہ واقف نہ ہوگا۔ سفر کا بڑا شیدائی تھا۔"

ایک روز کا قصہ سنئے۔ غریب بلال مر گیا۔ وہ جہاز کے سلمی حصہ پر پھر رہا تھا کہ اوپر سے ایک موٹا لکڑی کا کندا رسون کو چیرتا پھاڑتا اس کے سر پر نازل ہوا۔ غریب بلال پسر کر رہ گیا۔ بلال کے مرنے میں تو کچھ شبہ نہیں جب وہ اٹھایا گیا تو خون میں لتھڑی ہوئی لاش تھی۔ سولی دی گئی، گولی سے ہلاکت ہوئی، چاقو سے بھونکا گیا، اور نہ صلیب پر چڑھایا گیا۔ بلکہ اسکی موت صرف ایک معمولی زبردست لکڑی کے کندے کے گرنے سے واقع ہوئی۔ خیال کیجئے کہ بلال جیسا سخت جان آدمی تقریباً ایک آسان موت کا شکار ہوتا ہے! اور پھر ایسی شہرۂ آفاق زندگی کے بعد..... خیر....."

اب اس کے ساتھیوں نے کتاب نکالی اور تاریخ ڈھونڈ کر اس کے نیچے لکھا "بلال ابن عتبی حادثے کا شکار ہوا، مقام بحیرہ سرخ" ایک سامن کا تھیلا نکالا گیا جس میں بلال کو ڈالکر سی دیا گیا۔ اس کے پاؤں میں لوہے کی دو موٹی سلاخیں بھی باندھ دی گئیں تاکہ وہ اپنے وقت سے پہلے نہ اٹھ بیٹھے۔ جنازہ کی نماز پڑھائی گئی لیکن جلدی میں کیونکہ جنوب مغرب سے طوفان کے آثار ہویدا تھے، اور کپتان کو محفوظ مقام پر پہونچنے کی خواہش تھی۔ تختے پر رکھ کر ایک دھکا دیتے ہی وہ چلا بلال! سمندر کے عمق کو ناپ چکا، اور گھڑیالوں اور مچھلیوں کے درمیان جاکر دم لیتا ہے۔

اب دیکھئے کہ بلال مر تو گیا، اور اس کے ساتھیوں نے اس کے حادثہ کو قلمبند بھی کر لیا لیکن بلال کو اس کا علم نہ تھا کہ وہ مردہ ہے جب سمندر کی ہری ہری زمین پر پھونچکر اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو بلال ابن جعفی ہی تصور کرتا رہا۔ حالانکہ آپ سمجھ گئے ہونگے وہ یہ نہیں تھا بلکہ اسکی روح تھی۔ مذہب سے ناآشنا تو تھا ہی۔ یا کم سے کم ان خیالات کو بہلا چکا تھا ورنہ وہ کیسے بیخبر رہتا تھا کہ وہ روح ہے اور اس کو اپنے شایان مثبت حرکات کرنی چاہئیں۔

خیر۔ بلال پہلے تو بے حد پریشان ہوا، جو بالکل فطری تقاضا تھا۔ بلال عجیب عجیب اجنبی مقامات میں رہ چکا تھا لیکن یہ اس کے لئے جہان دیگر ہی تھا۔ یہاں دھوپ، ہوا، ابر کا پتہ نہیں تھا بلکہ ہلکی زرد روشنی جو چاندنی سے ملتی جلتی تھی، اور ہر طرح کی مچھلیاں چھوٹی بڑی ادھر ادھر آتیاں جاتیاں، اور بلال کو آنکھیں پھاڑ کر گھوریاں۔ بلال کو اضطراب ہونے لگا۔

"یہ بھی عجیب طرفہ سرزمین ہے"۔ بلال نے کہا کیونکہ جیسے میں نے کہا وہ مردہ ہونے سے بے خبر تھا۔ "تعجب ہے کہ میں کیسے اس جہنم میں پہونچ گیا"؟

ہاں جب وہ ادھر ادھر دیکھکر اپنے ماحول کو جانچنا چاہتا تھا جیسا کہ اس کی جگہ آپ یا میں ہوتا تو کرتا، اس نے دفعتاً ایک اجنبی کو ایک خم پر بیٹھے دیکھا، بلال مردہ، ہو یا زندہ اس کو طرفہ ترین انسان پاتا ہے کیونکہ اس کے سر کے گرد ایک بڑا عمامہ بندھا ہوا تھا، ایک آنکھ پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں موٹا سمندری جوتا گھٹنوں سے اوپر پہونچ رہا تھا اور ایک سفید ڈھیلا ڈھالا پائجامہ پہنے ہوئے تھا۔ کمر میں ایک ڈنڈی تھی جس میں دو پستول اور ایک زنگ آلود چھرا لٹکا ہوا تھا۔"

"اچھا۔ تم بھی" اس نے اپنی ایک آنکھ کو بلال کی طرف گھما کر کہا۔

"اچھا تم بھی" بلال نے جواب دیا۔

"کس مقام سے آرہے ہو" سیاہ پٹی والے نے پوچھا۔

"سورت سے" بلال نے کہا۔ گو میں یہ نہیں جانتا کہ کس شیطان نے مجھے یہاں لا ڈالا اور یہ کون مقام ہے؟"

"خوب! دوسرے نے جواب دیا "تم مردوں میں پہونچ گئے ہو، یہ وہی مقام ہے"

"لیکن میں مرنے کیوں چلا تھا" بلال کہتا ہے۔

اس پر سیاہ پٹی والا ہنسنے لگا۔ بلال کو اس طرح بناتے ہوئے کہ اگر بلال روح نہ ہوتا تو انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتا۔

"اگر اب تم مردہ نہیں ہو تو پھر کبھی نہیں ہو سکتے" اس نے کہا "ہم سب یہاں مردے ہیں۔ ہر ایک ماں جایا۔"

"مردہ؟" بلال چیخ کر کہتا ہے۔

"ہاں مردہ، دوست مردہ"

خیر اس سے بلال اپنے کو مردہ سمجھنے پر مجبور تو ہو گیا لیکن عجیب کرب کی حالت میں مبتلا ہو گیا۔ آپ خود سوچئے۔ کیا محسوس کرو گے جب آپ اپنے آپ کو زندہ تصور کر رہے ہو اور کہا جائے کہ تم مردہ ہو۔"

"تو سوچوں کبھی اپنی تخواہ نہیں اٹھا سکوں گا اور نہ زمین کو دیکھ سکوں گا؟" بلال نے گویا اپنے آپ سے کہا۔

"کبھی نہیں دوست کبھی نہیں" سیاہ پٹی والے نے کہا "اب تمہیں یقین ہوا۔ تم مردوں میں ہو اس کو سمجھ رکھو۔" اور پھر وہی ہنسی ہوئی جو کراہنے سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

"چلو دوست چلو" اس نے بلال کی غمگین نظروں کو دیکھ کر کہا "خوش ہو کہ تم کو ہم جیسوں کی نیک صحبت نصیب ہوئی۔ ادھر نو فل ہیں۔ اس طرف کو چلو جہاں کپتان طارق اور امیر البحر عیسیٰ ہیں۔ ہاں ہزاروں اور بہتر اور بدتر انسان بھی ہیں۔"

غرض بلال بے دست و پا ہو کر سیاہ پٹی والے کے پیچھے پیچھے جاتا ہے حتیٰ کہ وہ ایک غار نما کے قریب جا پہونچتے ہیں۔

"تمہارا نام کیا ہے" یکایک سیاہ پٹی والا دریافت کرتا ہے۔

"بلال ابن عبسی" بلال کہتا ہے۔

"خوب! اب ہم اندر چلے چلیں گے" سیاہ پٹی والا کہتا ہے لیکن ڈھانچی انگلی بلال کی طرف اٹھا کر وہ کہتا ہے "دوست ہوشیار رہو، اپنے جبڑوں کو مضبوط پکڑے رہو جب تک تم سے نہ کہا جائے، منہ نہ کھولنا بس اب خاموش رہو۔"

وہ اندر گئے۔ بلال غار کی وسعت کو دیکھ کر حیران ہو گیا حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر

وسیع تھا کہ اس کی حدیں ناپیدا اور پہلو غائب تھے۔ جس طرف اس کی نگاہ اٹھ گئی اس نے آدمیوں کو شطرنج، گنجفہ کھیلتے ہوئے سکے اچھالتے ہوئے اور دوسرے تمام پیچیدہ کھیلوں میں مشغول پایا۔ اکثر تمباکو اور شراب پی رہے تھے جس کی بو سے بلال نے پہچان لیا کہ قیمتی ہے۔

یہ عجیب مجمع تھا بعض سر سے رومال باندھے ہوئے تھے اور سیاہ پٹی والے کی طرح ان میں سے اکثر بھدے موٹے موٹے سمندری جوتیاں اور بعض کیانویس کے گھاگرے پہنے ہوئے تھے کسی کے بال چوٹی میں گوندھے ہوئے اور کسی کی زلفوں کی شکل میں جمے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک آنکھ، ایک پاؤں اور ایک بازو رکھتے تھے، رنگ بھی ان کے مختلف تھے، کالے گورے گندمی، زرد، اور روہ یا تو خم پر بیٹھے ہوئے تھے یا زمین پر دراز۔

ان میں سے ایک نے دفعتاً کہا۔ "گھنٹی بجاؤ"

سیاہ پٹی والا ایک بڑے جہاز کے گھنٹے کے قریب گیا جو ایک شکستہ متحجر جہاز سے لٹکا ہوا تھا اور ایک ہتھوڑے سے تین زد لگائے جس پر سبھوں نے پینا اور کھیلنا موقوف کر دیا۔ ایک بھی نہیں ہلتا تھا۔

گھنٹے کی گونج ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کمرہ کا دروازہ کھلا، اور ایک ایسا قوی ہیکل آدمی باہر نکلا کہ بلال نے شاید ہی دیکھا ہو۔ اس کا قد سوا تین گز لمبا، لانبی ناک طوطے کی چونچ کی طرح خمیدہ، پیلے دانت، آنکھیں آگ کے ڈلے اور تیور ایسے تھے کہ بلال خوف سے تھرانے لگا ٹیلہ پر چڑھتا ہے اور ایک خم پر آسن جماتا ہے۔ اس کے پیچھے سے ایک ظریف نمودار ہوا جس کی آنکھوں پر زبردست چشمے لگے ہوئے سر پہ بھاری ٹوپی تھی جس سے سر ایک طرف جھک گیا تھا۔ یہ ظریف ہتھوڑے کو اٹھا کر ایک دفعہ گھنٹے پر مارتا ہے۔

"خاموش"! اس نے کہا، حالانکہ اس وقت کسی کے سانس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ خاموش! حضور ہیبت مآب عزازیل رونق افروز ہیں۔

"یہ نیارکن کون ہے؟" عزازیل نے ایسی آواز میں دریافت کیا گویا وہ دور سے تار کے ذریعہ کہہ رہا ہے۔

اس پر سیاہ پٹی والا چہرہ پہ کی لٹوں کو سنبھال کر زمین بوس ہوتا ہے اور مودبانہ بلال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"نام؟" عزازیل نے بلال کی طرف متوجہ ہو کر اس طرح کہا، غریب ایک بے سہارا پتے کی طرح ہلنے لگا۔

"بلال ابن عبتی خداوند" بلال نے پیشکل جواب دیا۔

"حضور کہ حضور" ظریف نے ڈانٹ کر کہا۔

"کتاب لاؤ۔ جلد چار ہزار چھیاسی" عزازیل نے حکم دیا۔

اس پر دو شخص ایک زبردست ترین کتاب جو بلال کی نظروں سے گذر سکتی تھی لیکر حاضر ہوئے۔ اور سنجرہ ظریف اوراق الٹنے لگا۔

"ب، ب، ب" وہ گنگناتا جاتا ہے۔

اور بلال، بلال، یہ لو یہ نکل گیا۔ بلال ابن عبتی پیدائش سنہ انیس لاکھ چوبیس ہزار اخراج[1] حضور ہیبت مآب یہ تم ہو" ظریف نے عینک کے کناروں پر سے نظر دوڑا کر بلال سے دریافت کیا"

"ہاں جناب" بلال جواب دیتا ہے۔ اور، اور۔

"اس کا عمل نامہ کیا ہے؟" عزازیل نے دریافت فرمایا۔

اس پر ظریف نے بلال کے جرائم اور سیاہ کاریوں کو یکے بعد دیگرے پڑھنا شروع کیا۔ اور میری بات پر یقین کیجیے کہ ظریف کو عمل نامہ ختم کرنے کے لئے کچھ دقت صرف ہوا۔ دوسرا ورق الٹنے کے لئے جب وہ رکتا ہے۔ تو بلال دیکھتا ہے کہ حاضرین میں سے ہر ایک بشمول عزازیل اسکی طرف خوش اور دوستانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے وہ بھی مطمئن ہو گیا کہ اب کوئی دم میں دوستوں کے ہمراہ شراب نوشی اور قمار بازی میں مصروف ہو جائیگا۔

یہاں تک تو نہایت قابل قدر اعمال ہیں عزازیل نے بلال کی طرف دیکھکر فرمایا لیکن بلال! بھول نہ جانا کہ افتخار کے قابل نہیں"۔ ظریف پھر پڑھنا شروع کرتا ہے۔

"سن بتیس سال ارتکاب بغاوت اور قتل عمد۔ سن اڑتیس سال" وہ یکایک رک گیا اور بلال کے جسم میں رعشہ محسوس ہونے لگا۔ ظریف آہستہ اور سنجیدہ لہجے میں پڑھنے لگتا ہے۔

"عمر اڑتیس سال۔ طوفان کی حالت میں جہاز سے کود کر ایک لڑکی کی جان بچائی"۔

ہر طرف خوف ناک خاموشی چھا گئی۔ اور بلال نے دیکھا کہ ہر ایک کے تیور بدل گئے

---

[1] اخراج سے مراد اخراج عزازیل از بہشت ہے۔

ہیں۔ دوستانہ نظروں سے دیکھنے کے بجائے اب وہ اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اب اس کو یقین ہو گیا کہ آتش سیال کا لطف تمباکو کی خوشگوار بو، قمار بازی کا دلچسپ مشغلہ اس کے لئے نہیں۔

"بلال کیا یہ صحیح ہے"؟ غصہ سے عزازیل نے کہا۔ بلال نے جھوٹ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے حلق میں چسپیدہ ہو گئے۔

"بلال تو بڑا بد معاش ہے" عزازیل گرجنے لگا۔

"بدنصیب میرے سامنے سے نکل جا تو اس مقام کے شایان نہیں"

بلال کو دھکا محسوس ہوا۔ اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ڈر رہا تھا کہ اب کیا بلا نازل ہوا چاہتی ہے لیکن آخر کار جب اس نے آنکھیں کھولیں، تو کیا آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ اُس نے کیا دیکھا؟

اس نے دیکھا کہ ایک عالیشان مرمریں شہر ہے مکانات کی چھتیں سونے کی اور دیواریں چاندی کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر طرف خوبصورت فرشتے سفید لباس میں اپنے بازوؤں کو پھڑپھڑاتے ادھر سے اُدھر آتے جاتے تھے۔ دریا میں پانی کے بجائے دودھ اور شہد خالص دوڑ رہے تھے پرندوں کی آوازیں کیا تھیں بہترین موسیقی کا ارغنون تھا جس سے سلام علیکم طبتم فادخلوہا خالدین" ترانے مدھم سروں میں سنائی دیتے دکھائی دیتے تھے۔

بلال ششدر کھڑا دیکھ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے، اتنے میں ایک حسین ترین فرشتہ اس کی طرف خرامان خرامان نازل ہوا۔ اور حلہ بہشتی اس کو دیا۔ اب بلال کو معلوم ہوا کہ وہ کہاں ہے۔

"بلال" اس حسن کے فرشتے نے کہا "بہشت میں تمہارا آنا مبارک ہو"

بلال نے غور کیا تو دیکھا ہے کہ یہ حسین فرشتہ وہی لڑکی ہے جس کی جان اس نے سمندر میں بچائی تھی۔ اب وہ پورا بیوقوف تھا۔

علاوہ اُس وقت کے تاریخی ماحول کا اندازہ بھی لگ جاتا ہے۔

رہبرِ راہ دین ملک صاحب — از جہان شد چو عازمِ رحلت
سال فوتش رقم نمود سخن — نور افزائے گلشن جنت
۱۲۰۸ھ

(۲)

پئے سیر محمد برکت اسد — مُہیّا مسکن فردوس بادا
خرد فرمود تاریخ وفاتش — نصیبش گلشن فردوس بادا
۱۲۱۰ھ

(۳)

ہمچوں مرداں چو میر جانِ ایں — فرس خویش زین کلا بہ جہاند
سال فوتش رقم نمود خرد — وائے آں فاضل زمانہ نماند
۱۲۲۰ھ

(۴)

تا محمد رضا۔ براہ رضا — یا بقیشہ درشہ وفات گزین
گفت تاریخ رحلتش ہاتف — نازل مسکن بہشتِ برین
۱۲۲۷

(۵)

رفیع الدین قطب الدیں ز عالم — سفر کردند با چند نیک نامی
پئے تاریخ آں ہر دو مقدس — خرد فرمود شیمتین گرامی
۱۲۳۱ھ

(۶)

شد چو از دنیائے دوں رحلت گزین — مسکن سید محمد خلد شد
گفت رضوانِ جناں سالش چنیں — مامنِ سید محمد خلد شد
۱۲۳۵ھ

(۷)

زہے سعادت عبد الکریم مولانا — کہ نقد زندگیش صرف راہ سرور شد
سروش از پئے سالِ شہادتش فرمود — بیوم ماہ محرم شہید اکبر شد
۱۲۳۸ھ

(۸)

ہر گاہ بہ سجدہ آں عبادت آئیں — بسپرد بحق متاع جانِ شیریں
جاں رزتن چو رفت سالش برچیں — آسودہ بہ خلد مولوی قمر الدین

تذکرہ شعرا نقش (قلمی) میں ان کا حال اس طرح لکھا ہے:۔

سخن تخلص شاعر عالی مقام میر غلام مصطفیٰ نام مشورۂ سخن با کچھی نارائن تخلص صاحب می کرد و جشن برجادۂ استقامت روان، کلاش اور لب دیا بس برکراں، وصفش مرغوب و پسندیدہ، طرزش دل کش و پسندیدہ۔ از اشعار آبدار ایشان است (انتخاب) ؎

نہ ایسا بے خود و بے ہوش دیوانہ سمجھ مجھکو — بکار خویشتن ہشیار و مستانہ سمجھ مجھ کو

یاقوت سے مرجان بھی گو سرخ زیادہ ہے — پر لعل لب جانان دو سرخ زیادہ ہے

اشک سے چشم تر نہیں جلتے — گرم پانی سے گھر نہیں جلتے

حضرت آصف جاہ ثانی (جلوس ۱۱۷۵ھ۔ وفات ۱۲۱۱ھ) سے ان کی شاعری کا دور شروع ہوتا ہے اور حضرت آصف جاہ رابع (جلوس ۱۲۴۴ھ۔ وفات ۱۲۷۳ھ) کے عہد تک ان کی عمر (۹۹) سال ہوتی ہے جو زیادہ تر ین قیاس ہو کر اوسط حیات کا تقریباً صحیح پتہ دیتی ہے۔ حضرت آصف جاہ ثانی کا دربار درباریں ملکی نظم و نسق کے اعتبار سے "شعر و شاعری" کی طاق نسیان کے لئے "آگرہ" کا سا میدان نہ تھا پھر بھی کچھ اورنگ آباد کے اور کچھ باہر کے شعرا، بادشاہ اور وزیر (ارسطو جاہ) کے قدر سخن کی بدولت یہاں جمع ہو گئے، دہلی کی اینٹ سے اینٹ بج جانے کے بعد لکھنؤ اور حیدرآباد ہی علم و فن اور دولت و حکومت کے مرکز تھے، اور جب لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کا آخری زمانہ شروع ہونے لگا تو پھر حیدرآباد ہی امن و اطمینان نظر آیا حضرت آصف جاہ ثالث (جلوس ۱۲۱۸ھ۔ وفات ۱۲۴۴ھ) کا عہد حکومت مہاراجہ چندو لال شاداں وفات ۱۲۵۶ھ کی وزارت اور اس کے ساتھ قدردان سخن سونے پر سہاگہ تھی سخن بھی اورنگ آباد سے آصفی برکات کے فیوضات حاصل کرنے کے لئے آ گئے ہونگے یہاں آتے ہی آصف جاہ ثانی کے شہزادوں عالی جاہ، فریدون جاہ کیوان جاہ کا تقرب میسر ہوا۔ ارسطو جاہ (وزارت ۱۱۹۵ھ۔ وفات ۱۲۱۹ھ) میر عالم (وزارت ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۲۳ھ) منیر الملک (وزارت ۱۲۲۴ھ۔ وفات ۱۲۴۴ھ) اور چندو لال زرار کے دربار میں ارباب ہوئے، امرا کے پاس رسائی نصیب ہوئی۔ ایک قصیدہ میں اضافۂ معاش کی [illegible] کی ہے ؎

کر عرض حال اپنا یہاں سے [illegible]

شش سال سے زیادہ گزرے کہ آجتک ہوں — محوِ دعائے دولت روزانہ اور شبانہ
اس چشم پر کہ چشم ہم چشم ہیں یہ عزت — رہیے کرم سے تیرے محفوظ جاودانہ
سو اس معاش پر تو ہے ممتنع کہ حضرت — داخل کم اور افزوں ہے خرچ ماہیانہ
ہو جائے اب اضافہ ایسا کہ حسب خاطر — دل سے ادا کروں تا اک شکر کا دوگانہ

ایک دوسرے قصیدے میں معافی اسپ کی درخواست کی ہے۔

صاحبا! بندہ پرورا! تیرا — بس کہ پروردۂ کرم ہے سخن
کہ سر مو اُٹھا نہیں سکتا — بار احسان سے سر و گردن
لیک اتنی ہی عرض ہے تجھ سے — اے کرم بخش و چارہ سازِ من!
فکر سائیس و فکر دانہ و کاہ — جاں گزا ہے زبس کہ اور جان کن
عینِ جاں بخشی و عنایت ہے — گر سخن کو معاف ہو تو سن

امرا میں دو امیروں کے نام لئے ہیں۔

شاہ دکن سے ہم کو مطلب نہیں سخن اب — ہے شاہ یار[1] ہی بس شاہ دکن ہمارا
ہائے وہ عبدالکریم[2] دہائے اکبر یار جنگ[3] — سر گیا۔ ہم سر گیا یہ بھی گیا وہ بھی گیا

پیر اشرف اور شمس الدین یہ دونوں حضرات شاید بزرگ تھے، ان کی مدح بھی کی ہے

شعرا حاضر ہے چشمک بھی تھی کہتے ہیں ؎

سخن کے شعر سن کے فضل ارباب معنی سے — خجل ہو لطف[4] نکلا اک طرف یکسو صفا[5] نکلا

ایک قطعہ بھی چشمکی ہے۔

جہلا دیکھ کر مجھے غیور — مستِ کبر و غرور کہتے ہیں
اور بے غیرتوں کو۔ یہ کج فہم — عاقل و ذی شعور کہتے ہیں
ہیں۔ انھیں کیا کہوں کہ ان کو سب — آدمیت سے دور کہتے ہیں
لطف تو یہ کہ غائبانہ نہیں — صاف ان کے حضور کہتے ہیں
ایک میں ہی تو یہ نہیں کہتا — تا اناث و ذکور کہتے ہیں
حق تو یہ ہے کہ مردم بینا — نور کو عینِ نور کہتے ہیں

---

[1] ان کے حالات کے لئے دیکھئے گلزار آصفیہ ۲۹۵۔ [2] وہی مولانا شہید ہیں جن کے حضین آپ ابھی پڑھ آئے ہیں۔ [3] گلزار آصفیہ ۲۶۱
[4] مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند اردو میں شعرا کے حالات لکھے۔ [5] سید فدا الفقار نقوی ان کا تخلص تھا۔ گلزار آصفیہ ۲۶۱

کورِ خورشید کو نہیں کہتے شبِ پرک ہی کو کور کہتے ہیں

ناقدر دانی وطن کی بھی شکایت ہے

حُبِّ وطن سے فائدہ بھی کچھ سخن! گذر کہتے ہیں قدر دانی جسے کم بہت ہے یہاں

طبیعت پر فارسی کا رنگ زیادہ غالب تھا "ریختہ گوئی" اصل جوہر نہیں، خیالات فارسی سے لینے کی کوشش کی ہے۔

بردر دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم ہمہ شوق آمدہ بودم۔ ہمہ حرمان رفتم

میں اپنی آمد و شد کی حقیقت کیا کہوں تجھ سے

ہمہ حرمان گیا تھا۔ پھر سراپا آرزو آیا

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سود؟ دل را شکستئی نہ کہ گوہر شکستئی

پھر بھی ہو سکتا نہیں محشر عشیرا ے دل شکن!

لعل دیوے تو اگر تاوان اس دل کے عوض

فارسی دیکھئے کیسی کہتے ہیں:۔

خود را بدرد عشق تو افسانہ ساختیم چون شمع سوختیم بہ پروانہ ساختیم

با این نامحرمی رسوائے عالم کرد باز این دل نمی دانم چہ با می کرد ام گر ہم رازمی کردم

آزردہ گشت بے سبب آن بے وفا چہ کرد؟ تحقیق ہم نہ کرد کہ عاشق خطا چہ کرد؟

از دیگراں چہ شکوہ؟ با این غم گسار ہم دل کرد۔ ہر چہ کرد بمن۔ دل با چہ کرد؟

دیگر از ین مپرس تو ہمسر دیدۂ سخن ما انچہ کردہ ایم با و۔ او بما چہ کرد؟

شاعری اور "ریختہ گوئی" کے متعلق کہتے ہیں:۔

مضمون کی تلاش تو بالکل ہی اٹھ گئی ٹھہری بنائے شعر فقط صاف بات پر

نادم ہے جو تو اے سخن! اب ریختہ کہہ کر کس نے تجھے بولا تھا کہ تو فکر غزل کر

سخن کی سخن سنجی کا معیار مضمون آفرینی ہے یا "صاف بات" یہ دونوں پہلو اس ایک شعر میں موجود ہیں۔ کلام کے بالاستیعاب مطالعہ سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے اقتضائے وقت کے لحاظ سے "مضمون آفرینی" کرتے تھے مگر بعد کو ماحول بدل جانے سے "صاف بات" پر اتر آتے ہیں۔ میں نے "صاف بات" زیادہ پسند کی ہے اور انتخاب کلام میں یہی سخن کی

صفائی سخن مدنظر ہے۔ اس "ریختہ گوئی" کے انکسار کے باوجود اپنی طرز سخن کی نسبت سخن سے رہا نہیں گیا ؎

سودا تو نہیں کہوں جو سودا جانو یا میر کا تم نظیر و بہتا جانو
لیکن بہ خدا سخن کو اپنے یارو شاگرد رشید میر و مرزا جانو

شیفتہ اور نگ آبادی کی معنوی شاگردی کے علاوہ میر و مرزا کی طرز پسند ہے ؎

منکر محض ہیں جو طرز سخن کے سودا ان کی خدمت میں لئے میں غزل جاوں گا

سخن شیفتہ کے شاگرد سخن کے شاگرد رضا حسین رضا، ڈاکٹر احمد حسین مائل دکنی کے والد ماجد اور مائل دکنی حیدر آباد کے مسلم الثبوت استاد۔ اب قارئین کو سخن کا کچھ اور حال معلوم ہو تو وہ لکھیں:۔ (عمر یافعی)

دیوان کی پہلی غزل

گرچہ گہر سے کیسہ معمور ہے زباں کا پر حمد حق میں کوئی مقدور ہے زباں کا
یہ وہ مقام ہے یہاں خامش رہے تو خوش تر معجز بیانیاں گو دستور ہے زباں کا
آداب لغت احمد فطرت گداز ہے بس جوں شمع آب ہونا کیا دور ہے زباں کا
رتبہ دل و زباں کا کیا پوچھتے ہو ہم سے قدرت ہے جو کہ دل کو تعذر ہے زباں کا
غیر از بیان شیریں کچھ اور ہو تو کہیئے یہ ہی تو ایک جوہر مشہور ہے زباں کا
دل کی فضیلتوں سے واقف ہیں اہل دل ہی جائے ادب ہے یہاں کا مذکور ہے زباں کا

با این ہمہ فضائل نوبت ہے یہ تو دل کی
گونگے کی طرح بالکل معذور ہے زباں کا

شبیہ شاہد دیوان سخن! دل خواہ لکھئے گا بجائے مدآبرد۔ مدبسم اللہ لکھئے گا

اس شعر پر دیوان کا صفحہ ختم دوسرے صفحے سے دوسری غزل شروع ہوتی ہے۔ کم سے کم یہاں سے ایک ورق غائب معلوم ہوتا ہے۔

دیوان کا پہلا قصیدہ

بجائے خویش ہے بشاشش ہر صغیر و کبیر خیال عام کو اپنے سمجھ خیال اسیر

کسو کو ببلِ اوّل سے دعوئے سبقت — کسو کو نشۂ رجحان بہ طوطیٔ کشمیر
کسو کو نسخ معانی بہ دلّی پر ناز — کسو کو معنیٔ صاحب مسیح کی تدبیر
کسو کو سلخ ادائے کلیم پر پندار — کسو کو نقل نظیری ہے باعث توقیر
تراش معنیٔ شوکت کسو کو ہے ملحوظ — کسو کو مصرعِ خاطر خراش جان صفیر
کسو کو طرزِ ظہوری ہے چشم استنباط — کسو کو مشغلۂ اقتباس شعر منیر
کسو کو اخذ فیضی کے شعر سے مرکوز — کسو کو مدِ نظر دردی کلام نظیر
فقط انھیں پہ نہیں اکتفا چراتے ہیں — ..... [1] .....
غرض بایں ہمہ گر آوری ہیں بے مایہ — غنی اگرچہ .....
ستم تو یہ ہے بایں گدائی مضموں — ہنوز بوئے شہی ہے دماغ میں جاگیر
بجائے خویش ہیں گل چینِ عقل پر مجھ سے — جو پوچھیے تو یہ کنّاش [2] ہیں نجاست گیر
بزعم عطر کشِ غنچۂ معانی ہیں — نہیں مشام سے نکلی اگرچہ بوئے سیر
ہوئے معلم ملکوت یہ جہاں ان کے — تلامذے میں ہوئے چند طفل ذی و پیر [3]
منِ خرفات سوا اپنے اور اہل سخن — پسند ہی نہیں ان کے کسو کا شعر شعیر
کبھو نہوں متکلم کسو سے جز ایما — کریں بقاعدہ کم صلا ہیم تقریر
غرض یہ تعمیہ گوئی ہے عرض جوہر ہے — سوائے اس کے نہ ہو کوئی استفادہ پذیر
سوا تغافل و اغماض کے سرِ محفل — کریں کسو کی نہ تعظیم و کید گر توقیر
حقیقتہً تو یہ کرباس باف ہیں یکسر — ہے تس پہ دعوئے بافندگی خز و حریر
کہیں عزیز ہو جو طبع زاد ہے ان کی — تو پھر وہ یوسف و یعقوب پر و فا تخمیر
نظر کریں نہ ادا پر خطا کو صاف کہیں — رہیں کہ ہیں یہ ہنر منکر اور عیب پذیر
خیال معنیٔ بیگانہ پھر کسو کا ہو — ملاحظہ نہ کریں یہ سگان آہو گیر
..... — دوبارا تا نہ سنیں اور کریں نہ خوض پھر
..... — تلامذے سے پڑھے شعر لوچ دبتے تاثیر

---

[1] اصل دیوان میں یہاں کچھ اوراق کے کونے ترشے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے مصرعوں کے مصرعے کام آ گئے ہیں اور ہر جگہ نقطوں کی جگہ مصرعے ترشے جانے سے ہے۔ [2] کنّاش روپ۔ [3] پیر کی رو۔

..... بصدائے بلند فرماوین — زہے تلاش زہے معنی و زہے تعبیر
بزنگ نقش قدم در پئے شکست ہم — بسان جادۂ بے قطع یکدگر ہیں دلیر
سخن بخموشی تظلم سے داد خواہ نہ ہو — سوائے شاہ عدالت پناہ عرش سریر
زہے جناب کہ دیوان عدل میں جس کے — ہے ذرہ ذرہ بھی مہر منیر۔ مہر منیر
علیم علم لدنی۔ علی عالی قدر — وصی احمد مرسل سمیع حی قدیر
علی نبی ہے۔ نبی ہے علی یقین یہ ہے — علی کی ذات شکر ہے اگر نبی ہے شیر
عدیل ہم جو یہ خود ہوں تو ہوں سوا اس کے — نہ ہے عدیل علی کا نہ ہے نبی کا نظیر
زہے سعادت اگر نعت و منقبت میں ہو — باعتقاد صفا مطلع دوم تحریر

علی علیم و سلیم و نبی قدیم و قدیر
علی جمیل و جلیل و نبی سمیع و بصیر

علی کریم و شجیع و نبی خلیق و شفیق — علی امیر۔ نبی ہے امیر کل امیر
علی ہے حاشیہ و ہے نبی بجائے متن — علی ہے "باب" منطا اور نبی "مدینہ" نظیر
علی ہے حاضر و ناظر۔ نبی علیم و کلیم — علی ہے قایم و دایم۔ نبی بشیر و نذیر
علی امام ہما اور نبی ذوالاکرام — علی .....
علی ابوالحسن و ہے نبی ابوالقاسم — علی عجیب و .....
علی ہے ہم سر ہارون نبی کلیم اللہ — علی وزیر۔ نبی پادشاہ عرش سریر
علی ہے ماحی کفر و نبی ہے حامی دیں — علی ہے غافر جرم اور نبی ہے عذر پذیر
علی ہے روح مجسم نبی ہے جان روح — علی ہے ترجمہ۔ ذات نبی کلام قدیر
علی ہے درّ یتیم۔ اور نبی ہے دُرِّ یتیم — علی ہے بدر منیر۔ اور نبی ہے مہر منیر
علی ہے جوہر ذات نبی حسام اللہ — علی ہے بُرّشِ شمشیر۔ اور نبی شمشیر
علی مُعین ازل۔ اور نبی مُمِدّ ابد — علی ہے اولِ اول۔ نبی اخیر اخیر
علی تمام نیاز۔ اور نبی سراپا ناز — علی خمیر و فا۔ اور نبی صفا تکمیر
علی کشندۂ کفّار۔ اور نبی رہبر — علی جوان (و) جوان مرد اور نبی ہے پیر

نبی ہے مصدر لطف اور نبی ہے مہبط [illegible]

علی و محمد و اولاد علی و اولاد محمد — علی نبی نبی علی

علی ہے نکہت گل۔ اور نبی ہے دستۂ گل — علی ہے نور سراج۔ اور نبی سراج منیر
ولا خموش! کہ طول سخن ہے ترک ادب — علی نبی سے کرا اظہار مدعائے ضمیر
..... — گناہ عفو مرے از صغیر (و) تا بہ کبیر
..... — بروز مرگ نجات اور بروز نشر ظہیر[1]
سوائے اس کے مُلقب بنامۂ "غفران" — رہے یہ نظم مرا پایہ دار و عالگیر
سخن! شتاب کہ ہے وقت خاص ہر دعا — کشادہ ہے درِ اقبال و منتظر تاثیر
سپہر۔ تا مہ و انجم سے ہے بزینت ذریب — زمین۔ تا کہ بہر دم ہے انتظام پذیر
رجوع۔ تا کہ یہ آہن ربا ہے آہن کو — چراغ کار ہے پروانہ جب تلک تسخیر
چکور۔ چاند پہ تا غش ہے اور گل خورشید — پھرا کرے بہوس سوئے آفتاب دلیر
کلاہ فرقِ محب، پر تو ہلال عید — اتا قۂ سرِ حاسد ہو سایۂ شمشیر

غزلیات

دلا! امید وفا یہ اس سے کہہ کے کب تک ملا کرے گا — کسو سے اس نے وفا کیا ہے؟ کہ تجھ سے ناداں! وفا کریگا
شروعِ الفت تجھے نہ اے دل! جتا دیا تھا کہ اس سے تا کل — مگر نہ ہوگا نباہ مشکل، جو دل لبھا کر[2] ادا کرے گا
خدا ہی پر ہے کہ اب شفا ہو تپِ محبت جو یہ بلا ہو — طبیب عاجز ہو تو کیا ہو، غریب کب تک دوا کریگا
ہمیں تم اپنا جو کر رکھو گے کرم کی ہم پر نظر رکھو گے — بھلے برے کی خبر رکھو گے، خدا نمہارا بھلا کریگا
اگر ہم ایسے ستم سہیں گے تو لوگ کہیے کہ کیا کہیں گے؟ — یہی رہے گا کہ ہم نہ ہیں گے رقیب یہ کیں تو کیا کریگا
سخن! اگرچہ افادہ ہوگا حصول؟ کا ارادہ ہوگا — یہ درد سر بھی زیادہ ہوگا جو سر پہ سایہ ہما کریگا

استاد نے جس دم نقطۂ نقطہ دبرِ وفا کرار کیا — دیوانہ کیا صد عاقل کو مدہوشوں کو ہشیار کیا
صورت گر نے طرح کیا جب صورت اپنی صورت پر — اعجاز مسیحی لب کو بخشا آنکھوں کو بیمار کیا
عشاق کیا عشاقوں کا، مشتاق کیا مشتاقوں کا — محبوب کیا محبوبوں کا دلدار کیا دلداروں کا
مغدور رہیں اب رکھئے گا آجائے جو منہ پر ترا زور دل — اک جام پلا کر ساقی نے سرشار مئے اسرار کیا

اسرار حقیقت ہستی میں بے خواست زباں پہ جب گذرا
اکثر نے کیا انکار سخن۔ اور بعضوں نے اقرار کیا

---

[1] نقل ہے؟ — [2] انکار۔

نہ ڈریئے یار سے، جتنا بد آموزدوں سے ڈریئے گا — لگا دیں آگ شاید آتش افروزدوں سے ڈریئے گا
لگا دیں آپ ہی اور آپ ہی دوڑیں بجھانے کو — خدا محفوظ رکھے۔ ایسے دل سوزوں سے ڈریئے گا
فزوں ہے زخم سوزاں سے اذیت زخم پیکاں کی — نہ ڈریئے زخم دوزوں سے جگر دوزوں سے ڈریئے گا

سخن! ایام ہجراں ہیں کہ ایام مصیبت ہیں
غرض یہ ہے کہ تا مقدور ان روزوں سے ڈریئے گا

خال۔ اُس سُرخ گال میں کالا — مثل لالہ ہے۔ لال میں کالا
ہاتھ آ ہی گیا تھا۔ اُلجھی زلف — بچ گیا۔ بال بال میں کالا
رنگ۔ اس دل جلے کا مت پوچھو — ہو گیا۔ حال حال میں کالا
خال۔ رُخ پر جو وہ بتاتا ہے — کچھ تو ہے۔ آج دال میں کالا

یا یہ اسبند کا دھواں ہے سخن؟
بال ہے یا یہ خال میں کالا

کچھ سبب اجتناب کا نہ کھُلا؟ — راز خشم و عتاب کا نہ کھُلا؟
کس کی زلفوں نے دل کو پنجہ دیا — پنجہ اس پنجہ و تاب کا نہ کھُلا؟
مبتلائے محاسبہ تو ہوئے — پر خلاصہ حساب کا نہ کھُلا؟
آہ! ما فی الضمیر آج تلک — دلِ خانہ خراب کا نہ کھُلا؟

فائدہ کیا مطالعہ سے سخن؟
جب کہ مطلب کتاب کا نہ کھُلا؟

ساتھ۔ کیا پیرہن نہیں دیتا — جانِ من! تن بھی تن نہیں دیتا
کس قدر بدگمان ہے گل رو — حکمِ سیر چمن نہیں دیتا
دلِ خانہ خراب چین سے مجھے — ایک دم جانِ من نہیں دیتا
زندگی کس طرح بسر کیجئے؟ — اہمن چرخِ کہن نہیں دیتا

آہ! ظالم ہیں کس قدر یہ لوگ
کوئی داد سخن نہیں دیتا

انتخاب اشعار

آہ! کچھ لطف ملاقات کا پایا نہ گیا
ہم کچھ ایسے ہوئے بے خود بخود آیا نہ گیا

یہ تو پھر زخم جگر ہے نہ سیا جاوے گا
اک گریباں ہی جب تم سے سلایا نہ گیا

ہم نے اگرچہ چھوڑا ملنا پریوشوں کا
پر بدظنی نے تیری اے بدگمان! مارا

پاس نبدگ جس کو مد نظر نہ ہووے
وہ بے ادب الٰہی! جاوے جہان مارا

آخر سراغ اس کا دل ہی میں اپنے پایا
جس کے لئے سخن نے عالم کو چھان مارا

خانہ خرابیاں ہوئیں جتنی کہ آجتک
آنکھوں ہی نے کیا دل مضطر نے کیا کیا؟

حاسد کے شعر خوب کو بدکس طرح کہیں
کد ہے شکر فروش سے شکر نے کیا کیا

جس جا ہوا کو دخل نہ تھا نامہ لے گیا
اے آفریں کام کبوتر نے کیا کیا

ہوئے ہیں ان بتوں سے تنگ ہم اتنے کہ اب باقی
قسم کھاتا رہا ہے سو قسم کھایا نہیں جاتا

تصور میں ترے جو شخص اپنے روبرو آیا
تکلف برطرف ہم نے یہی جانا کہ تو آیا

گذرتی ہے اسی ہی کش مکش میں عمر عاشق کی
کبھو باہر ہوا اپنے سے۔ اپنے میں کبھو آیا

حواس و ہوش اس کو دیکھتے ہی اڑ گئے سب کے
کچھ ایسی وضع سے محفل میں شب وہ تند خو آیا

میل و نیداری اگرچہ نقش خاطر ہی رہا
پر یہ نفس بے حیا کافر کا کافر ہی رہا

ایک دن بھی ملتفت پایا نہ اس بے رحم کو
گرچہ میں آٹھوں پہر خدمت میں حاضر ہی رہا

کچھ رحم تجھے اے ستم ایجاد نہ آیا
ایسا تجھے بھولا کہ میں پھر یاد نہ آیا

ایسا ہی فراموش کیا میں نے خودی کو
پھر آپ ہی اپنے تئیں میں یاد نہ آیا

الجھا ایسا گیا ہے دل کہ سلجھایا نہیں جاتا
رہائی کا تجھے اسلوب کچھ پایا نہیں جاتا

سو طرح کی آفتیں اب عشق میں ہووین تو ہوں
جان ہی سے اپنی جب گزرے تو پھر وٹ ہے کیا؟

اپنی "ہست و نیست" کا کریے بیان کیونکر سخن!
ہم نہیں واقف کہ جینا کیا ہے اور مرنا ہے کیا

برگ گل رنگ پکڑتا تیرا زبان ہو جاتا
غنچہ تک تنگ جو ہوتا تو دہان ہو جاتا

کش مکش سے دم آخر کی سخن! چھٹ جاتے
یہ دم سرد اگر صرف فغان ہو جاتا

ہے زلیخا نے یہ کیا کام کیا کچھ نہ کیا
یوسف مصر کو بدنام کیا کچھ نہ کیا

امید وصل یار کیا ہم نے کیا کیا ؟ بے وعدہ انتظار کیا ہم نے کیا کیا ؟
اُف رے پندار و بات بھی نہ کیا ؟ اس طرف التفات بھی نہ کیا ؟
سنتے ہی ہو گئے صفات پہ غش ہم نے تحقیق ذات بھی نہ کیا ؟

سنا ہے جن دنوں حسن اُس بت زہرہ جبین پہ تھا قدم فرش زمین پر تھا تو سر عرش بریں پر تھا
غضب ہونا تھا رہے سبب جو ہم نشین پر تھا غرض ہم بھی سمجھتے ہیں کہ وہ غصہ ہمیں پر تھا

کھلتی نہیں ہے آنکھ جو اس غنچہ چشم کی ہے کچھ نہ کچھ تو دیدۂ بادام میں گرا
تھا جس قدر گھمنڈ وہ خود بین کو اے ابر ویسا نظر سے ایک ہی الزام میں گرا

تماشائی ہوئے غش دیکھ کر شکل و شمائل کو بلائے جان عالم تھا اٹھانا اسکی گھونگھٹ کا
دل گیا۔ دلبر گیا۔ یہ بھی گیا۔ وہ بھی گیا گھر گیا۔ باہر گیا۔ یہ بھی گیا وہ بھی گیا

مادری مہر و محبت کو نظر میں نہ رکھا چشم نے اپنے جگر گوشہ کو گھر میں نہ رکھا
آسمان ٹوٹ پڑا دل جو قضا را ٹوٹا اشک خون چشم سے ٹپکا نہیں تارا ٹوٹا

دو منع دستار نے کیا پیدا لطف۔ گفتار نے کیا پیدا
اشک۔ لخت جگر کے ساتھ ہوئے فوج۔ سردار نے کیا پیدا
دل گم گشتہ کو سخن اپنے آخر عیار نے کیا پیدا

کہاں کا نامہ۔ پیغام زبانی بھی نہیں سنتا وہ دکھ سنتا ہے کس کا جو کہانی بھی نہیں سنتا
وہ کب سنتا ہے فریاد و فغان ان بے قراروں کی فغان کے نام سے شعر فغانی بھی نہیں سنتا

تک چشمۂ چشم اپنا ابل جائے تو اچھا رونے کی ہوس جی سے نکل جائے تو اچھا
عشاق کی کثرت سے وہ کچھ تنگ ہے اتنا جوبن ہی کو کہتا ہے کہ ڈھل جائے تو اچھا"

کسو نے روم لیا اور کسو نے شام لیا ہمیں نے کچھ نہ لیا اور نہ سب نے کام لیا
قیس سے کم ہوں کہ میں لیلیٰ سے ٹل جاؤں گا ؟ بے ستوں ہوں کہ جو فرہاد سے ہل جاؤں گا

تنقیدیں

بقائے دوام | مولفہ مولوی ایم۔ ایم اسلم صاحب۔ قیمت عہ مجلہ عہ ملنے کا پتہ نسیم بکڈپو بارود خانہ لاہور یہ مختصر کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بقائے دوام یا دوسرے الفاظ میں حیات بعد الممات کے موضوع پر لکھی گئی ہے آج کل یورپ اور امریکہ کے علمی اداروں میں اس موضوع پر بے حد تحقیق کی جارہی ہے نہ صرف نظری بلکہ عملی نقطۂ نظر سے بھی، یوں تو اس میدان میں اکثر و بیشتر علما اپنی جولانیاں دکھلا رہے ہیں لیکن سر اولیور لاج کو جو طرۂ امتیاز حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں بلکہ بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے وہ اس علمی تحقیق کے علمبردار ہیں۔

اس کتاب کی تالیف میں قابل مولف نے اس برگزیدہ ہستی کے خیالات سے بہت مدد لی ہے، اسکے علاوہ اور دیگر محققین کے خیالات بھی جمع کئے گئے ہیں، یہ کتاب انہیں مغربی خیالات کا مجموعہ ہے جن کو اسلم صاحب نے عام فہم اور سلیس اردو میں عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اسکا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مغربی خیالات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔

کتاب کے پڑھنے کے بعد جب ہم مغربی علما کے ان نتائج کا جو عملی طور پر حاصل کئے گئے ہیں مشرقی علماء کے نظریات (متعلق بہ بقائے دوام) سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ چیز بالکل وہی ہے مگر انداز بیان جدا۔ مشرقی علما میں مولانا روم اور بوعلی سینا کی وہ مہتم بالشان شخصیتیں ہیں جنہوں نے روح کے اسرار معلوم کرنے میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وقف کر دیا تھا اور اسی سلسلہ میں وہ جن نتائج پر پہنچے ہیں اٹل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں سچ پوچھو تو مغرب انہیں قوانین کو تجربہ کی کسوٹی پر جانچ رہا ہے۔ ہماری رائے میں بہتر ہوتا اگر مغربی خیالات کے ساتھ ساتھ مشرقی خیالات کا بھی ذکر کر کے ان کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا تاکہ مشرق والوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس دوڑ میں مشرقی علما مغرب والوں سے کچھ پیچھے نہیں ہیں ہمیں امید ہے کہ اسلم صاحب آئندہ ایڈیشن میں ضرور اس کمی کو پورا کر دیں گے۔ آخر میں، ہم آپ کی اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔

اردو ادب کا پہلا رسالہ

لاہور

مخزن

اس صدی کے آغاز سے اُردو زبان کی سچی خدمت کر رہا ہے

شیخ سر عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا

کے

شاندار دور کے بعد

صرف ایک ہی شخصیت تھی جو اس رسالے کو از سر نو اس بلندی پر لے جا سکتی تھی چنانچہ دو سال سے مخزن کی ادارت مستقل

حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری

(مصنف شاہنامۂ اسلام)

نے سنبھال لی ہے۔ اور آج مخزن اُردو کے رسائل کا سرتاج بن گیا ہے۔ مخزن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بغیر امتیاز مذہب و ملت بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں مرد بے تامل اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی مخرب اخلاق مضمون نظم یا تصویر نہیں ہوتی۔ تصاویر میں بلند جذبات، نظموں اور مضمونوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ زبان نہایت آسان اور عام فہم چندہ سالانہ للعہ بذریعہ وی پی

منیجر مخزن بھاٹی گیٹ لاہور سے منگائیں

ہندوستان بھر کا واحد تعلیمی ہفت روزہ

اخبار تعلیم لاہور

یہ بات مسلّمہ ہے کہ کسی ملک کی زندگی اور موت کا انحصار محض اُس کی تعلیم پر ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک کی تعلیمی حالت نہایت گری ہوئی ہے۔ چنانچہ تعلیم سے بے اعتنائی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ملک بھر میں اخبار نہما کے اجرا سے پہلے کوئی بھی خالص تعلیمی اخبار نہ تھا۔ یہ ہفت روزہ اخبار سنہ ۱۹۲۲ء سے محض تعلیمی معاملات پر بحث اور رائے زنی کرنے اشاعت متعلیم کی تجاویز سوچنے۔ سررشتہ تعلیم کے جملہ اہلکاران اور بالخصوص کم شاہرہ مدرسین کی زبردست وکالت اور ترجمانی کرنے اور ہر قسم کے علمی عملی اور اخلاقی مضامین اور نیز تازہ بتازہ معلومات اور خبروں کے شائع کرنے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اور اس اخبار میں چار صفحات رفیق الاطفال کے نام سے علیحدہ کے علیحدہ موٹے خط سے چھوٹے بچوں کے لئے بھی چھاپے جاتے ہیں۔ جو بچوں کے ہاتھوں میں علیحدہ کے علیحدہ دے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں رفیق نسوان کے عنوان سے دو صفحے لڑکیوں اور عورتوں کیلئے ہوتے ہیں۔ الغرض یہ اخبار تعلیمی خبروں اور مضامین کی اشاعت کے علاوہ ہر قسم کی دلچسپیوں کا بےنظیر مجموعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار نہایت مقبول ہوا ہے۔ اور سرکاری اور غیر سرکاری طور پر بکثرت سکولوں میں بہم پہنچایا گیا ہے۔ چنانچہ اسوقت ہندوستان بھر کے قریباً سب اردو ہفتہ وار اخباروں سے زیادہ چھپتا ہے۔ پس ہر مدرس ہر طالبعلم اور ہر بہی خواہ ملک و قوم کو اس کا خریدار بنکر خود مستفید ہونے کے علاوہ اپنے ملک و قوم کو بھی بام عروج پر پہنچانا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب ہیں۔ اور اپنی سب خوبیوں کے باوجود قیمت سالانہ صرف دے شش ماہی ۱۴ سے ۸ اور سہ ماہی عشاری روپے لی جاتی ہے۔ نمونہ مفت ارسال ہوتا ہے۔ اس اخبار کو ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی چٹھی نمبر ۱۹۹ مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کے ذریعہ تمام مدارس تحتانیہ وسطانیہ اور فوقانیہ کے لئے منظور کیا ہوا ہے۔ اور اسے اکثر مہتمم صاحبان تعلیمات اور صدر مدرسین صاحبان سرکاری روپیہ سے اپنے اپنے مدارس کے لئے خرید رہے ہیں۔

المشتہر منیجر اخبار تعلیم۔ لاہور۔ موہنی روڈ

رسالہ "بہارستان" کا دورِ جدید

زیرِ ادارت

(جناب اختر شیرانی)

جیسا کہ ناظرین کو علم ہے ملک کا مشہور اور گراں پایہ ادبی صحیفہ "**بہارستان**" جناب اختر شیرانی کے قطع تعلق کے بعد، نئے، مالک و مدیر کی ناتجربہ کاری یا کسی اور وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ ہم اہلِ ذوق کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ احباب کے پیہم اصرار پر، اختر صاحب نے اس کی ادارت از سرِ نو قبول فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک گرم جماعت انتظامیہ قائم ہو گئی ہے۔ جسکے حسنِ اہتمام کے ماتحت "**بہارستان**" عنقریب اپنی رنگارنگ ادبی، علمی، اور سیاسی، دلاویزیوں، اور جدت طرازیوں کے ساتھ، نہایت شان سے شائع ہونا شروع ہو گا۔ اب کے پرچے کو شاندار اور باوقار بنانے کے لئے ایسی اہم، اور دلچسپ تجاویز، سوچی گئی ہیں کہ آپ بے اختیار، داد دینے پر مجبور ہونگے۔ حجم تقریباً تمام رسائل سے زیادہ ہو گا کتابت و طباعت کی نفاست کا خاص انتظام کیا جا رہا ہے۔ کامل طور پر امید کیجاتی ہے کہ اردو صحافت میں "**بہارستان**" حقیقتاً، اپنے رنگ کا اولین ادبی کارنامہ ہو گا۔ فی الحال ہم صرف مستقل خریداروں کے نام درج رجسٹر کر رہے ہیں، اس لئے آپ کو بھی اپنی خریداری ہی کی فرمائش بھجوانی چاہئے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ پرچے کا نمونہ دیکھنے کی آپ کو مطلقاً ضرورت نہ ہو گی۔ تمام خط و کتابت اور ترسیلِ زر "منیجر رسالہ "**بہارستان**" ۔ ۱۸ ۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور" کے نام ہونی چاہئے

المعلن

آغا سید مصطفےٰ حسین بی۔ اے ۔ نجم الدین عزیز ام۔ ایس سی (آنرز)

منظور حسن ام۔ اے ۔ (علیگ) ۔ بنارسی داس بی۔ اے ۔ (آنرز)

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر استعمال کرکے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھاتا ہے اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار پیچش۔ قبض۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر خارش۔ سانپ۔ بچھو کے زہر اور ہر قسم کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ر نمبر (۳) ۴ر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

خط اور تار کا پتہ — "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد علیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اسکو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے ویزہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار وقت مقام مالوف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور مشاکرین جو امتحاناً بغرض امتحان دوا طلب فرمادیں بخوشی تعمیل کی جائیگی نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں

المشتہر حسین اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن سوڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

مطبوعات مکتبہ

دکن میں اُردو مولفہ مولوی محمد عبدالحق صاحب مشی فاضل جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی و آصف جاہی دور ان میں اُردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اُردو کا تذکرہ مع نمونہ کلام ضخامت ۲۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت عہ

چیابان اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب، جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا کتابت جلد عمدہ قیمت عہ

روح تنقید مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری نور ایم اے، فن تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۵۰ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا کتابت چھپائی عمدہ قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ نور صاحب یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا کتابت چھپائی عمدہ جلد سادہ قیمت عہ

اُردو کے اسالیب بیان مصنفہ نور صاحب یہ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت، ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ، خاص طرز تحریر کے اُردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کتابت چھپائی عمدہ قیمت جلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ نور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ چکنا کتابت چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا کے افسانہ مصنفہ مولوی محمد مجاہد الاسلام صدیقی ایم اے ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات پر اُردو زبان میں اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۱۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کتابت چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی آنریری اسسٹنٹ پروفیسر آف فلاسفی کالج حیدرآباد و صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ ایم اے پی ایچ ڈی کی پروفیسر آف فلاسفی کا مختصر اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کتابت چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

ارباب نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب فاروقی ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ فتح ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کتابت چھپائی عمدہ قیمت عہ

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس العلماء جناب مکیم سید شمس اللہ قادری ایم اے ایل ایل ڈی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مستند تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا۔ کتابت چھپائی قیمت عہ

جواہر کلیات نظیر مرتبہ جناب مولانا ذہین و سید ضمیر احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی، ادبی، نصیحت آموز، ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا کتابت چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور ملخص و اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا کتابت چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شمار احمد شمار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ کتابت چھپائی عمدہ قیمت جلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ کتابت چھپائی قیمت ۵ر

تحریک اخلاق مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن نفیس قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے ہر خوشوہر کو شیک کرسکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمہ مالگزاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلہ

مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ بزخریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶ پائی

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس عنایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان سرکار آصفیہ
(۶۵)
جلد (۳)

مجلۂ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان سرکار انگلشیہ
(.....)
شمارہ (۲ و ۳)

بابتہ ماہ تیر و امرداد ۱۳۳۸ف م مئی و جون ۱۹۲۹ء

تصاویر

(۱) جدید کتب خانہ آصفیہ (۲) کتب خانہ قصر فلک نما

فہرست

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	مدیر	(۲)
علم صحت	جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی۔اے	(۵)
دعائے نوید (نظم)	" شیخ تہنیت علی خاں صاحب نوید	(۱۹)
غزل	" حکیم قاسم علی بیگ صاحب اخگر	(۲۰)
وکیل بالجبر	" سید وزیر حسن صاحب	(۲۱)
غزل	" سید ابراہیم صاحب خلیل	(۲۵)
تخیلات عفو (غزل)	" سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم	(۲۶)
کوہستانی دوشیزہ	" سید علی صاحب	(۲۷)
مولانا حافظ شجاع الدین رح	" میر مظہر علی صاحب سلوی کامل وکیل	(۲۸)
خیالات لطیف	" یس۔بی۔انتا صاحب	(۳۷)
بادۂ دکن (سخن)	" عمر یا فعی صاحب	(۳۸)
میر عالم کی شاعری	" سراج الدین صاحب طالب	(۴۱)
کھچڑ (افسانہ)	" غلام رسول صاحب سی کالج	(۴۹)
رنگ تغزل (غزل)	" سید عابد علی صاحب عابد بی۔اے۔ال ال بی وکیل گجرات	(۵۸)
قرض خواہ (افسانہ)	" محشر عابدی صاحب	(۵۹)
جوانی (غزل)	" سید قادر حسین صاحب قادر	(۶۴)
یورپ کی موجودہ ترقی میں مسلمانوں کا حصہ	" خواجہ ظہور الدین صاحب سکندرآباد	(۶۵)
کلام اعظم (غزل)	" ڈاکٹر اعظم کریوی صاحب	(۷۲)
پردہ	" آبرو بیگم صاحبہ سکریٹری لیڈیز کلب بھوپال	(۷۳)
غزل	" مودود احمد صاحب نشتہ	(۸۶)
ترجمہ گلدستہ بیجاپور	" ع۔ی	(۸۷)
تنقیدین		س۔م و س (۹۳)
اشتہارات		(۹۹)

شذرات

افغانستان کی گذشتہ چند ماہ کی کشمکش کا ایک حد تک نتیجہ برآمد ہو گیا۔ لیکن جس صورت میں وہ دنیا کے سامنے پیش ہوا، وہ ظاہر ہے کہ افسوس ناک ہے۔ افغانستان کے اس تصفیہ سے بحالت ہو جو وہ جس قدر نقصان افغانی مفاد کو پہنچ سکتا ہے، وہ ایک دھندلے خاکے کی صورت میں پیش ہو رہا ہے۔ لیکن اس ہنگامہ خیزی سے مشرقی آزادی کو جو ٹھیس لگے گی وہ بہت زیادہ خطرناک ہوگی۔ خدا نہ کرے افغان قوم اغیار کی کاربراری کا نتیجہ بنکر بھیڑ، اور یہ خمول میں گم ہو جائے۔ افغانیوں کی یہ حریت پسندی اور آزاد روی یقیناً قابل ستائش ہے کہ اس نے اپنی طبیعت کے خلاف اپنے بادشاہ کی بھی چلنے نہیں دی۔ کاش وہ اسی جوش کے ساتھ کسی مفید مرکز پر بھی جمنے کے قابل ہو جائے۔ وہ واقعات بھی ظاہر ہو جائیں گے جو اس تمام ہنگامہ آرائی کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ شاہ امان اللہ کو اپنے ملک کے جانے کا غم ہو، لیکن صاحب دنیا کو اس کے ملک سے جانے کا ہے۔ اگر انجام بد یہو ——— جس کے آثار نظر آ رہے ہیں ——— تو ساری افغان قوم اس کی ذمہ دار ہے۔

ہندوستان کے دور جدید میں جہاں یورپ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہاں کچھ قومیت کا بھی احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ اور اسی لئے بعض قدیم ہندی قومی اداروں کی تجدید اور احیا کی طرف بھی توجہ منعطف ہونے لگی ہے۔ موسیقی جو کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے پاس گویوں کا پیشہ سمجھی جاتی تھی، اب ایک علمی امتیاز حاصل کرنے کو ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ خبر خوش آئند ہے کہ مدراس میں ایک شہر میں "انامالی موسیقی کالج" قائم ہوا تھا جو یہ راجہ سر انامالی چیٹی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ ابھی ابھی اس ادارہ کو جامعہ موسیقی کے درجہ تک ترقی دی گئی ہے۔ اس کے نائب امیر جامعہ کیا کونم کالج کے پرنسپل مسٹر ایس۔ ڈی۔ اگناڈیسن مقرر ہوئے ہیں۔ دو طرح کے نصاب ہیں۔ ایک سندی، دوسرے مہارتی۔ اس کام میں جس قدر مصارف ہوں گے اس کا بڑا حصہ خود سر انامالی چیٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

انسانیت کا مقصد مال و دولت بذات خود نہیں۔ بلکہ وہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ وہ لوگ جو روپیہ کو صرف روپیہ کی خاطر فراہم کرتے ہیں، درحقیقت ایک طرح کے دماغی مرض میں مبتلا ہیں۔ اسی قسم کے روپیہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ "بڑے نہادان چہ سنگ و چہ زر ہمارے یاس" اس قسم کے مریض صدہا ملینگے۔ جو دوسری صنف میں داخل ہیں یا اُن سے بھی زیادہ خردماغ وہ ہیں جو روپیہ جیسی قیمتی شئے کو سستے معاوضہ پر بے دریغ صرف کر بیٹھتے ہیں۔ روشن دماغ جس طرح روپیہ کو کمانے کے بہترین طریقے جانتے ہیں، وہیں اس کے مصرف سے بھی ناواقف نہیں رہتے۔ اگر کے سینٹ جارج

کالج کے ایک سابق صدر مسٹر کیانن آئے، ڈیوس جو بڑے جاگیردار تھے اور نہ راجہ یا نواب۔ اپنی محنت سے کمائے ہوئے روپیہ کا کس قدر عمدہ مصرف نکالتے ہیں اپنی خدمت سے سبکدوش ہوکر انگلستان جاتے ہوئے انہوں نے آگرہ کے مشن ہسپتال کے لئے تین ہزار پونڈ (تقریباً پینتالیس ہزار روپیہ) اس قدر خاموشی کے ساتھ عطا کئے کہ عرصہ تک کارکنوں کو معطی کا نام ہی معلوم نہ تھا۔

علامہ ابن خلدون کی تصنیف کو لکھے ہوئے اب کوئی ہزار سال ہوتے ہیں لیکن حال میں ایک جرمن مستشرق فان فلیڈنگ کے مقدمہ کے ساتھ ایک عربی کتاب مصر میں شائع ہوئی ہے جس میں علامہ موصوف کے فلسفہ اجتماع کا ایک تقابلی مطالعہ ارسطو، میکاولی، مونٹسکو اور دوسرے مغربی فلسفیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پچیس قرش (تقریباً چار روپیہ) کو "لجنۃ التالیف والترجمۃ والطباعۃ والنشر" ۱۳ شارع الفجالہ نمبر ۳۸ مصر" سے مل سکتی ہے۔ عربی علوم وفنون کے متلاشیوں کے لئے یہ کتاب دلچسپی سے معلوماتی ہوگی۔

جامعہ لندن کے مستشرق پروفیسر سر ڈینی سن راس اپنے اسلامی ممالک کے سفر سے ابھی ابھی لندن واپس ہوئے ہیں، مصر، فلسطین، ایران وغیرہ میں انہوں نے انگریزی یا فارسی میں تقریریں کیں۔ انکی فارسی تقریروں نے انہیں ایران میں بہت ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اپنے تاثرات کو جمع کرتے ہوئے انہوں نے حال میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ تین امور سے بے حد متاثر ہوئے، جن کو وہ مشرقی ترقی کا فال نیک بھی سمجھتے ہیں۔ ان امور میں سے پہلا شاہ فواد کا انہماک عربی فلاح اور ترقی میں، دوسرا ان کے خیال کے مطابق، کوہ زیتون پر جامعہ عبرانی کا قیام اور تیسرا رضا پہلوی شاہ ایران کا ملکی اور مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہنی ترقی کے لئے بھی سعی کن ہونا ہے۔

ایک فرانسیسی مصنف اندرے ماریوٹے "اسپکٹیٹر" کی صد سالہ اشاعت میں انگلستان کی سہ جامعات آکسفورد اور کیمبرج کے مستقبل کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے، جس میں اس نے بعض ایسے انگریزوں کے خیالات کو جانچنے کی کوشش کی ہے، جو ان جامعات کی تعلیمی نزاکتوں کو تعیش اور ان کو قدامت پسندی کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں اس نے بعض معرکۃ الآرا امور پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ اس کو غلط سمجھتا ہے کہ محض کسی جامعہ کی تعلیم ہی مفید ملک و قوم ہستیاں پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے خیال میں یہ کام قومی قابلیت کا ہے جس پر مخالف نظام تعلیم کا بھی کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ وہ انگریزوں میں دوسری قوموں سے زیادہ قابل افراد کے پیدا ہونے کی یہ وجہ بتلاتا ہے کہ اعلیٰ نوعیت کا کلچر یا تمدن، انگلستان میں عام ہے، گو یورپ کے دوسرے

ممالک کا اوسط معیار تمدن کیمبرج اور آکسفورڈ سے بڑھا ہوا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ پست ممالک میں بہترین اصول پر کام کرنے والی جامعات بھی درخشاں نتائج عام طور سے نہیں پیدا کرسکتیں۔ آگے چل کر وہ کیسر لنگ کے ایک خیال کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بے شک انگریزی جامعات کا مقصد حکمرانوں یا مشیوں کو پیدا کرنا ہے، لیکن کیا اب ایسے اشخاص کی ضرورت نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے۔ لیکن ان کی خصوصی علمیت سے زیادہ قوی کردار کے ساتھ۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے کسی تعلیم یافتہ قوی کردار شخص کو نوکری کی تلاش میں سرگرداں دکھا دیں۔ تعلیم یافتوں کی ضرورت ہر جگہ ان کی پیداوار سے زیادہ ہے۔

آخر میں وہ سفارش کرتا ہے کہ جامعہ جو ایک مقدس ادارہ ہے، اس کی سعی کرے کہ علماء اور فضلا کو تلاش روزی کی پریشانیوں سے امان دیکر حکومت کے دست نگر بننے سے بچائے اور علمی مشاغل میں مصروف رکھے۔ اور ان لوگوں کا جو اس کی خوش گوار فضا میں رہتے ہیں، یہ فرض ہے کہ بغض و کینہ اور حرص و آز سے علیحدہ رہکر ایک مشترکہ تمدن کے بنانے اور پھیلانے میں مصروف رہیں۔

گذشتہ ماہ میں ہمّی کا رسالہ پریس کی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے دیر میں شایع ہو رہا تھا مناسب یہ سمجھا گیا کہ مئی کے ساتھ جون کا رسالہ بھی شایع کر دیا جائے کیونکہ اس سے اس غیر معمولی تعویق کی تلافی ہو جائیگی جو اس دفعہ ہوئی جولائی کا رسالہ اپنے وقت پر شایع ہو سکیگا۔ رسالہ کی تعویق کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ مکتبہ کا پریس اس دفعہ زیادہ مصروف تھا اور کارکنان مطبع دستی لیتھو پریس کے جھگڑوں سے عاجز آکر رسالہ کو بروقت شایع کرنے کے خیال سے مشین پریس کی خریدی کی فکر میں عرصہ سے لگے ہوئے تھے اب مشین پریس خرید لیا گیا ہے جولائی کا رسالہ تیار ہے امید ہے کہ اگست سے رسالہ مشین پریس پر زیادہ نفاست کے ساتھ شایع ہوگا۔ اور بہت سے جھگڑوں سے نجات مل جائیگی۔ کاش اردو کے ارباب حل و عقد ذرا روش خیالی سے کام لیں اور نستعلیق ٹائپ عام ہونے تک (جس کو معلوم نہیں ابھی کس قدر عرصہ درکار ہے) نسخی ٹائپ ہی کو اپنا رسم الخط قرار دیدیں جسطرح فارسی والوں نے کیا ہے تو یقین ہے کہ علمی اداروں کو وہ پریس کی گوناگوں الجھنوں میں پھنسکر وقت ضایع کرنے سے اور اپنے آپ کو انتظار کی تکلیفوں سے بچا سکیں گے۔ ورنہ اگر ہماری قدامت پسندی کا یہی عالم رہے تو کیا تعجب ہے کہ ہمارے بعد کی نسلیں ہماری اس حماقت کی بھی پابند نہ رہے اور راست لاطینی رسم الخط کی طرف رجوع کرے۔

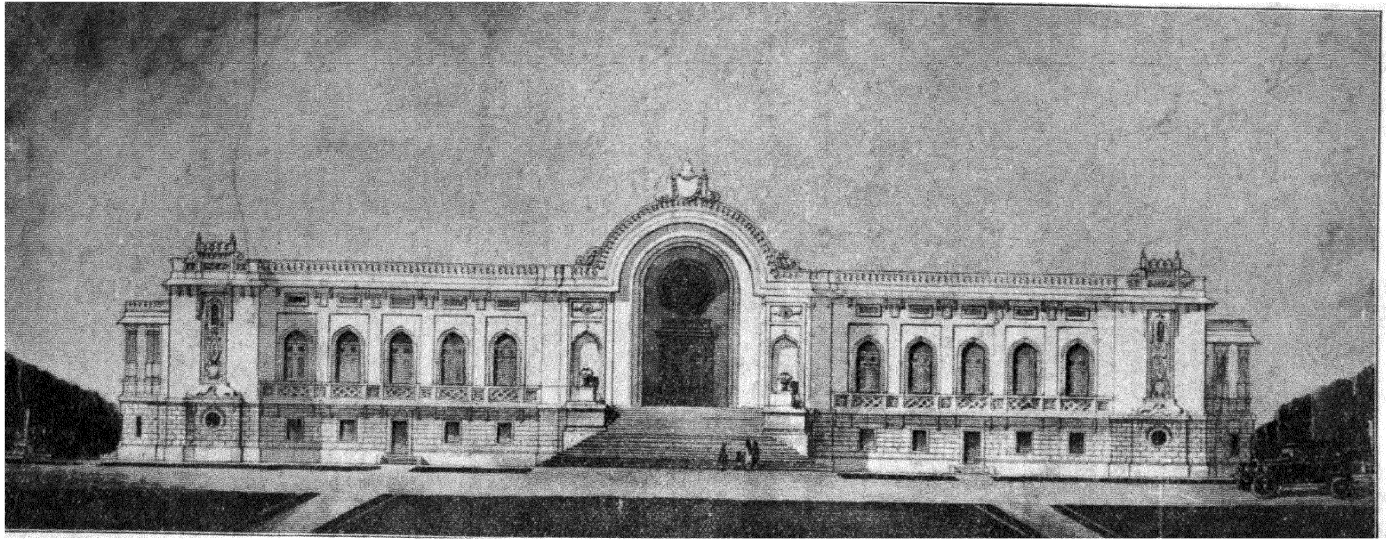

جدید کتب خانہ آصفیہ

علمِ صحت

از جناب بولہ کارم فیض محمد صاحب صدیقی بی اے

یہ مضمون (The Outline of Science) سے ماخوذ ہے۔ اس کا بیشتر حصہ اصل مضمون کا ترجمہ ہے۔ فیض

صحت ایک ایسا لفظ ہے جس کے بہت سے معنی ہیں اور جو بہت ساری چیزوں پر حاوی ہے اس لئے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس کے دائرہ معنی کی وسعت اور اس کے مفہوم کے تنوع کا لحاظ کرتے ہم اس کی کوئی مختصر تعریف پیش کریں یہ ایک بہت ہی قدیم لفظ ہے، اس کے معنی پہلے کچھ لئے جاتے تھے اور اب کچھ لئے جاتے ہیں۔ آئے دن اس کے معنی اور مفہوم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے سرسری طور پر اس کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ صحت ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں جسم زخموں اور بیماریوں سے پاک رہتا ہے، خدائے طب ہپاکریٹس نے فعلیاتی نقطۂ نظر سے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ صحت ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں کہ جسم اور اس کی قوت دونوں حالت تعادل میں رہتے ہیں۔ ایک حد تک یہ بیان درست ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں فعلیات کا علم ابھی اپنے بچپن میں تھا اور ہپاکریٹس کو یہ تک نہیں معلوم تھا کہ معمولی رگ اور شریان میں کیا فرق ہے کیلیم ارسطو نے بھی اس قسم کی تعلیم دی ہے کہ دماغ ایک اسپنج ہے جو خون کو سرد رکھتا ہے، یہ ایک نہایت اچھی تشبیہ ہے لیکن فعلیاتی نقطۂ نظر سے ایک بے معنی چیز، گیالن کے کارناموں نے فعلیات صحت کے موضوع پر خاص روشنی ڈالی ہے، اور آج کل جب کہ فعلیات سائنس کا ایک خاص شعبہ بن گیا ہے، ڈاکٹروں اور سائنس دانوں نے فعلیاتی نقطۂ نظر سے بہت ساری تعریفات کی ہیں اور جسم کو ایک کیمیائی اور طبعی نظام قرار دیا ہے۔ اور اب صحت سے مراد ہم ایک ایسی حالت تصور کرتے ہیں جس میں جسم مفید اور کارآمد توانائی پیدا کرتا ہے، یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا انحصار ہاتھ پیر، ناک آنکھ کے ٹھیک ہونے ہی پر نہیں بلکہ زیادہ تر اس صلاحیت پر ہے جس کی وجہ سے کارآمد توانائی پیدا ہوتی ہے۔

کام کرنیکی قابلیت کا نام صحت ہے

کیمیائی اور فعلیاتی اصولوں کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ صحت کام کرنیکی قابلیت کا نام ہے، فعلیات اور اس سے متعلقہ علوم کی موجودہ صورت کی بنا پر اس مسئلہ نے نہایت دلچسپ اور نازک صورت اختیار کر لی ہے کیوں کہ اس میں ہم کو بعض ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں کہ جو توانائی کی درآمد اور برآمد پر اپنا کافی اثر رکھتی ہیں، آج ہم ایک تپش پیما لیکر کسی آدمی کی زبان کے نیچے رکھتے ہیں اور جب وہ (۹۸.۴) ف کا نشان بتلاتا ہے تو ہم سادہ ہی یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کی صحت اچھی نہیں ہے اور وہ اس انجن کی طرح کام کرنے سے مجبور ہے جس میں حرارت ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے، جب ہم کسی کے دل کی حرکت کو سنکر یہ معلوم کرتے ہیں کہ اس کے حمام میں ایک قسم کی پیچر ہو گئی ہے تو ہم فوراً اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ وہ ایک ایسے پمپ کی طرح جس میں سوراخ ہو گیا ہو کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا یا جب کسی کے خون کی تشریح کرتے ہیں اور اس کی صحت کو خراب پاتے ہیں تو ہم صاف کہہ دیتے ہیں کہ اس میں اپنے جسم کے ایندھن کو جلانے کے لئے کافی آکسیجن موجود نہیں ہے اسی طرح سے جب کسی کی نبض میں یہ بات دیکھتے ہیں کہ وہ ایک منٹ میں (۱۴۰) مرتبہ حرکت کرتی ہے تو فوراً اس کی خرابی صحت کا یقین ہو جاتا ہے، برخلاف اس کے اگر کسی انسان کی تپش (۹۸.۴) ف تو دل کی حرکت حالت اعتدال پر ہو، رگوں میں کوئی ناکردنی دھوں اور نبض (۷۲) دفعہ فی منٹ حرکت کرتی ہو تو ایسے آدمی کی صحت کو خواہ وہ لنگڑا اندھا کبڑا ہو ہم اچھی صحت کہتے ہیں یعنی اس کی صحت حالت اعتدال پر ہے یا بہ الفاظ دیگر اس میں کام کرنیکی پوری قابلیت موجود ہے، ہمارا فعلیاتی علم درحقیقت ہم کو اس قابل بناتا ہے کہ ہم انسان کی صحت کی پیمائش نہ کر کے اس کے متعلق رائے قائم کر سکیں۔

غذا کی توانائی

بہ حیثیت ایک مادی نظام کے جو توانائی کے مفید استعمال کے لئے درکار ہے ایک جاندار کئی لحاظ سے جیلی خصوصیات رکھتا ہے، دوسرے جیتوں کی طرح اس کے لئے بھی جلنے والے اشیاء کی ضرورت ہے۔ ایسی اشیاء میں کاربن کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن وہ کاربن نہیں جو کوئلہ یا تیل کا ہوتا ہے۔ بلکہ غذا کا کاربن وہی کاربن ہے جو سورج کی سرخ شعاعوں کے زیر اثر سبز پتوں کے کاربن ڈائی آکسائیڈ سے جدا ہوتا ہے، سورج کی قوت سے کاربن نئی توانائی حاصل کر کے ارتعاش کرنے لگتا ہے اور جب سب کا سب نشاستہ بن جاتا ہے تو یہ توانائی مخفی ہو جاتی ہے اور نشاستہ کھانے والے جانوروں کے اندر رونما

ہوتی ہے اور جیسے ہی غذا جسمانی ریشوں کے اندر اکسائی جاتی ہے تو اس کا مظاہرہ بالکل حقیقی حیوانی توانائی کی صورت میں ہوجاتا ہے جس طرح سے کوئلہ کے بھٹی میں اکسائے جانے سے توانائی حرارت کی شکل میں خارج ہوتی ہے (جب کوئی عنصر آکسیجن سے ملتا ہے جیسا کہ ہم کوئلے کی نسبت دیکھتے ہیں تو کہا جاتا ہے وہ اکسایا گیا ہے یہ عمل احتراق کہلاتا ہے) جس سے حرارت اور توانائی دونوں آزاد ہوتی ہیں) اگر ہم جلتے ہوئے کاربن کو ایک ایسے برتن میں داخل کریں جس میں آکسیجن بھری ہوئی ہے تو وہ بہت جلد اکسایا جاتا ہے اور بہت زور سے جلنے لگتا ہے، برخلاف اس کے جب ہماری غذا کا کاربن جو ہمارے خون کے سرخ جسیمات کی آکسیجن سے ملتا ہے تو آہستگی سے اکسایا جاتا ہے اور خاموشی سے جلتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی تپش عام طور پر (۹۸٫۴) ف سے بڑھنے نہیں پاتی۔ اس توانائی کا مظاہرہ نہ صرف حرارت کی شکل میں ہوتا ہے بلکہ کیمیائی، جیلی اور برقی توانائی کی شکل میں بھی، ہر صورت میں یہ وہی شمسی توانائی ہے جس کو کاربن نے حاصل کیا تھا اس لحاظ سے ہمارے جسم گویا شمسی مشین ہیں جو ہم سے (۹۳) ملین میل فاصلہ پر کے سیارہ کی سرخ شعاعوں کے زیر اثر جس کو نکلے ہوئے آج کئی لاکھ سال کا عرصہ ہوتا ہے، چلتے ہیں، ہر شخص انہی سرخ شعاعوں کی وجہ سے زندہ ہے اور حرکت کر سکتا ہے۔ ان شعاعوں کی توانائی ہماری غذا کے اجزا مثلاً آلو، مسکہ، روٹی وغیرہ کے ذریعہ ہمارے جسم میں آجاتی ہے۔ بغیر اس توانائی کی مدد کے انسان پلک تک نہیں مار سکتا۔

کیمیائی نقطۂ نظر سے غذا کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، کاربو ہائیڈریٹ مثلاً نشاستہ اور شکر، روغنیات یا چربی مثلاً مسکہ، البومینی مادہ مثلاً انڈے کی سفیدی، ایسی غذائیں جلنے کے بعد اکسائی جاتی ہیں اور ان کی قیمت بحیثیت سیدھ توانائی کے اس حرارت میں محسوس کی جاتی ہے جو دوران احتراق میں دیتے ہیں اس حرارت کا حساب ہم حراروں میں کرتے ہیں، ایک حرارہ حرارت کی وہ مقدار ہے جو ایک گرم پانی کی تپش میں ایک درجہ کا اضافہ کرے۔ جب ہم غذا کی ان تینوں اقسام کو آکسیجن میں جلاتے ہیں تو ایک گرام کاربو ہائیڈریٹ سے (۴٫۱) حرارے، ایک گرام چربی سے (۹٫۳) حرارے اور ایک گرام البومینی مادہ سے (۴٫۱) حرارے حاصل ہوتے ہیں، حرارت توانائی کی ایک قسم ہے جس کو مختلف چیزوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مثلاً عضلی حرکت میں چنانچہ حرارت کا ایک حرارہ معادل ہے اس توانائی کے جو (۴۲۵٫۵) گرام وزن کو ایک میٹر اوپر اٹھانے کے لئے درکار ہے، پس ہم اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جسم کو کس قدر حرارت اور جسمی توانائی کی ضرورت ہے اگر ہم ایک شخص کو ایک حرارہ پیما میں داخل کریں جہاں حرارت کی مقدار اور دوسری قسم کی

توانائی جو وہ صرف کرتا ہے محسوب کی جا سکتی ہے تو معلوم ہو گا کہ اس سے اس قدر حرارے خارج ہوتے ہیں جتنے کہ غذا کو جسم کے باہر جلانے سے حاصل ہوتے ہیں، پس اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ مختلف حالتوں کے تحت انسان کس قدر توانائی خرچ کرتا ہے تو اس کا اندازہ لگانا کوئی دشوار کام نہیں کہ اس کو کس قدر غذا کی ضرورت ہے، ہماری زندگی کا انحصار صرف توانائی پر ہے۔ سانس لینے غور و فکر کرنے اور ذہنی اور جسمانی ورزش کرنے کے لئے غرض ہر کام میں توانائی لازمی طور پر درکار ہے غذا کے خرچ کی فہرست کے معائنہ سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک اوسط آدمی کی غذا کے لئے کس قدر حرارے درکار ہیں، جنگ سے قبل ایک انگریز کی غذا کے لئے (۳۴۲۲) حرارے درکار تھے (چوبیس گھنٹے میں) جنگ کے زمانہ میں رائل سوسائٹی کی طعامی انجمن نے تخمینہ کیا ہے کہ اوسط آدمی کیلئے (۳۳۹۰) حرارے درکار ہیں جس سے وہ اپنی حالت کو قائم اور برقرار رکھ سکتا ہے۔ صرف قلب کی حرکت اور دیگر عضلی کاموں کو برقرار رکھنے اور جسم کی تپش کو قائم رکھنے کے لئے (۲۸۳۶) حراروں کی ضرورت ہے اس کے علاوہ جس قدر بھی حرارے بچ جائیں وہ عضلی توانائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں مثلاً فی میل (۱۰۰) حرارے حقیقی عضلی توانائی میں اور باقی حرارت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں اگرچہ بظاہر یہ تعداد بہت چھوٹا عدد معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ وہ تناسب ہے جو عالی قامتیوں کے بھاپ انجن میں بھی حاصل نہیں ہوتا ہے۔

غذا کے مختلف اقسام کا تناسب

ان واقعات کے مدنظر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انسان کو اپنے عضلات سے کام کرنے کے لئے حراروں کی ایک خاص مقدار درکار ہے، ضرورت سے زیادہ کھانا محض اس لئے کہ طاقت میں اضافہ ہو، بیوقوفی ہے غذا کی مقدار کے تعین اور اس کے انتخاب میں کافی ہوشیاری برتنے کی ضرورت ہے، غذا کے انتخاب کا انحصار معدہ کی قابلیت ہاضمہ، تنفس اور دوران خون پر ہے، بے سوچے سمجھے غذا کبھی استعمال نہ کرنی چاہئے، کاربوہائیڈریٹ، روغنیات اور البومینی مادہ کا غذا میں شامل ہونا ضروری ہے ان تینوں میں البومینی مادہ بہت اہمیت رکھتا ہے وہ نہ صرف انسان میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے بلکہ اکثر وفعہ جسم کی ساخت میں بھی بہت بڑی مدد دیتا ہے ہمیں غذا ایسی استعمال کرنی چاہئے کہ وہ ہضم ہو سکے اس لئے اس کے ہضم ہونے کی قابلیت بھی معلوم کرنا ضروری ہے، مزید برآں ہمیں خون دل اور تنفس کی اکسائی کی طاقت کا بھی علم ہونا چاہئے کیونکہ غذا کا کاربن کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر اس کے جلانے کے لئے آکسیجن موجود نہ ہو، جو شخص خوب طاقت حاصل کرنے کے لئے زیادہ غذا کا استعمال

کرتا ہے تو اس کے رگ اور پٹھے مضبوط اور طاقتور ہیں تو ہم سمجھینگے غذا کارآمد ہوئی۔ اگر نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری غذا فضلہ بن کر رہ گئی۔ اچھی صحت کا تندرست آدمی چوبیس گھنٹے کے اندر دس ہزار حرارے بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن ہر شخص کا یہی حال نہیں ہے اور اسی لئے ہر شخص یکساں نہیں ہوتا۔

انسان کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی غذا کو ناپ تول کر استعمال کیا کرے بلکہ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کچھ دنوں کے وقفہ سے اپنے جسم کا وزن کیا کرے، اگر اس کا وزن سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے تو یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ وہ زیادہ غذا استعمال کر رہا ہے، برخلاف اس کے اگر کم ہو رہا ہے اور صحت بھی اچھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ توانائی کے لئے وہ خود اپنے ریشوں کو استعمال کر رہا ہے، ایسی صورت میں غذا کی مقدار کا بڑھانا از بس ضروری ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہوشیار آدمی محض تجربہ کی بنا پر اپنی خوراک کو معین کر سکتا ہے تاکہ توانائی کو برقرار رکھ سکے بڑی مشکل ہے یہ کہ اس معاملہ میں لوگ حد درجہ لاپروائی برتتے ہیں بالخصوص ہندوستان میں تو اس معاملہ پر ذرا بھی توجہ نہیں دی جاتی مصروف اور کاروباری آدمی ان پابندیوں اور پیچیدہ اشتوں پر کبھی غور نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دنوں کے بعد ان کی ہڈیاں نکل آتی ہیں اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ کام کرنے کی صلاحیت ان میں دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔

وائٹامن کی اہمیت

(۱)

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ غذا کی تین قسمیں ہیں، کاربو ہائیڈریٹ چربی اور البومینی مادہ، یہ لازمی چیزیں ہیں جن کے اکساؤ سے توانائی پیدا ہوتی ہے، لیکن ان تینوں کے علاوہ کامل ہاضمہ کے لئے انسان کو اپنی غذا کی فہرست میں اور چیزوں کو بھی شریک کرنا ضروری ہے مثلاً پانی یہ جزو لاینفک ہے۔ علاوہ ازیں چند نمک مثلاً معمولی نمک اور دیگر مخصوص مادوں کی ضرورت ہے جن کو وائٹامن کہا جاتا ہے۔ عام طور پر کھانے کی چیزوں میں پانی شریک ہوتا ہے لیکن بعض میں مثلاً دودھ، گوشت، ترکاری، میں زیادہ تر وائٹامن شریک ہوتے ہیں۔

وائٹامن سے خوراک کے مسئلہ میں ایک نئے خیال کا اضافہ ہوتا ہے یعنی یہ کہ وہ حرارت یا حرارہ سے بالکل بے تعلق ہے، یہ اشیاء ہماری غذا میں اس قدر کمتر مقدار میں موجود ہیں کہ بجائے

خود ان کو مبدا توانائی خیال نہیں کیا جاسکتا، البتہ صحت جسمانی، ترقی اور حتی کہ جسم کی زندگی کا دارومدار انہی پر ہے اب تک ان کی کوئی باضابطہ کیمیائی تعریف نہیں کی گئی تاہم البتہ بتدریج یہ معلوم کیا جارہا ہے کہ یہ کن کن چیزوں میں شریک ہوتے ہیں اور کن چیزوں میں ان کی عدم موجودگی مہلک نتائج کا باعث ہوتی ہے۔

ان کو غذا کا زائد اجزا کہا جاتا ہے کہ ان کی عدم موجودگی خارشت کا باعث ہوتی ہے جہازوں میں جب سلسل سفر کیا جاتا ہے تو خاص صورتوں کے علاوہ اکثر وغیرہ کو تازہ چیزیں کھانے کے لئے نصیب نہیں ہوتیں، جس سے اس مرض کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ دیگر جزیات کی عدم موجودگی کھجلی، گٹھیا اور دیگر بیماریوں کا باعث ہوتی ہے۔ حکیم لوگ جب ہم کو ناقص غذا کے استعمال سے روکتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں یہ جزئیات کافی مقدار میں موجود نہیں ہے۔ محاصرہ کے زمانہ میں برطانوی افواج میں خارشت اور ہندوستانیوں میں بیری بیری کا مرض عام ہوگیا تھا، اس کے ذمہ دار رسد پہونچانے والے تھے، بچوں، بوڑھوں اور فوجیوں کی غذا کا انتظام کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ غذا میں وٹامن کی موجودگی کا اطمینان کرلیں کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں کاربوہائیڈریٹ، چربی اور البومینی مادہ انسان کی صحت کو قائم رکھنے کے لئے اپنا فعل پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے۔

غذا کا لطف اٹھانا

انسان کا عضویاتی نظام غذا کی وجہ سے قائم ہے کسی شخص میں کارآمد توانائی حالت اعتدال پر ہوگی اگر وہ بہت زیادہ یا بہت ہی کم غذا استعمال کرے یا اس کا ہاضمہ خراب ہو، ہاضمہ کا عمل تشی عضو سے شروع ہوکر اس کو لائے محلول میں ختم ہوتا ہے جس میں زندہ نخزایہ (PROTOPLASM) شریک ہے بدہضمی، ہاضمہ کی عضویاتی ناکارگی کی وجہ نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں کھانا ہضم کرنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ ہم غذا کا پورا پورا لطف اٹھائیں، جو شخص غذا کا لطف نہیں اٹھاتا وہ کسی چیز کا بھی لطف نہیں اٹھا سکتا، غذا کا پورے طور پر لطف اٹھانے کے لئے ہم کو چاہئے کہ اس کو سونگھیں اور چکھیں۔ غذا کے سونگھنے اور چکھنے سے ہمارے منہ میں پانی چھوٹتا ہے اور یہی ہاضمہ کی وجہ ہے روسی حکیم پاؤلاف کا بھی یہی خیال ہے کہ ہوا اور ذائقہ سے پیٹ میں بھی پانی چھوٹتا ہے بعض لوگ خوب کھاتے ہیں صرف اس لئے کہ بہت زیادہ کھائیں، نہ تو وہ اس کا لطف اٹھاتے ہیں اور نہ مجھ، اس سے

صحت پر مضر اثر پڑتا ہے اور انسان بیمار ہو جاتا ہے صحت کی ترقی یا توانائی کی زیادتی کا انحصار ذائقہ اور سونگھنے کے احساس کی تحریک پر ہے۔ ہاضمی رس جس کو ڈاکٹر پاؤلاف نے PSYCHIC JUICES نام دیا ہے۔ بو اور ذائقہ کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور ہاضمہ میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ سونگھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ طعام خانوں میں کھلی ہوا کا گذر نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ بغیر صاف ہوا کے تنفس اور دوران خون کا ٹھیک عمل نہیں ہوتا اور جب ایسا ہو تو پھر ہاضمہ کا عمل کس طرح پورے طور پر انجام پا سکتا ہے اسی لئے سونگھنے کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

عام طور پر لوگوں کے ہاضمہ میں اتنی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ اس قدر توانائی پیدا کر سکیں جتنی کہ ان کو درکار ہے زیر دست رگ پٹھوں اور عضلی توانائی رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں اس لئے کہ کامل صحت کا انحصار رگ پٹھوں کی مضبوطی اور غیر معمولی طاقت پر نہیں ہے مختلف طریقے جن سے رگ پٹھوں کو مضبوط اور طاقتور بنایا جاتا ہے توانائی کے نقطۂ نظر سے قطعاً بیکار ہیں اس لئے کہ طاقتور رگ پٹھے صرف چند سال کے لئے نمایاں توانائی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس طرح پر توانائی صرف ہوتی ہے وہ جاندار عضویات پر ایک قسم کا بار ہے یہ گویا کاربن کے مرکبات کی توانائی بالقوہ کا بیجا اسراف ہے اس میں شک نہیں کہ قدیم زمانہ میں عضلی توانائی یا جسمانی طاقت تنازع للبقاء کے لئے ضروری چیز تھی اس زمانہ میں کسی بھاری وزن کا اٹھانا یا کسی زبردست کمان کا کھینچنا ایسے کام تصور کئے جاتے تھے کہ جن کے انجام دینے سے کمزوروں پر فوقیت حاصل ہوتی تھی لیکن آج کل جب کہ ہمارے پاس کارتوس کی بندوقیں اور زہریلی گیس موجود ہیں عضلی توانائی ایک سخت کی چیز تصور کی جاتی ہے غذا کے کاربن سے ایک انسان چند سو مرا ے پیدا کر کے اپنے بازوؤں کی توانائی کو بڑھا سکتا ہے تاکہ کچھ کام کر سکے لیکن کوئلہ کی توانائی اگر وہ اپنے دماغ کو کام میں لائے تو اس سے ہزار گنا زیادہ کام کر سکتی ہے تیل کی توانائی سے انسان موٹر کے ذریعہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کرتا ہے جس کے لئے اس کے پیروں کی توانائی ناکافی ہے۔ پھر ایسی صورت میں ہم کو عضلی توانائی کی اتنی ضرورت باقی نہیں رہتی ہم اس انسان کی صحت کو اچھی صحت کہتے ہیں جس میں اپنے عضلات کی توانائی کو سلیقہ سے استعمال کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ آج کل کے زمانہ میں انسان کو عضلی توانائی سے زیادہ دماغی یا ذہنی توانائی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ دماغی توانائی کی مدد سے وہ مشینوں سے کام لیکر عضلی توانائی کی ضرورت کو باقی نہیں رکھتا' ہاں ہم کو صرف اس قدر توانائی کی ضرورت ہے کہ

ہم اس کی مدد سے اپنے پھیپھڑے سانس لینے کے عضویات اور دوران خون کو برقرار رکھ سکیں۔ آج کل یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ انسان کی صحت کامل ہے کہ نہیں بلکہ اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی روحانی اور دماغی قابلیتوں کو کس طور پر صرف کرتا ہے ہم اس کی پروا نہیں کرتے کہ آیا وہ شتر مرغ کا ہاضمہ رکھتا ہے یا شیر سے لڑنے کی طاقت بلکہ ہم جس چیز پر توجہ دیتے ہیں وہ یہی کہ اس میں اپنی توانائی کی قدر و قیمت کو جاننے اور اس کو استعمال کرنے کی کہاں تک صلاحیت موجود ہے۔

ورزش ذہنی کاموں کے لئے زیادہ غذا کی ضرورت نہیں ہوتی اتنی غذا کافی ہے کہ قلب اور پھیپھڑوں کی حرکات اور جسم کی حرارت کو برقرار رکھ سکے برخلاف اس کے بعض لوگ جتنی توانائی خرچ کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ کھاتے ہیں اور بعض لوگ عضلی حرکت میں بہت زیادہ توانائی خرچ کر دیتے ہیں اس سے نقصان ہوتا ہے ورزش بھی اعتدال پر ہو اور غذا بھی معتدل تو حاصل توانائی کی مقدار بڑھ جاتی ہے معمولی صحت کا آدمی ناچ سکتا ہے چل سکتا ہے، تیر سکتا ہے کھیل سکتا ہے، اور دیگر قسم کی ورزش بھی کر سکتا ہے اور ایسا کرنے سے اس کے ہاضمہ تنفس اور دوران خون میں اضافہ ہوتا ہے، اتنا کام کرنے پر بھی توانائی کی ایک کافی مقدار بچ رہتی ہے جس کو دوسرے کاموں میں لایا جا سکتا ہے، سستی کے وقت اگر تھوڑی سی ورزش کر لی جائے تو جسم کا کارخانہ کام کرنے لگتا ہے، اس کی مثال ایک مشین کی سی ہے کہ اس کے ایک پہیئے کو ذرا سی گردش دیدی اور پھر وہ چلنے لگا، بغیر ورزش کے بھی انسان اپنی دماغی توانائی کو قائم رکھ سکتا ہے لیکن اس کیلئے تھوڑی بہت ورزش درکار ہے۔

صحت اور خوشی کا تعلق ہم نے قبل ازیں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ بعض لوگ بہت کھاتے ہیں یا کم از کم اتنا کھاتے ہیں کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے، غذا نہ صرف جسم انسانی کو گرم رکھتی ہے بلکہ اس کا اثر کردار اور طبیعت پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً مشہور ہے کہ بھوکا آدمی کتے کے برابر ہوتا ہے یعنی اس کی طبیعت میں کتے کے جیسا غصہ ہوتا ہے، جو آدمی کم کھاتا ہے وہ ہمیشہ آگ بگولہ رہتا ہے اور موٹا آدمی یا خوب کھانیوالا ہمیشہ مستغنی انسان کی توانائی اور صرف دماغی توانائی ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی توانائی کا کچھ حصہ اس کو خوش رکھنے کے لئے بھی استعمال ہونا چاہیے کیونکہ صحت کی عدم موجودگی مگر خوشی بہتر ہے صحت مگر غمی سے۔ کیونکہ اگرچہ خوشی توانائی کو پیدا نہیں کرتی تاہم وہ اس کے صرف کا راستہ بتلاتی ہے۔

بنا بریں تھوڑی سی اور ہلکی شراب کا استعمال جائز قرار دیا جا سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ الکحل کسی صورت میں بھی غذا کا کام نہیں دیتا اور اگر اسے معمولی غذا کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ایک حد تک وہ توانائی کو گھٹاتا ہے لیکن کسی مغموم دل کے لیے وہ اکسیر کا کام کرتا ہے دل و دماغ کی قوت کو بڑھا کر زندگی کو کارآمد بنا سکتا ہے جسم کے مشین میں غذا وہ کام کرتی ہے جو معمولی مشین میں کوئلہ۔ لیکن مشین چلتے چلتے جب رک جاتا ہے یعنی اس کے پہیے اچھی طرح نہیں پھرتے تو خوشی کا تیل ہلامت پیدا کرنے کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔

(۲)

تنفس اور دوران خون

غذا جسمانی ورزش اور صحت کے مابین جو تعلق ہے اس کو ہم نے ایک بڑی حد تک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور جیسا کہ ہم نے پہلے بتلا دیا ہے غذا اور جسمانی ورزش کو تنفس اور دوران خون سے جدا تصور نہیں کر سکتے اگرچہ غذا دل و دماغ کو چاق و چوبند رکھتی ہے تو دل و دماغ بھی غذا کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ نیز ہم نے اس بات کو بھی واضح طور پر سمجھا دیا کہ جسم کی توانائی کا اصل مبدا وہ توانائی ہے جو کاربن کے آکسائڈ سے خارج ہوتی ہے کاربن کا آکسائڈ اس آکسیجن سے ہوتا ہے جو سرخ خون کے جسیمات کے رنگین مادہ کے ساتھ شامل ہے تنفس کا عمل آکسیجن کو خون میں لاتا ہے اور اس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جدا کرتا ہے جو کاربن کے احتراق کی وجہ سے اس میں جمع ہے۔

تنفس اور خون کا دوران ایک قسری فعل ہے جب کوئی شخص کافی جسمانی ورزش کرتا ہے تو سانس بلا ارادے کے زور زور سے چلنے لگتی ہے تاکہ آکسیجن کو حاصل کرے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو علحدہ۔ ساتھ ہی ساتھ دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے تاکہ ریشوں (TISSUES) تک آکسیجن کو پہونچا کر وہاں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرے دوران ورزش میں دس گنا آکسیجن صرف ہوتی ہے اور آرام کے موقع پر دس گنا کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کی عضلی توانائی کا دارومدار نہ صرف غذا کی توانائی پر ہے بلکہ زیادہ تر دوران خون اور تنفس کی قابلیت پر بھی، اگر کسی شخص کا ہاضمہ درست ہے مگر پھیپھڑے اور دل خراب تو وہ پوری توانائی حاصل نہیں کر سکتا ان تینوں میں ایک قسم کا توافق ہونا چاہیے صحت کا جزو اعظم توانائی کا توافق ہے اور توافق کا نہ ہونا خرابی صحت کی دلیل اوسط صحت کے آدمی کے لیے یہ کوئی ضروری

نہیں کہ توانائی کی درآمد اور برآمد بہت زیادہ ہو بس اتنا کافی ہے کہ اس کا اندرونی نظام تعادل کی حالت میں رہے۔ یہ بات اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ وہ معتدل سے کھائے پیئے، کام کرے اور سانس لے غذا اور ورزش کے متعلق تو غیر ہم نے کافی سے زیادہ بحث کی ہے۔ اب ذرا سانس لینے کے فعل پر غور کریں گے۔

زندگی کی سانس

زمانۂ حال میں تنفسی ورزش پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، تنفس ایک غیر ارادی فعل ہے جس کا عمل پیدائش سے لیکر موت تک برابر ہوتا چلا آتا ہے، یہ ایک عمل ہے جو کچھ تو عضلی افعال اور کچھ کیمیائی اثرات پر مبنی ہے اگر روزانہ کچھ منٹ کے لئے تنفسی ورزش کی جائے تو تنفسی قابلیت پر بحیثیت مجموعی بہت کچھ اثر پڑتا ہے تنفسی ورزش کی بہترین قسم یہ ہے کہ کھلی ہوا میں ورزش کی جائے لیکن یاد رہے کہ ورزش کرنے سے قبل دل اور پھیپھڑوں کی قابلیت کا لحاظ کرنا ضروری ہے، کھلی ہوا میں اس لئے ورزش کی جاتی ہے تاکہ آکسیجن کی کافی مقدار حاصل ہو سکے، اس طریقہ سے آکسا دکے عمل اور ذی حیات توانائی میں کافی اضافہ ہوتا ہے، کسی کاہل اور سست آدمی کے لئے اس قسم کی ورزش نہایت مفید ہے اس لئے کہ تنفسی ورزش اس کی ذی حیات اور دماغی توانائی کو بڑھانے میں بہت مدد پہونچاتی ہے۔

جسم کی تپش

عضلی ورزش کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تنفسی عمل میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں مثلاً تپش اور جلد۔ ہم نے قبل ازیں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ غذا کی توانائی کا (۸۰) فیصدی حصہ حرارت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ حرارت بالعموم جسم کی تپش کو (۹۸٫۴) ف پر برقرار رکھتی ہے پس اگر عضلی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کا صاف طور پر یہی مطلب ہوا کہ جسم کی حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے یعنی جسم سے حرارت زیادہ خارج ہو رہی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اگر حرارت کا اخراج نہ ہو تو جسم کی تپش بلند ہو جائیگی اور سخت بخار آ جائیگا مگر فطرت نے اس کی کمی اور زیادتی کا خاصا انتظام کر رکھا ہے، جسم کے اندر حرارت اگر زیادہ ہو جائے تو جسم یکایک سرخ ہو جاتا ہے اور حرارت اشعاع کے ذریعہ خارج ہو جاتی ہے جسم پر پسینہ آ جاتا ہے تاکہ حرارت بخارات کی شکل میں خارج ہو جائے لیکن اگر فضا گرم، مرطوب یا خشک ہو تو فطرت کے یہ انتظامات اتنے زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتے مگر ایسی حالتوں میں فطرت نے خود اسطرح کا انتظام کر رکھا ہے ایسی حالتوں میں توانائی میں اضافہ ہونے نہیں پاتا، چنانچہ گرم ممالک کے لوگوں میں توانائی نسبتاً کم ہوتی ہے اور وہ سرد ممالک والوں کے مقابلہ میں بہت کم کام کرتے ہیں، یورپ کے لوگ

آفریقہ والوں سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔

لباس کے اندر کی فضاء

اب ہم ایک نئے موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ لباس کے اندر کی فضاء ہے، عام طور پر صحت کی خرابی، بھوک کا نہ لگنا، توانائی کا انحطاط، جوش کی کمی اور عام سستی کی ایک وجہ ہمارے جسم کے اطراف کی گرم مرطوب اور خاموش فضاء ہے، جو لوگ گرم نمطقی حصوں میں رہتے ہیں انہیں باہر کی فضاء ناگوار معلوم ہوتی ہے بر خلاف اس کے وہ لوگ جو سرد ممالک میں رہتے ہیں یہ چاہتے ہیں کہ ان کے کمرون اور لباس کے اندر کی فضاء گرم، مرطوب اور خاموش ہو، لباس کے اندر کی فضاء صحت کے معاملہ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، انگلستان میں رہنے والے لوگ اپنے لباس کے اندر کی فضاء کو ہمیشہ گرم رکھتے ہیں، تمام جسم کو کپڑوں سے ڈھانک لیتے ہیں، لیکن ان کا چہرہ اور دونوں ہاتھ کھلے رہتے ہیں تاکہ حرارت کا اشعاع ہو سکے، اگر یہ نہ ہو تو انسان کے عضو معطل ہو جائیں گے، کسی نہ کسی جگہ سے اشعاع کا ہونا لازمی ہے، چنانچہ انگلستان کی عورتیں آج کل اپنے جسم کا بہت سا حصہ کھلا رکھتی ہیں۔ شاید اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اتنا حصہ صرف اشعاع حرارت کے لئے کھلا چھوڑتی ہیں، اس سے بہتر یہ ہے کہ انسان دن کے کسی حصہ میں اپنے جسم کو اس بات کا موقع دے کہ اس سے نہایت آزادی کے ساتھ اشعاع ہو سکے، جب ہم کسی پہاڑ پر چڑھتے ہیں یا سمندر کے کنارے ٹہلتے ہیں تو ہمیں ایک قسم کی فرحت حاصل ہوتی ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ ہوا کی تبدیلی کی وجہ ہوگی۔ مگر واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے، ہوا میں تو کچھ ایسی زیادہ تبدیلی نہیں ہوتی مگر سمندر کے کنارے اور پہاڑ پر ہوا زوروں سے چلتی ہے اور ہمارے جسم کے تقریباً تمام حصوں سے گذرتی ہے، اس سے حرارت کا کافی اشعاع ہوتا ہے اور اسی لئے ہمیں فرحت معلوم ہوتی ہے کافی اشعاع کے بغیر نہ تو جسمانی مشین ہی کام کر سکتا ہے اور نہ موٹر کا مشین ہمارے مکان اور ہمارے لباس کے اندر کی متحرک ہوا ہم میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

لباس کے اندر کی فضاء نہ صرف نقصانِ حرارت کے نقطۂ نگاہ سے ہی اہم ہے بلکہ نقصان آب کی وجہ سے بھی حرارت اور ورزش کی معتدل حالت کے تحت جسم کی جلد سے روزانہ تقریباً ایک پنٹ پانی خارج ہوتا ہے اگر خوب ورزش کی جائے تو پسینہ کافی مقدار میں نکلتا ہے، اب اگر کپڑوں کی اندر کی فضاء رطوبت کے باعث سیر شدہ ہو گئی ہے تو پانی کا نکلنا بند ہو جاتا ہے اور سارا پانی جلدی ریشوں کے اندر بھر جاتا ہے، جسم کے اندر جلد کے نیچے پسینے کے ایسے ہزاروں غدود ہیں اگر ان سے پسینہ خارج ہونا بند ہو جائے تو لازمی طور پر صحت خراب ہو جائیگی، چنانچہ جب جسم پر چست بنائن اور موٹا کوٹ ہو تو ایک

قسم کی سستی محسوس ہوتی ہے علاوہ ازیں کمروں کے اندر صاف ہوا کے آنے کے لئے بڑے بڑے روشندان ہونے چاہئیں جس طرح سے بھٹی کے اندر کی آگ اس وقت تک اچھی طرح جل نہیں سکتی جب تک اس میں ہوا کے گزرنے کے لئے کوئی سوراخ نہ ہو اسی طرح جسمانی مشین بھی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ وقتاً فوقتاً اس کے اندھن کو تازہ ہوا نصیب نہ ہو۔

کھلی ہوا اور روشنی | مرض سل میں ڈاکٹر لوگ ہمیشہ عضویاتی اصول سے کام لیتے ہیں مریض کو ہمیشہ کھلی اور متحرک ہوا میں رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں اس سے نہ صرف مریض کی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ افراز کا عمل بھی بخوبی انجام پاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کھلی ہوا کا اثر ہماری صحت پر پڑتا ہے۔ بہرحال سورج کی شعاعوں کا بھی ہے لیکن اس کے متعلق ہمیں زیادہ علم نہیں ہے البتہ حال کی تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلا ہے کہ سورج کی روشنی کا اثر اس کیمیائی عمل پر پڑتا ہے جو خون کے اندر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ [illegible] مرکزوں میں ہوا میں [illegible] خوب لگتے ہیں [illegible] کرنے کی کوشش [illegible] ہے۔

(۴)

نیند | اب ہم ایک اہم بات بیان کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق براہ راست ذی حیات توانائی سے ہے۔ انسان ایک ہفتہ تو کیا مہینوں بغیر کھانا کھا سکتا ہے لیکن بغیر نیند کے اس کی زندگی دشوار ہے خواہ وہ کتنا ہی کیوں نہ کمائے اور کتنی ہی آسائشیں کیوں نہ پیدا کرے اس لیئے نیند ضروری ہے اس لئے کہ بغیر نیند کے توانائی ختم ہو جاتی ہے اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آخر نیند اس قدر ضروری کیوں ہے؟ اس کا سمجھنا قدرے دشوار ہے نظری حیثیت سے جہاں تک دوران خون ہاضمہ اور تنفس کا تعلق ہے توانائی کی سخت ضرورت ہوتی ہے لیکن فرحت، بشاشت اور چولائی طبع کو قائم رکھنے کے لئے اور بالخصوص دماغ اور عصبی نظام کے مشین کو چالو رکھنے کے لئے نیند از بس ضروری ہے، نیند میں شعور غائب ہو جاتا ہے اس کے چند وجوہات میں ہیں مثلاً ..... فضلہ کا ایک جگہ جمع ہو جانا اور حیات کے عصاب میں ایک قسم کی سستی پیدا ہو جانا وغیرہ نیند میں ذی حیات اعضا بہت ہی کمزوری کے ساتھ کام کرتے ہیں اور بہت سی انیجن جذب اور خارج ہوتی ہے اور کوئی شخص اپنی توانائی سے پورا لطف اٹھانا چاہتا ہے تو اسے خوب گہری نیند سونا چاہیئے رات کو بہت دیر تک جاگنے اور پھر صبح جلدی اٹھ جانے سے سستی کاہلی اور پژمردگی کا حملہ ہوتا ہے خوش قسمت انسان نیند کے لطف سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں برخلاف اس کے غریب لوگوں کو نہ دن کو چین ہے

اور نہ رات کو آرام۔ اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک خاص وقفہ کی نیند صحت کو حالت اعتدال پر رکھتی ہے دماغی کام کے لئے صرف چند گھنٹے کی گہری نیند کافی ہے مختلف طبائع کے لوگوں کیلئے مختلف وقفوں کی نیند درکار ہے انسان پر جب بے خوابی کا حملہ ہوتا ہے تو ذہنی اور جسمانی توانائی میں کمی واقع ہوتی ہے اسکی کافی مدافعت کیجاتی ہے کیونکہ یہ بذات خود کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ بیماری کا ایک شاخسانہ یا علامت ہے اسکی اصل وجہ جسمانی، یا ذہنی، یا طبعی ہوسکتی ہے ایسی صورتوں میں ان بیماریوں کو دور کرنیکی کوشش کرنی چاہئے جن سے بے خوابی پیدا ہوئی ہے اس سے کیا فائدہ ایک شخص کو معدہ کی خرابی کی وجہ سے بے خوابی ہے تو اسے تھوڑی سی افیون کھلادی گئی اسمیں شک نہیں اسوقت کچھ فائدہ ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن بعد کو اسکے مضر اثرات رونما ہوتے ہیں اگر بے خوابی فی الحقیقت بدہضمی کی وجہ سے ہوئی ہے تو اس کا علاج ہاضمہ کی دوا اور بستر پہ بھوکے پڑا رہنا ہے اگر بعد میں بھوک زیادہ معلوم ہو تو ہلکی سی غذا استعمال کرلیں نہ کہ مرغن غذا۔ نیز اگر کسی شخص کو نیند اس لئے نہیں آرہی ہے کہ وہ تھکا ہوا نہیں ہے تو اس کو چاہئے کہ کچھ کام کرے۔

اکثر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ سونے سے قبل جب کوئی اشتعال انگیز خیال ذہن میں آجاتا ہے تو رات رات بھر نیند نہیں آتی اس کا علاج صرف تبدیلی خیال ہے، بعض لوگ ذرا ذرا سی بات اور معمولی سے معمولی خیال پر مشتعل ہوجاتے ہیں اس کا علاج صرف یہی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خاموش اور سنجیدہ کردار پیدا کریں۔ اشتعال دل کی حرکت کو بڑھا دیتا ہے اور اس سے دماغ سے بہنے والے خون کا بہاؤ کم ہوجاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے نیند نہیں آتی اشتعال کے علاوہ بعض دفعہ دوران خون کی زیادتی کے باعث نیند نہیں آتی، اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ گرم پانی نہالیں یا گرم چیز پی کر سوجائیں۔

جب انسان حد درجہ پریشان اور متفکر ہوتا ہے تو اسے نیند نہیں آتی، پریشانی اور فکر ہمارے سامنے ناخوشگوار مناظر پیش کرتے ہیں بعض دفعہ جب کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو ہم اکتا کر پریشان ہوجاتے ہیں، یہ ایک لاعلاج مرض ہے اس لئے ہماری زندگی میں ہزاروں مسائل ایسے ہیں جن کا حل ہمارے لئے ازبس ضروری ہے، اگر ہم ہر بات پہ متفکر ہوجائیں تو ظاہر ہے کہ زندگی تلخ ہوجائیگی اس لئے استعمال ارتکاز توجہ کی سخت ضرورت ہے رات کی تاریکی اور خاموشی میں ان تمام خیالات کا تانتا بندھ جاتا ہے جس کا ٹوٹنا مشکل ہے، اس کا کوئی علاج نہیں ہاں صرف یہ ہوسکتا ہے انسان دن کے وقت پریشان کن باتوں کی طرف اپنی زیادہ توجہ نہ دے، ایک اور دلچسپ چیز ہے کہ وہ یہ کہ ہم اپنی پریشان حالی پر بھی پریشان ہوجاتے ہیں جس سے اور بھی نیند نہیں آتی۔ صحت کے لئے بے خوابی مہلک ہے اور بے خوابی پر پریشانی ظاہر ہے۔ اگر نیند نہ آئے تو اپنے بستر پہ خاموش پڑا رہنا بدرجہا تم بہتر ہے بستر پر

تڑپتے اور روتے پڑے رہنے سے اس لئے کہ اس سے پریشانیوں اور فکروں میں اضافہ ہوتا ہے۔

سطور بالا میں ہم نے بے خوابی سے پریشانی اور تفکر کا تعلق بتلادیا ہے لیکن اس سے علیحدہ جب ہم زندگی کے مختلف تاریک پہلوؤں پر غور کرتے ہیں جن کا تعلق غمگین اور جانکاہ واقعات سے ہوتا ہے تو اس سے ہماری اندرونی توانائی میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوتا ہے اور صحت خراب ہوجاتی ہے اس لئے کہ وہی توانائی جو ذی حیات اعضاء کی ملک ہے اس طرح بٹ جاتی ہے جس کی وجہ سے بدہضمی اور دیگر بیماریوں کی علامات شروع ہوجاتی ہیں اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ بالعموم اپنی نظر دنیا کے روشن و درخشاں پہلو پر رکھے، پریشانی اور فکر کا دور کرنا زیادہ تر ارادہ کی تربیت پر موقوف ہے جو لوگ کھلی ہوا میں رہتے ہیں اور جن کی صحت بھی اچھی ہوتی ہے ان میں زمانہ کی تکالیف اور مصائب کو دور رکھنے کی قابلیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے، پریشانی ہی پر کیا موقوف ہے تمام ناخوشگوار جذبات صحت کی خرابی کا باعث ہوتے ہیں، غصہ، خوف، نفرت، حسد، اور نا امیدی یہ تمام ذی حیات اعضاء کو خراب کردیتے ہیں چنانچہ جس شخص پر ناامیدی کی گھنگور گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں اس کو بہت کم بھوک لگتی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں کسی شخص پر چوری کا شبہ کیا جاتا ہے تو ملا لوگ اس کو پڑے ہوئے چاول چبوا تے ہیں اگر وہ چبا کر کھالے تو وہ چور نہیں ہے ورنہ بلاشبہ اس نے چوری کی ہے۔ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس کی توجیہ دوسری ہے۔ پڑھنے پڑھانے سے کچھ نہیں ہوتا، بات یہ ہے کہ جرم کے خوف سے مجرم کا منہ خشک ہوجاتا ہے اور وہ چاول نگل نہیں سکتا۔

اگر یہ صحیح ہے کہ ناخوشگوار جذبات، پریشانیوں اور افکار کی وجہ سے انسان کی قوت گھٹ جاتی ہے یا بہ الفاظ دیگر اس کی اسپرٹ مردہ ہوجاتی ہے تو ہم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خوشی کے جذبات کے تحت اس کا حال بالکل خلاف اور جداگانہ ہونا چاہئے۔

"مزدور خوش دل کند کار بیش"

ایک عام مثل ہے، جو شخص خوش رہتا ہے خوشیاں اس کے استقبال کو آتی ہیں، صحت کے لئے انسان کو مسرت اور خوشی کی ضرورت ہے اور خوشی صحت سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ذہنی اور دماغی توانائی کی اہمیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ توانائی انسان کی صحت کو برقرار رکھتی ہے اور سچ پوچھو تو انسانی زندگی کا دارومدار زیادہ تر توانائی ہی پر ہے لیکن اس توانائی کو اسی وقت کارآمد توانائی کہا جاسکتا ہے جب کہ وہ ذہنی اور دماغی کاموں کو بھی برقرار رکھے، وہی توانائی مفید توانائی

کھلائی جاسکتی ہے جس میں عصبی نظام کے فعل کو برقرار رکھنے کی قابلیت موجود ہو کیونکہ عصبی نظام ہی حقیقی معنوں میں انسان ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کے دیگر اعضاء سے عصبی نظام کو علحدہ کر لیا جائے تو پھر کوئی ایسی چیز نہیں رہتی ہے جس کو ہم انسان کہہ سکیں۔ توانائی کا اولین مقصد عصبی نظام کے فعل کو برقرار رکھنا ہے اس لئے کہ خیال، احساس، عضلات کی ارادی اور غیر ارادی حرکت سب کا تعلق اعصاب سے ہے اگر اعصاب ہی کام نہ کریں تو پھر نہ تو کوئی احساس پیدا ہوگا اور نہ کسی قسم کی عضلی حرکت ہوگی نیز تنفس اور دوران خون دونوں کا عمل بھی یک لخت بند ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

محض توانائی ہی دل و دماغ کو فائدہ نہیں پہونچا سکتی اس کے علاوہ دل و دماغ کو ایک خاص تربیت کی ضرورت ہے، تعلیم یافتہ دماغ، غیر تعلیم یافتہ دماغ سے بدرجہا تم کارآمد ہوتا ہے، حالانکہ دونوں ایک ہی قسم کے توانائی حاصل کرتے ہیں مگر فرق صرف تربیت کا ہے چنانچہ ایک تربیت یافتہ دماغ وہ کام کر سکتا ہے جو ہزار کیا لاکھ حمار بھی نہیں کر سکتے اس لئے ضروری ہے کہ انسانی دماغ کو اندرونی توانائی کے ساتھ ساتھ تربیت سے بھی متمتع کیا جائے۔ انسان کو اس معاملہ میں کافی دلچسپی لینی چاہئے ورنہ جانور اور انسان میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

سطور بالا میں ہم نے صحت کے چند عام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، انشاء اللہ کسی دوسری صحبت میں صحت انسانی کے دوسرے پہلوؤں سے بحث کریں گے۔ فی الحال اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

دعائے نوید

از

جناب محمد رحمت علی خاں صاحب نوید

فضل آصف پہ کبریا رکھے — نظر لطف مصطفےٰ رکھے
بس دعا ہے یہی نوید آمین — تا قیامت انھیں خدا رکھے

جذبات اخگر

از جناب حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب اخگر حیدرآبادی

اُٹھکے میرے پہلو سے ایک آگ لگا بیٹھے
اٹھے بھی تو کیا اٹھے بیٹھے بھی تو کیا بیٹھے

جز یاس نہیں کوئی پاس اپنی تمنا کے
یکدل تھا جو پہلو میں ہم کر کے فدا بیٹھے

یہ میری وفا کا خوں کچھ لطف شہادت ہو
دامن پہ ترے دھبہ قاتل جو ذرا بیٹھے

گو پاس نہ تھا کوئی پر ڈر تھا رقیبوں کا
بیٹھے بھی تو محفل میں وہ ہم سے جدا بیٹھے

تھا درد کوئی دل میں کیوں شیخ بھی اہ بھی
ہاتھ اپنے اُٹھا کر یوں پھر بہر دعا بیٹھے

کچھ بھی تو نہیں تھے ہم ہستی کا گماں کیسا
یک نقش توہم تھا جو کچھ کہ مٹا بیٹھے

بے پردہ کیا ان کو اس جوش جوانی نے
شوخی کا تقاضا تھا محفل میں وہ آ بیٹھے

اپنے میں نہ تھا کوئی کل بزم تماشا میں
وہ کھول کے سب اپنے جب بند قبا بیٹھے

وہ ناز کی شوخی میں یک مست تغافل تھا
ہم جوش جنوں میں کیوں عشق اپنا جتا بیٹھے

ہنگام شباب اور مئے چھوٹیگی بھلا کیوں
یک عالم مستی میں جب منہ سے لگا بیٹھے

چھپ سکتے ہیں کب اخگر وہ اپنے چھپانے سے
پردہ فقط اتنا ہے پردے میں وہ جا بیٹھے

وکیل بالجبر

از مولوی سید وزیر حسن صاحب

اس مضمون کے لئے ہم اپنے عنایت فرما مولوی محمد عبدالرحمٰن صاحب رئیس مدیر "متفنن" کے ممنون ہیں۔ ابتداً "متفنن" کے لئے لکھا گیا تھا مگر اس کے خشک اوراق اس لطیف مضمون کے متحمل اور مزون نہیں نکلے تو صاحب مضمون کی اجازت سے یہ "مجلۂ مکتبہ" میں اشاعت کے لئے دیدیا گیا۔ (مجلہ مکتبہ)

خدا وکیل بنائے وکیل کی صورت نہ بنائے!

دیکھئے! برا نہ مانئے گا! اس سے یہ مطلب نہیں کہ وکیل بیچارے میں فطرت بھی کسی نمایاں قسم کی تخریبی کا اضافہ کر دیتی ہے، تاکہ دوسرے جانداروں کی ضرب المثل خصوصیات کی طرح یہ بھی بھلائے نہ بھولے! میرا یہ مطلب یہاں وکیل بالجبر کی اس ہیئت قانونی سے ہے جو ضابطہ دیوانی کی طرح اجیرن، قانون شہادت کی طرح خشک! مختصر یہ کہ "وکیل محض" کی جامع و مانع تعریف ہو!!۔

ان مراتب ابتدائی کے بعد لیکن آگے بڑھنے سے پہلے لگے ہاتھ یہ توضیح بھی سنتے چلئے کہ "وکیل محض" کیا ہے؟ اور کن حالات میں یہ "وکیل بالجبر" بن جاتا ہے؟ اور نہ یاد رکھئے تعریف "مجہول بالمجہول" کے اصول سے اوپر کی ساری عبارت "قانون انتقال جائداد" کی طرح بے معنی ہو کر رہ جائیگی! اور وکیل کے ساتھ "بالجبر" کا لاحقہ کبھی آپ کی سمجھ میں بھی نہ آئیگا!!

اچھا! عام اس سے کہ مضمون یا سیاق عبارت اس کے خلاف ہو! "وکیل محض" سے مراد ایسا وکیل ہوگا جو چھ یا چھ سے زیادہ بچوں کا باپ ہو! یا جو بے اولاد، بن بیوی کے ایک مایوس الحال فلسفی نظر آئے! یعنی جس کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا، جاگنا کھانا، پینا غرض جملہ افعال ارادی و غیر ارادی بجائے فلسفہ کے قانون میں رنگ جائیں اور یہ باور کر لینے وجوہ ہوں کہ قانون کی خشکی دماغ سے متجاوز ہو کر اس کے منہ پر بھی آن پہنچی!

یہی کیس "وکیل بالجبر" ہوگا! اگر تنگی معاش یا بے حد لالچ دوسرے بیشوں سے تڑا کر بلا رضامندی اسے پیشہ وکالت کی طرف کھینچ لائے! یا سوء اتفاق سے ایک غفیل بیوی کا شوہر "بالجبر" یا دو جورو والا ہو! اور جو خلاف مرضی وکالت کی کڑی جھیلنے پر اسے آمادہ کر دیں!!

اس میں یہ خصائص بھی پائی جاتی ہیں کہ باتیں زیادہ بنائے، کام کچھ نہ کرے، کچھ کرے تو اس اہتمام سے کہ خرسٹا مدے سر ہو آگے نہ بڑھے! باتیں بنائے، تو دقائق تقریری کے پھول جھڑیں۔ خاموش رہے تو ان کی بھول بھلیوں میں بلا جبر وکراہ گم ہو جایا کرے! یعنی تنگی معاش غفیل بیوی، یا دو جوروں کی داب ناجائز سے آنکھوں پر قانون میں اتنا مہنک پایا جائے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہے! کلاہ مبارک پر دو دو انگل میل کی گوٹ لگ جائے! اور "پیچ" کے لحاظ سے اس کی بقیہ پوشش بھی ماشاء اللہ ہو! ڈاڑھی منڈاتا ہو تو دنوں استرے سے بے نیازی رہے! جبر سے ڈاڑھی دار ہو تو بال بال سے بدحواسی پڑی ٹپکے! غرض قانون کی حیثیت عرفی کا یہ ازالہ مجسم ہو! جو ایک دوالیہ مارواڑی، ناکام لیڈر، مقروض ملازم کی طرح نہ جینے کے لئے کبھی تیار ملے اور نہ اقدام خودکشی کے لئے!

اب سے دور ایک قانون کے طوطے سے نیاز حاصل ہوا تھا جو ایک غفیل بیوی کے کم سن دولہا تھے! گویا زد جائی سیبت سے وکیل بالجبر! قسمت کا مارا ایک کھاتے پیتے گھرانے کا بھولا نواب تھا جسے متاہل زندگی کی ٹھکیٹر نے کچل ڈالا کچھ بوہنی سی آبائی پونجی ورثہ میں ملی تھی۔ اسے اللے تللے سے کھائی بخت ہوئے! تو تنگی ترشی سے گزرنے لگی۔ بیوی پہلے ہی بلا کی جھلو واقع ہوئی تھیں۔ ناداری نے ہوا بنا دیا! رات دن میاں جی کی کندی اور آمدنی کی شکایت ہوتی رہتی۔ یہ گھبرائے گھبرائے چوطرف پڑے پھرتے! لیکن کوئی سبیل نظر نہ آتی۔ آخر بیوی صاحب نے ہی یہ مشکل بھی حل کی اور بے چارے کو وکیل بننے کا حکم ناطری دے دیا۔ یہ شامت کا مارا ایسے خاندان کا ایک ناتجربہ کار ممبر تھا جو بڑے بوڑھوں کے صدقے کہاتا پیتا یعنی مفت خوری کا عادی ہو اور جہاں جہالت ایک طرح کا استغنا سمجھا جائے۔ بھلا یہ پڑھنا لکھنا کیا جانے۔ ان گنوں کو سے تھے۔ وکالت میں لکھائی پڑھائی حوائج انسانی کی طرح ضروری ٹھیری! لیجئے! یہاں ورنڈے بارات دن قانون کی ٹائیں ٹائیں کرتے اور گھر سے کھاتے اگر تاب کے بیوی نے ایک دن دیکھا دو دن دیکھا تیسرے دن نکال باہر

کیا! عبرت کا مقام ہے، ایک بیوی والا یوں بے گھرابے در ہو جائے۔ ہر چند عزیز اقارب نے سمجھایا لیکن سنا ہے، وہ اللہ کی بندی نہ مانی۔ وہ نئی روشنی کی لڑکی تھی۔ اپنی ہمجولیوں کو سینما، تھیٹر، کلب اور جانے کہاں کہاں جاتا آتا دیکھتی اس لئے خود بھی ان کے قدم بہ قدم چلنا چاہتی تھی، بھلا ان کمبخت کو کس طرح پتیاتی۔ غرض یہ دونوں "خانہ بدر" رہے اور در جاتے عدالت کی دوسرے صورت دیکھتے چلے آتے! اور ایک دوست کے گھر پڑ رہتے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ گاتے گاتے انسان کلانوت ہو جاتا ہے! یہ بھی کچھ کم پنجے جھاڑ کر قانون کے پیچھے نہ پڑے تھے، اس لئے رٹتے رٹتے خاصے قانون بن گئے اتنے اور خصائص امتیازی بھی رسان رسان رچتی رہیں! مختصر یہ کہ ان تمام مراحل کے بعد کہیں بیچارے کو بہ رضا و رغبت "داخلت بہ خانہ" کی پروانگی ملی! سنا ہے اب خانگی چپقلش کے سوا خاصی اچھی گزر رہی ہے! پیشہ کے لحاظ سے بھی نام خدا دوم درجہ کے "وکلا بالجبر" میں شمار ہو گیا!!

قیاس چاہتا ہے (اس نوعیت کے نہ سہی!) اور بھی وکلا بالجبر ہوں گے، آنگلی معاش یا بے جا لالچ والے تو خیر نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں لیکن دوجائی "بالجبر" عموماً خفیہ ہوتے ہیں! یہ شاید ڈھونڈے ہی سے ملیں تو ملیں! احباب طریقت کو کھوج لگانے کی ضرورت نہیں! البتہ نگاہ رکھیں۔ ملتے جلتے اس بات کا خیال رکھ لیا جائے تو کافی ہے کہ حرکات سکنات، رفتار، گفتار کیا کہتی ہے۔ یعنی اس طرف تو اشارہ نہیں کہ "پس پردہ" بھی کوئی قوت کام کر رہی ہے!!

یہاں ذرا نظر اونچی کیجئے تو اور حقیقت کھلے۔ ایک وکیل ہی نہیں اور بھی "بالجبر" نظر آتے ہیں! یہ مصنف نہیں! قانون کی باتیں ہیں۔ ورنہ بتائیے کیا ضرور ہے کہ کارکنان "مقنن" اچھے خاصے آزاد ہو کر مجبور بنے جاتے ہیں! پھر یہ نزلہ متعدی ہے۔ خود تو جو کچھ بنے اپنے ہاتھوں بنے! مضمون نگاروں پر جبراً "جبر مجرمانہ" ہے کہ "مقنن" کے لئے لکھو جبراً لکھوا لکھنے بیٹھو تو یہ مشکل وہ کیا لکھو! نہ لکھو تو یہ ڈر کہ دیکھئے کب وارنٹ گرفتاری آتا ہے۔ غرض مضمون نگار "گو یم مشکل وگر نہ گویم مشکل" کا مصداق بنکر رہ جاتا ہے! کچھ اور کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی مزہ کی سیر تو یہ کہ حواج نظری رک جائیں تو رک جائیں لیکن طبیعت میں انقباض کی سند نہیں"

ثبوت لیجئے! پرسوں ایک دستم مضمون کی فرمائش ہوئی۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دو دن کی مہلت بھی تجویز کر دی گئی! آئندہ کی بہت سی توقعات کا بار الگ ہی رہا جس کے خیال سے جی گھبراتا ہے! بھلا اس زبردستی کا کوئی کیا جواب دیتا پھر معاملہ ٹھیرا قانون دان حضرات سے، جو ذرا ذرا سی بات پر بنا دین اور رہی سہی کسر پلا تا ہے۔ ناچار چپ ہو جانا پڑا۔ دوسرے دن ایک اور حکمنامہ پلا تا ہے۔

"توقع ہے کہ وکیل بالجبر آج تک پہنچ جائیگا!"

ایک کرم فرمانے تو سر راہ ہی آن لیا کہ حضرت مضمون؟ حضور طبیعت کا یہاں ابھی تک یہ عالم تھا کہ دو سطریں دو نقطے بھی اس مضمون کے شرمندۂ رقم نہ تھے! اب آپ ہی فرمائیے "تقاضائے بالجبر" تقاضائے سرشت سے بھی بڑھ گیا یا نہیں!

مضمون کی شرط بالجبر" سنئے! متقن کے لئے ہو اور مذاقیہ سے میل ہو! دوسرے الفاظ میں جس کے یہ معنے ہوئے کہ قانوناً ہنسئے! طبیعت کو قانون سے مناسبت کیا! کوسوں کی دوری! باز ہم ظرافت کی دیوی نے "وکیل بالجبر" کا پھڑکتا ہوا عنوان سجھا ہی دیا! لیکن آگے آفت تھی! کچھ نقطہ وکیل سے طبیعت میں خود بخود روک پیدا ہو گئی۔ کیونکہ خیال تھا مبادا مضمون کی بدولت عدالت کی شکل دیکھنی پڑے! اور مفت کی انجمن چھوڑ گھسیٹن ہو جائے۔ وجہ صاف تھی میں حسب ضابطہ نہیں ہنس سکتا۔ یہاں وکیل کے ساتھ "بالجبر" کا معاملہ تھا! جو نادانستہ کے ہاتھوں قانون باہر ہوتا پر ہوتا! نتیجہ ظاہر کہ غریب مضمون نگار کی تکا بوٹی ہو جاتی! چنانچہ اس ذمہ داری کو بھی بہ لطائف الحیل ٹالا گیا۔ اور اب ذریعہ ہنسا اعلان کیا جاتا ہے کہ اس مضمون کی اچھائی، برائی زیادتی، خامی، تحسین، مذمت عرض جملہ مالہ اور ماعلیہ کے بہ تمام و کمال صاحب متقن "ذمہ دار تھے، ہیں اور ہو گئے۔!!

کارکنان "متقن" برانہ مانیں۔ دوسرے پرچے بھی بڑی مزیدار فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ قانونی نہی تو خیر اتنی مشکل اور لائق باز پرس نہیں جتنی مذہبی نہی مشکل تر اور لایق گردن زدنی ہو سکتی ہے! تاہم ایک صاحب جو اعلاء کلمتہ الحق کے دعویدار اور ایک مذہبی پرچے کے مالک ہیں، کسی ملا سے نہیں، مولوی سے نہیں، راقم سے مضمون کی فرمائش ہیں پھر لطف خاص یہ کہ "شگفتہ" ہو! ان بزرگ سے کوئی پوچھے کہ حضرت! آپ کی ستم ظریفی کی بھی انتہا ہو گئی جو

مذہب میں یوں شگفتگی پیدا کر اکے بیٹھے بٹھائے ایک بے گناہ کو کافر بنانے پر آمادہ ہیں۔!
نہ جانے کب کی دشمنی ہے جو اس طرح کا مضمون لیکر نکال رہے ہیں! لیکن وہ ہزار تقاضہ کریں، یہاں بہ "ہوش وحواس" تہیہ کر لیا گیا ہے کہ انہیں نہیں تو کم از کم ان کے شگفتہ مضمون کو ضرور دور سے سلام کر دیا جائے!!

بہر حال جبراً یا قہراً وکیل بالجبر کے اصولی خصائص سے یہاں آپ علی الاعلان دوچار ہو گئے۔ اب ایسا بننا یا نہ بننا ظاہر ہے کہ بالکلیہ آپ پر ہی منحصر ہو جاتا ہے۔ "وکیل بالجبر" بننے کا ایسا ہی شوق ہو تو ہر گاہ قرین مصلحت ہو گا کہ آپ شوق فرمائیں! لیکن بلا محنتانہ ایک ناچیز مشورہ میرا بھی ہے! اتنا ضرور خیال رکھیئے گا کہ ایک ہیئت قانونی کم از کم آپ پر نہ چھائے! یعنی للہ

وکیل بنئے وکیل کی صورت نہ بنئے!!

غزل

از جناب سید ابراہیم صاحب خلیل حیدرآبادی

شگفتہ جس سے ہو دل وہ ہوا نہیں آتی — مرے چمن میں کرم کی گھٹا نہیں آتی
ہماری موت کا باعث ہے سہل انگاری — اگر وہ آتے تو اے دل قضا نہیں آتی
ہے دوڑ دھوپ عبث چارہ ساز صبر کریں — مریض ہجر کو راس اب دوا نہیں آتی
شب فراق میں آتی اجل مزا آتا — ہمارے کام یہ کالی بلا نہیں آتی

مجاز آئینہ حق ہے یہ غلط ہے خلیل
تجھ کے عشق میں یاد خدا نہیں آتی

کوہستانی دوشیزہ

از جناب سید علی صاحب متعلم نظام کالج

ذرا دیکھئے! اس کوہستانی دوشیزہ کو، کھیت میں اکیلی فصل کاٹ رہی ہے اور تنہا گا رہی ہے، یہاں ذرا ٹھہر جائیں یا آہستہ آہستہ چلیں، وہ بالکل اکیلی ہے اور تن تنہا فصل کاٹنے اور اکٹھا کرنے میں مشغول ہے ایک درد بھری راگنی گا رہی ہے! سنئے وادی کی ساری خاموش فضا اس کی درد انگیز اور پرسوز آواز سے لبریز ہو گئی ہے۔

کیا کوئی ایسی شیریں نوا بلبل بھی ہوگی جس نے اتنے خوش آیند نغمے سنائے ہوں اور عرب کے تپتے ہوئے ریگستان میں تھکے ماندے قافلوں کو نخلستان کے نیچے اپنے ترانوں سے خوش کیا ہو؟ موسم بہار میں کیا کسی نے اس کوئل کو بھی ایسی دل آویز لے میں گاتے ہوئے سنا ہے جو اپنی نوا سنجی سے جھنڈ ہائے ہیبر یڈیز کے سمندروں کی سکوت پرور فضا میں تلاطم برپا کر دیتی ہے؟

کیا کوئی مجھے ان نغموں کے مطلب پنہان سے آگاہ کریگا؟ میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس الم انگیز گیت میں کوئی قدیم دکھ بھری کہانی ہے یا ان بھلائی ہوئی عظیم الشان لڑائیوں کا ذکر ہے جو اس دوشیزہ کے ملک میں ہوئی تھیں یا آئے دن کے معمولی حادثات کا مذکور ہے یا کسی ایسے غم، درد، یا مفارقت کی بپتا ہے جو قدرت کی جانب سے گزری ہو اور جو پھر گزر سکتی ہے۔

خیر اس دوشیزہ کی نغمہ سرائی کا جو کچھ بھی مطلب ہو، لیکن اس کی پرسوز لے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے میں نے اس کو درانتی لئے ہوئے مصروف کار اور محو ترنم دیکھا ہے میں بے حس و حرکت اور خاموش کھڑا ہوا سن رہا تھا۔

وہ لطیف ترنم میرے دل کی گہرائیوں میں اب تک دفن ہے اگرچہ اس کو سنے ہوئے طویل مدت گزر گئی۔

(ورڈسورتھ)

*

تخیلاتِ عفو

جناب مولانا سید شاہ ابراہیم صاحب عفو مرحوم

تجھ پہ اے جان و دل و جان سے قربان ہوں میں
یعنی خمیازہ کشِ کاوشِ پنہاں ہوں میں

دل میں کیا آرزو ہے مرنے پہ پوچھ اے ہمدم
سر سے پا تک ہمہ تن صورتِ ارماں ہوں میں

ہے خیالات پریوش کا اکھاڑہ دل میں
پاک باطن ہوں مگر رشکِ سلیماں ہوں میں

داغِ ہائے دلِ پرخوں کی تماشا ہے بہار
گویا اس صحن میں رنگین چمنستاں ہوں میں

ہوں تو قطرہ پہ گہر آنکھ چراتے مجھ سے
پرورشِ یافتۂ دامنِ عرفاں ہوں میں

بت کافر نظرِ غیظ سے دیکھیں گے مجھے
جرم بس ہے یہی یعنی مسلماں ہوں میں

حشر میں بیگنہی میری تھی اک جرمِ عظیم
للہ الحمد کہ آلودۂ عصیاں ہوں میں

کیا مرے مذہبِ ملت کا ٹھکانا اے عفو
کافرِ عشق ہوں اور بندۂ ایماں ہوں میں

مولانا شجاع الدّین رح

از

جناب مولوی کامل میر مظہر علی صاحب وکیل

مولانا حافظ قاری شجاع الدین حسین قادریؒ، حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری قدس سرہٗ کے خلیفہ ہیں۔ جید آبادِ دکن کے مشائخ عظام اور علمائے کرام میں ان دونوں بزرگواروں کو ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے، مولوی امیر اللہ صاحب قندھاری (برادر حضرت فضیلت جنگؒ) نے "مناقب شجاعیہ" کے نام سے ۱۳۰۶ھ میں مولانا ئے ممدوح کے حالات لکھے تھے سلسلۂ کلام کے لئے پہلے حصہ میں مولانا رفیع الدینؒ کے حالات بھی بیان کئے میں ضرورت تھی کہ ان دونوں حضرات کے مفصل حالات سے قوم اور ملک کو روشناس کرایا جائے۔ مولانا شاہ رفیع الدینؒ کے حالات تو "مکتبۂ ابراہیمیہ" کی مطبوعات کے سلسلہ میں شایع ہو چکے ہیں اب ہمارے فاضل دوست مولوی میر مظہر علی صاحب نے جو اسی خاندان کے ایک رکن ہیں اس کی طرف توجہ کی ہے۔

مولانا شجاع الدینؒ کے تعارف کے لئے ان کی ایک کتاب "کشف الخلاصہ" کا نام لے لینا بہت کافی ہے۔ اس کتاب نے نہ صرف دکن میں مقبولیت حاصل کی بلکہ سارے ہندوستان کے مدارس اسلامی میں بھی اپنی جگہ نکال لی۔ (مجلۂ مکتبہ)

سلسلۂ نسب اور خاندانی حالات

میر شجاع الدین حسین ابن سید کریم اللہ ابن میر محمد حایم ابن میر شاہ مرزا، ابن میر کریم اللہ، ابن میر عبد اللہ، ابن میر محمد امین، ابن میر جمال الدین، ابن میر اعراق، ابن میر ارتاق، ابن میر شاہ کوچک، ابن خواجہ حسن، ابن خواجہ حسین، ابن خواجہ احمد یسوی، ابن شیخ، ابن محمود شیخ، ابن افتخار شیخ، ابن عمر شیخ، ابن عثمان شیخ، ابن اسمٰعیل شیخ، ابن موسیٰ شیخ ابن یونس شیخ، ابن ہارون شیخ، ابن اسحٰق باب، ابن عبد الرحمٰن، ابن عبد الفتاح، ابن عبد الجبار، ابن عبد الفتاح ابن الامام محمد بن حنفیہ ابن امیر المومنین

سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ شجرہ سے ظاہر ہے کہ آپ محمد بن حنفیہ کی اولاد سے ہیں آپ کے اجداد میں حضرت خواجہ احمد یسوی بڑے معروف و مشہور بزرگ ہیں یہ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے شیخ باب ارسلانؒ نے حسب الارشاد جناب رسالت پناہ آپ کو علوم باطنی کی تعلیم دی شیخ صاحب کے انتقال کے بعد آپ بخارا میں آکر خواجہ یوسف ہمدانیؒ کے مرید ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا اور اپنے مرشد کے انتقال کے بعد خود مسند ارشاد پر تشریف فرما ہوئے۔ اکثر مشائخین ترک آپ ہی سے انتساب رکھتے ہیں ہزارون طالبان حق نے آپ سے استفادہ کیا آپ نے ۵۶۲ھ میں وفات پائی۔ مزار قصبۂ یسی میں ہے۔ مولانا کی ساتویں پشت کے دادا میر جمال الدین عہد اکبری میں وارد ہندوستان ہوئے آپ کا علم و فضل کی وجہ سے صوبۂ مالوہ کی قضائت پر تقرر ہوا آپ کے بعد پانچ پشت تک آپ کی اولاد نے اپنی قابلیت و لیاقت سے اس جلیل القدر عہدہ کے فرائض انجام دئے۔ مولانا کے دادا امیر محمد دائم (ولادت ۱۱۳۱ھ) کو ابتدا سے تحصیل علوم کا بیحد شوق تھا چونکہ اس زمانہ میں دہلی تمام علوم و فنون کا مرکز تھی اس لئے شوق کی تکمیل کے لئے آپ دہلی تشریف لے گئے اور غیر معمولی ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے چودہ سال کی عمر میں معقول و منقول کی تحصیل کی۔ اسی تعلیمی سلسلہ میں آپ کو مرزا بیدلؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل ہوا اسی زمانہ میں نواب ناصر جنگ بہادر فرزند نواب آصفجاہ بہادر بھی مرزا صاحب کے پاس آیا کرتے تھے یہیں میر محمد دائم کی نواب صاحب موصوف سے ملاقات ہوئی کچھ عرصہ کے بعد آپ کا رابطہ ضبط محبت کی حد تک بڑھ گیا۔ اسی زمانہ میں آپنے شاہ یار محمد صاحبؒ خلیفہ حضرت نظام الدین ثانیؒ سے علم باطن کی تعلیم پاکر چند طریقوں میں آپ سے خلافت بھی حاصل کی اور علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کے بعد درویشانہ لباس میں اپنے وطن کی جانب مراجعت کی آپ کے والد شاہ مرزا صاحب بقید حیات تھے اپنے فرزند کی فقیرانہ طرز دیکھکر آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس درویشانہ لباس میں رہکر فقیری میں اوقات بسر کروگے تو پھر تمہارے خاندان کی پرورش کون کریگا میں تم کو آزردہ کرنا نہیں چاہتا مگر مناسب یہ ہے کہ ظاہرا دنیاوی لباس میں رہکر اپنے آباو اجداد کے طرز طریق کے پابند ہو اور باطنا فقیرانہ مشاغل میں مصروف رہو۔ چنانچہ میر محمد دائم نے اپنے والد بزرگوار کی نصیحت کے موافق ایسی ہی روش اختیار کی۔ حضرت میر شاہ مرزا کے انتقال کے بعد کسی نے محمد شاہ بادشاہ سے یہ عرض کردیا کہ میر محمد دائم کم عمر ہیں یہ عہدۂ قضائت کی انجامدہی کے قابل نہیں ہیں بجائے ان کے کسی اور کا تقرر ہو تو بہتر ہے اسکی

خبر پاکر حضرت میر محمد دائم خود محمد شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے محمد شاہ نے آپ کے علمی تبحر کی وجہ سے متاثر ہو کر آپ کو اپنی موروثی خدمت پر مستقل کر دیا۔ اسی زمانہ میں نواب آصفجاہ بہادر نے دکن کا رخ کیا برہان پور و حسن پور فتح کر کے اسی نواح میں ایک عرصہ تک اقامت کی۔ میر محمد دائم کے علم و فضل کی عام شہرت تھی جس کی وجہ سے نواب آصفجاہ بہادر نے میر صاحب کا صوبۂ مالوہ سے برہانپور کی قضاوت پر تبادلہ فرمایا اس خدمت کو میر صاحب نے اپنی غیر معمولی قابلیت سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

نواب آصفجاہ بہادر اپنے آخر زمانہ میں برہانپور ہی میں مقیم تھے یہیں آپ کا سلسلہ علالت شروع ہوا اور روز بروز ناتوانی بڑھتی گئی یہاں سے آپ زین آباد تشریف لے گئے اور کچھ دنوں یہاں اقامت کی پھر یہاں سے کوچ فرمایا اثنائے سفر میں جب آپ موہن نامہ کے قریب خیمہ زن ہوئے تو مزاج اور بگڑا بالآخر ۱۹ جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ میں آپ نے رحلت فرمائی اور حضرت[1] برہان الدین[2] اولیا کے روضہ میں مدفون ہوئے۔ نواب آصفجاہ بہادر کے انتقال کے بعد نواب احمد علی خاں ناصر جنگ بہادر تخت نشین ہوئے تو تمام عہدہ دار نذر جلوس پیش کرنے کے لئے اورنگ آباد آنے لگے اس وقت میر محمد دائم بھی اپنے فرزند سید کریم اللہ کو ہمراہ لے کر اورنگ آباد پہنچے اور حضور میں نذر گذرانے کا شرف حاصل کیا۔ نواب ناصر جنگ بہادر میر صاحب سے اچھی طرح واقف تھے فوراً پہچان گئے مگر امتداد زمانہ کی وجہ سے مقام ملاقات یاد نہیں تھا اس لئے آپ نے استفسار فرمایا۔

"شمارا کسے جاہ بدیدایم"

جواب میں میر صاحب نے عرض کیا کہ :۔

"بلے حضور در خانۂ مرزا بیدلؒ"

اس کے بعد دریافت فرمایا کہ کتنی اولاد ہے میر صاحب نے کہا کہ ایک لڑکا ہے جو ہمراہ حاضر ہے

---

[1] برہان پور کو نصرت خاں فاروقی نے حضرت برہان الدین اولیا کے نام نامی سے منسوب کر کے ۸۰۱ھ میں آباد کیا اور اسی کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔

[2] حضرت شیخ برہان الدین غریب عرف برہان الدین اولیا۔ آپ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے اپنے مرشد کے حسب الارشاد چار سو فقیروں کو ہمراہ لیکر سلطان محمد تغلق کے عہد سلطنت میں دولت آباد تشریف لائے اور یہیں آپ نے اقامت کی ۷۴۳ھ تک آپ بقید حیات تھے۔

چنانچہ سید کریم اللہ نے نذر پیش کی جس کو صفدر نے قبول فرما کر دونوں کو دربار میں حاضر رہنے کا حکم دیا۔ میر صاحب کا نواب صاحب پر خاص اثر تھا کوئی کام میر صاحب کے مشورہ کے بغیر انجام نہیں پاتا تھا۔ میر صاحب اپنے زمانہ کے بڑے فاضل اور علامہ تھے بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی متعدد تصانیف ہیں مگر افسوس ہے کہ باوجود تلاش و تفحص کوئی تصنیف دستیاب نہ ہو سکی۔

سید کریم اللہ ۱۱۲۹ھ میں تولد ہوئے اور اپنے فاضل باپ کے زیر اثر تربیت پائی یہ بھی بڑے ذکی اور جید عالم تھے نواب ناصر جنگ بہادر نے ان کی خوب قدر کی خاں بہادر کا خطاب معہ لوازمہ عطا کر کے پائیگاہ خاص کی خدمت سے سرفراز فرمایا جب ناصر جنگ بہادر نے ۱۱۶۱ھ میں افغانوں کے ہاتھ کرنول کے معرکہ میں شہادت پائی اور سلطنت میں انقلاب پیدا ہوا تو پائیگاہ کی خدمت بھی باقی نہ رہی بجز قلیل معاش کے تمام معاشیں مسدود ہو گئیں تو دونوں برہان پور واپس آئے اور تھوڑی سی معاش میں نہایت وضعداری اور نامعدی سے بسر کرتے رہے۔ نواب سید کریم اللہ خاں بہادر کا سن ساٹھ سال کا ہو چکا تھا مگر اب تک آپ نے شادی بیاہ نہ کیا تھا ایک روز آپ نے خواب میں دیکھا کہ برہانپور میں دفعتاً تیز ہوا چلی اور شہر کے تمام چراغ گل ہو گئے مگر ایک جامع مسجد کا چراغ روشن رہا اس خواب کی تعبیر یہ تجویز ہوئی کہ آپ کو ایک نیک نہاد فرزند ہوگا جس سے تمام خلائق مستفید ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی رائے قرار پائی کہ کوئی ایسی لڑکی تلاش کی جائے جس کے خاندان کا تعلق کسی نہ کسی طرح جامع مسجد برہانپور سے ہو۔ اتفاقاً آپ کے ایک عزیز خواجہ محمد صدیق عرف مولوی غلام محی الدین متولی جامع مسجد برہانپور نے اپنی دختر کی جن کی عمر (۲۹) سال کی ہو چکی تھی لیکن کہیں پیام نہیں ہوا تھا انہی سے نسبت ٹھہرائی اور سید کریم اللہ خاں بہادر کی شادی مولوی غلام محی الدین کی دختر نیک اختر مسماۃ عارفہ بیگم سے ہو گئی صاحب مناقب شجاعیہ نے عارفہ بیگم کی عمر شادی کے وقت (۴۰) سال بتلائی مگر صاحب گلزار آصفیہ نے (۲۹) سال کی لکھی ہے اور صحیح یہی ہے کیونکہ آپ کی ولادت ۳ صفر ۱۱۶۱ھ کی ہے اور شادی ۱۱۹۰ھ میں ہوئی اس حساب سے شادی کے وقت آپ کی صحیح عمر (۲۹) سال ہی ہوتی ہے

مولانا شجاع الدین کی ولادت

شادی سے ایک سال بعد بتاریخ ۴ محرم ۱۱۹۱ھ روز چہار شنبہ مولانا پیدا ہوئے آپ کی ولادت کا عجیب واقعہ ہے جب آپ کی والدہ حاملہ ہوئیں تو بعض اقارب کو جو درحقیقت عقارب تھے بہت ہی ناگوار گذرا انہوں نے ایک ساحر سے یہ قرارداد کی کہ وہ اپنے عمل کے

زور سے کوشش کرے کہ اولاد ناقص الخلقت اور مردہ پیدا ہو اس کے عوض ایک کثیر رقم اس ساحر کو دینے کا وعدہ کیا چنانچہ جب مولانا تولد ہوئے تو آپ کے ساتھ ایک مردہ توام بھی پیدا ہوا اس پر ان عزیزوں نے اپنی بے حد ناکامی محسوس کی اور ساحر کو برا بھلا کہا لیکن ساحر نے ان کو سمجھایا کہ بچہ عموماً ایک ہی پیدا ہوتا ہے اس خیال سے میں نے ایک ہی پر سحر کا اثر ڈالا تھا یہ مجھکو معلوم نہ تھا کہ مردہ بچے کے ساتھ ایک اور صحیح وسالم بچہ بھی پیدا ہونیوالا ہے۔

مولانا کی ولادت کے دوسرے سال ۱۲ محرم ۱۲۹۲ھ روز جمعہ کو آپ کے والد نواب سید کریم اللہ خاں بہادر نے (۶۳) سال کی عمر میں رحلت کی۔

مولانا شجاع الدین کی تعلیم و تربیت

جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے صغیر سنی ہی میں مولانا کے سر سے اپنے شفیق باپ کا سایہ اوٹھ چکا تھا اب آپ کے عزیز دن میں آپ کے نانا مولوی غلام محی الدین کے سوا اور کوئی ہستی ایسی نہیں رہی تھی جو خاص توجہ اور ہمدردی کے ساتھ آپ کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیتی مولوی غلام محی الدین بڑے عالی خاندان تھے آپ کے دادا حضرت خواجہ ہاشم قدس سرہٗ مشہور بزرگ ہیں۔ آپ ۱۱۳۸ھ میں پیدا ہوئے بڑے قابل اور جید عالم تھے۔ جامع مسجد برہانپور کی تولیت آپ ہی کے نام تھی۔ مولانا نے اپنے نانا صاحب کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ صرف و نحو اور دوسرے علوم مروجہ کی درسی کتابیں بھی آپ ہی سے پڑھیں۔ آپ نے اپنے اکلوتے اور ہونہار نواسے کی تربیت و تعلیم کا خاص اہتمام رکھا خود آپ نے بھی تعلیم اور تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور برہانپور کے علما و فضلا سے بھی تعلیم دلوا کر کم سنی ہی میں مولانا کو لائق و فاضل بنا دیا۔ مولوی غلام محی الدین نے ۱۵ شوال ۱۲۰۲ھ روز یکشنبہ کو وفات پائی۔

مولانا نے قدرتاً بڑی ذکی طبیعت پائی تھی جس کتاب کا مطالعہ فرماتے اس کے معانی و مطالب پر بہت جلد حاوی ہو جاتے۔ اسی زمانہ میں آپ نے قرآن مجید بھی حفظ کر لیا تھا اور فن تجوید کی بھی تکمیل کی تھی۔ اس فن میں آپ کو اتنی دستگاہ حاصل تھی کہ جس قرأت میں قرآن شروع فرماتے آخر تک اسی قرأت میں بلا تکلف پڑھتے صاحب "مناقب شجاعیہ" نے لکھا ہے کہ وکیل خانصاحب بیان کرتے تھے کہ میں نے قرآن مجید کے متشابہات اور وقف و مد وغیرہ کو خوب یاد کر کے بتحانا حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کا قرآن سنا مگر آپ کا حفظ اتنا پختہ اور تجوید اتنی صحیح تھی کہ کسی جگہ ذرا بھی فرق نہیں ہوتا تھا۔ عربی زبان پر آپ کو کامل عبور تھا نظم و نثر بے تکلف لکھتے تھے

آپ کے متعدد خطبوں کو جو عربی نظم و نثر دونوں میں ہیں اور آپ کے دیگر عربی قصائد کو دیکھنے سے آپ کی عربی ادبیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اسی طرح فارسی میں بھی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اس زبان میں بھی بے تکلف نظم و نثر لکھتے تھے۔ آپ کے متعدد فارسی رسالوں اور خطبوں اور غزلوں کے مطالعہ سے آپ کی فارسی قابلیت کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اردو تو آپ کی مادری زبان تھی اس میں بھی نظم و نثر خوب لکھتے تھے مختصر یہ کہ قدرت نے آپ کو متعدد زبانوں اور مختلف علوم میں کافی مہارت عطا فرمائی تھی اور ایسا ذوق سلیم اور ذہن رسا دیا تھا جس کی وجہ سے آپ نے ہر فن میں مرتبہ کمال حاصل فرمایا چنانچہ متعدد تصانیف آپ کے غیر معمولی تبحر اور علمی معلومات کے بین ثبوت ہیں۔

آپ کی ہر زبان کی تصنیفات کا آخر میں تفصیل وار ذکر کیا جائیگا جس سے علمی میدان میں آپ کا جو مرتبہ ہے وہ صاف روشن ہو سکیگا۔

مولانا کی شادی

یقینی طور سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس عمر میں آپ کی شادی ہوئی، صاحب "مناقب شجاعیہ" لکھتے ہیں کہ جب آپ کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوئی تو آپ والدہ صاحبہ سے اجازت لیکر اور بیوی سے مہر معاف کرو اکر حج کو روانہ ہوئے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج کو جانے سے پہلے آپ کی شادی ہو چکی تھی لیکن حج کو جاتے وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ صاحب مناقب شجاعیہ نے سترہ یا اٹھارہ سال، اور مورخ تاریخ برہانپور نے بیس سال مولف گلزار آصفیہ نے چھبیس سال کی عمر میں آپ کا حج کو جانا لکھا ہے۔ لیکن یہ اختلاف اس طرح رفع ہو جاتا ہے کہ جیسے اوپر بیان کیا گیا۔ آپ ۱۱۹۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۶ھ میں وارد بلدہ ہوئے اس حساب سے جس وقت آپ بلدہ تشریف لائے آپ کی عمر پچیس سال کی تھی یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ حج سے واپس آنے کے بعد ہی آپ بلدہ تشریف لائے ہیں اس لحاظ سے یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ۱۲۱۵ھ میں حج کا قصد کیا اور اس وقت آپ کی عمر (۲۴) سال کی تھی بہ لحاظ اس کے اغلب قرینہ یہ ہے کہ (۲۱) یا (۲۲) سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی ہوگی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کا نام انور بیگم خانان کا سنہ پیدائش ۱۱۹۶ھ ہے۔

زیارت حرمین

(۲۴) سال کی عمر میں ایک عزیز کی رفاقت سے مولانا نے حج کا قصد فرمایا اور بندر سورت سے جہاز پر سوار ہو کر راہی حجاز ہوئے۔ اس سفر میں زاد راہ کے سوا کچھ بھی آپ کے پاس نہ تھا یہاں تک کہ ایک لباس کے سوا دوسرا لباس بھی

موجود نہ تھا چنانچہ اثنا ءراہ میں جب آپ کا پاجامہ بوسیدہ ہو گیا تو دوسرا پاجامہ نہ ہونیکی وجہ سے آپ نے رومال سے پاجامہ کی ایک موزون وضع بنائی تھی اس سفر سے آپ کی انتہائی دینداری اور عقیدت کا پتہ چلتا ہے باوجود تنگدستی کے آپ نے اسلام کے ایک رکن اعظم کی تکمیل کا قصد فرمایا اور شوق و محبت کے جوش میں قلت زاد راہ کی وجہ سے جن سختیوں اور مصیبتوں کا سامنا ہونے والا تھا ان کی کچھ بھی پروانہ کی۔

حیدرآباد کی جانب روانگی

حج سے واپس آنے کے بعد نواب فتح الدولہ جاگیردار چتیاپور و تانڈور نے جو ننہیال کی طرف سے مولانا کے عزیز ہوتے تھے حیدرآباد طلب کیا چونکہ برہانپور میں مولانا کے نانا صاحب کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور گذر بسر کے لئے کافی معاش بھی نہ تھی اس لئے آپ نواب صاحب موصوف کی طلبی پر ۱۲۱۶ھ میں فائز بلقیس ہوئے۔

عزت یار خان بہادر صدر الصدور سے تلمذ

بلدہ آنے کے بعد مولانا نے نواب فتح الدولہ بہادر کے مکان میں اقامت اختیار کی نواب صاحب موصوف دنوں اپنی جاگیر تانڈور میں تھے ان کے واپس آنے تک آپ نے بیکار رہنا پسند نہیں کیا بلکہ اس مدت میں نواب عزت یار خاں بہادر صدر الصدور سے صحاح ستہ کی سند حاصل کی۔

تقرر معاش

نواب فتح الدولہ بہادر نے نواب[۲] فخر الدین خاں شمس الامراء امیر کبیر سے مولانا کی خاندانی شرافت اور آپ کے علمی تبحر کا ذکر کیا نواب امیر کبیر نے

---

[۱] عزت یار خان محی الدولہ صدر الصدور کے والد کا نام حکیم اکمل تھا حکیم جعفر خاں تھا آپ غفران مآب کے مقرب اور حکیم خاص تھے حضرت غفران مآب نے علمی تبحر کی وجہ سے آپ کو شہر کا محتسب اور صدر الصدور مقرر فرمایا تھا۔ عزت یار خاں بہادر نے اپنے والد کی زندگی ہی میں علوم نقلی و عقلی، ریاضی، طب وغیرہ کی تکمیل کر لی تھی والد بزرگوار کے انتقال کے بعد علاوہ خدمت احتساب و صدارت پر کارگذار رہنے کے حضرت غفران مآب کے معالج خاص بھی تھے۔ آپ کو فن طب، ریاضی میں کمال حاصل تھا عربین شریفین کے نامور محدثین سے حدیث کی تحقیق کر کے آپ نے اس فن میں بھی کمال حاصل کیا تھا ۱۲۳۹ھ میں مہدوی افغانوں کے ہاتھ آپ نے شہادت پائی۔ مزار دریچہ بودلے صاحب کے باہر صوفی صاحب کے دائرہ میں واقع ہے۔

[۲] ابو الفخر فخر الدین خاں امام جنگ خورشید الدولہ خورشید الملک شمس الامراء شمس الملک ابو الخیر خاں شمس الامراء ثانی امیر کبیر فرزند ابو الفتح خاں المخاطب بہ ابو الخیر خاں ثانی تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء اول۔ آپ پائیگاہ کے مشہور امیر ہیں۔ ۱۵ رمضان ۱۱۹۵ھ کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور یہیں آپ نے تعلیم پائی۔ بڑے خلیق، رحمدل، مدبر، علم دوست اور صاحب فن کے قدردان تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں انتقال کیا۔

بڑے شوق کے ساتھ آپ سے ملاقات کی اور پچاس روپیہ ماہوار آپ کے نام جاری کیا۔ اس معاش کے تقرر کے بعد مولانا نے اپنے اہل وعیال کو برہانپور سے بلدہ طلب فرمالیا لیکن صاحب گلزار آصفیہ کا بیان ہے کہ برہانپور سے بلدہ آتے ہوئے آپ خود اہل وعیال کو اپنے ہمراہ لائے تھے۔

تحصیل علم باطن

مولانا نے علوم ظاہری معقول ومنقول کی پہلے ہی سے تکمیل کرلی تھی اور معاش سے بھی ایک گونہ اطمینان ہوچکا تھا اب آپ کو علم باطن کی تحصیل کا خیال ہوا اس شوق میں آپ حضرت[1] شاہ رفیع الدین قدس سرہٗ کی خدمت میں قندھار پہنچکر چھ مہینے تک اس علم کی تحصیل میں مصروف رہے۔ صاحب مناقب شجاعیہ نے بیان کیا ہے کہ شاہ صاحب کے باورچی خانہ سے آپ کو دو وقت "جوار کی روٹی اور انبار ڈے کی بھاجی" دیجاتی تھی۔ ساگ آپ لوگوں کو دیدیا کرتے اور روٹی صرف نمک سے تناول فرماتے اس ریاضت شاقہ سے چھ مہینے میں مولانا نے شاہ صاحب سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور قندھار سے رخصت ہوکر بلدہ کو واپس تشریف لائے

جامع مسجد بلدہ[2] کا قیام

یہ مسجد قطب شاہی عہد کی یادگار ہے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں چارمینار، پرانے پل کے ساتھ

---

[1] حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری سید ناعمر فاروقؓ کی اولاد سے ہیں آپ بروز پنجشنبہ بتاریخ ۱۹ جمادی الثانی ۱۱۶۴ھ بمقام قندھار تولد ہوئے معقول ومنقول میں کمال رکھتے تھے شعر وسخن کا بھی شوق تھا قدرت اللہ لمیح سے آپ نے اصلاح لی ہے۔ حضرت خواجہ رحمت اللہ نائب رسول اللہ صلعم سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ آپ بڑے عابد، زاہد، متقی تھے تفرات مکیہ وغیرہ اکثر کتابیں آپ نے لکھی ہیں۔ ۱۵ رجب ۱۲۱۵ھ میں رحلت کی مزار قلعہ قندھار میں ہے۔ آپ کے مفصل حالات مولوی عبدالغفار صاحب عابدی نے مرتب کئے ہیں اس کتاب کا نام شاہ رفیع الدین قندھاری ہے۔ مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

[2] جامع مسجد بلدہ چارمینار کے مقابل شمالی سمت میں واقع ہے یہ مسجد ۱۰۰۰ھ میں بعہد سلطان محمد قلی قطب شاہ خاص الف خاں بہادر میر جملہ، امین الملک کے اہتمام سے تیار ہوئی اس کی تعمیر میں دو لاکھ روپیہ خرچ ہوئے۔ مسجد سے ملحق خانقاہ، حلم مدرسہ بھی تھا جو اب خراب ہوگیا ہے مسجد پر دو کتبے نصب ہیں۔ پہلا خط نستعلیق صدر دروازہ پر سنگ سیاہ میں کندہ ہے۔ اس کا طول سات فٹ اور عرض دو فٹ ہے۔ اس پر بادشاہ وقت کا نام محذوف میر جملہ وزیر کا نام موجود ہے۔ اس کتبہ کا تاریخی مصرع "ہے عالی بنائے خیر گوئی" ہے لیکن اس سے ۱۰۴۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ دوسرا کتبہ محراب عبادت پر بطرز توقیع نہایت پاکیزہ ثلث خط میں کندہ ہے۔ پہلو دن کے کتبہ کا طول وعرض ۱۲ × ۱ فٹ ۵ انچ عریض ہے اس پر سیقول السفہا، ویکون الرسول علیکم۔ وما کان اللہ لیضیع۔ آیات قرآنی کندہ ہیں۔ جمال الدین حسین بن جلال الدین محمد الغفار الشیرازی اس کا کاتب ہے۔ گلبرگہ کی ناتمام مسجد کے بعد یہ دکن کی قدیم ترین مسجد سمجھی جاتی ہے۔ میر عباس علی خاں اصفہانی المتخلص بہ مشتاق حضرت مغفرت منزل نے اپنے صرفہ سے اسکی از سر نو تعمیر کرائی ہر طاق ورواق میں چونے کی کیٹھ نصب کرایا تھا۔

تعمیر ہوئی۔ اس زمانہ میں مسجد بالکل خستہ حالت میں تھی صوبہ مغل صاحب کا ہاتھی جن کا مکان مسجد کے دروازہ کے روبرو تھا مسجد کے صحن میں باندھا جاتا تھا اور مسجد کے اندرونی حصہ میں میانہ، پالکی، عماری رکھی جاتی اور حوض میں ہاتھی کا چارا بھرا جاتا تھا ایسی افتادہ حالت میں مسجد میں نہ تو نماز ہی ہوتی تھی اور نہ اذان۔ مولانا نے ابتداً مسجد کے ایک گوشہ کو صاف کر کے اسی میں نماز پڑھنی شروع کی۔ جب آپ نواب فتح الدولہ کے مکان میں مقیم تھے تو صبح جامع مسجد تشریف لاتے نماز فجر و اشراق سے فارغ ہو کر واپس ہوتے پھر ظہر کو تشریف لا کر عشاء کے بعد مراجعت فرماتے۔ رفتہ رفتہ آپ کے فضل و اتقا کی شہرت ہونے لگی اور عوام و خواص آپ کی بزرگی کا شہرہ سنکر فیض صحبت سے مستفید ہونے کے لئے حاضر ہونے لگے۔ نواب عزیز یار خاں بہادر صدر الصدور نے نواب[۵] میر الملک بہادر اور راجہ چندلال[۵] بہادر سے مولانا کی قابلیت اور بزرگی کا ذکر فرمایا جس پر یہ اصحاب ایک دفعہ ملاقات کے لئے جامع مسجد[۶] اور مسجد کی ناگفتہ بہ حالت دیکھکر صوبہ صاحب کو یہ مجلت ممکنہ ہاتھی اور سامان وغیرہ نکالنے اور مسجد کو صاف کرنے کا حکم دیا چنانچہ بہت جلد مسجد مع حوض و صحن درست کر کے صاف کر دی گئی۔ واپسی کے وقت نواب میر الملک بہادر نے مولانا سے عرض کی کہ اگر ارشاد ہو تو مسجد میں حجرے تیار کروا دئے جاتے ہیں جس کو مولانا نے منظور فرمایا اسی زمانہ میں لکڑ کوٹ تیار ہو رہا تھا اسی کی تعمیر میں سے چوبینہ وغیرہ بھجوا کر نواب صاحب موصوف نے مدرسہ میں حجرے بنوا دیے جس کی وجہ سے طلبا و مدرسین کے قیام

---

[۵] امیر الامرا میر الملک بہادر، نواب امیر جنگ بہادر کے تیسرے فرزند ہیں حضرت غفران مآب کے عہد میں آپ منصب پنجہزاری خدمت بخشی گیری علم افتخارہ اور میر الملک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ آپ میر عالم بہادر کے داماد تھے حضرت مغفرت منزل کے عہد میں میر عالم بہادر کے انتقال کے بعد خدمت دیوانی پر فائز ہوئے۔ نواب ناصر الدولہ بہادر نے اپنی تخت نشینی کے بعد آپ کو امیر الامرا کا خطاب عطا فرما کر حسب سابق عہدۂ دیوانی پر بحال رکھا۔ آپ بڑے خلیق، ہمدرد، غمخوار تھے۔ ۷ شعبان ۱۲۴۳ھ کو سوا ہفتہ کے عارضہ سے تین روز علیل رہ کر آپ نے رحلت کی۔ مزار میر مومن صاحب کے دائرہ میں ہے۔

[۵] راجہ چندولال راجہ نارائن داس کے بیٹے اور لچھمی رام کے پوتے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب راجہ ٹوڈرمل سے ملتا ہے یہ قوم کے کھتری تھے۔ ۱۲۲۱ھ میں پیشکاری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ نواب سکندر جاہ بہادر نے ۱۲۲۵ھ میں مہاراجہ کا خطاب مع نوبت و دوائر عطا فرمایا۔ پھر نواب ناصر الدولہ بہادر نے ۱۲۴۵ھ میں راجایان راجہ مہاراج راجہ چندولال بہادر خطاب مرحمت فرمایا۔ نواب میر الملک کے انتقال کے بعد ۱۲۴۸ھ میں آپ دیوانی کا کام دیکھنے لگے علماء، فقراء، شعراء، مشائخین کے بڑے قدر دان تھے۔ شاعری سے گہری دلچسپی تھی شادان تخلص کرتے تھے۔

۷ ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ کو (۸۶) سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

میں بڑی سہولت ہوگئی۔ انہی میں سے مولانا نے بھی ایک حجرہ اپنے قیام و عبادت کے لئے مخصوص فرمالیا وہ مسجد جس کی ویرانی انتہا کو پہنچ چکی تھی وہ خدا کا گھر جو کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا جہاں بانگ صلوٰۃ کی چہل پہل کے بجائے ہو و خنود طاری تھا اس کو مولانا نے اپنی خاص توجہ سے آباد و معمور کر کے اپنے سچے اسلامی جذبات اور حقیقی عقیدت کا ثبوت دیا۔ صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ مولانا کے والد نواب سید کریم اللہ خاں بہادر نے جو خواب کہ جامع مسجد برہانپور کا چراغ روشن رہنے کا دیکھا تھا حقیقت میں وہ جامع مسجد بلدہ تھی اور وہ چراغ مولانا کی ذات بابرکات۔

نواب عزت یار خاں بہادر صدر الصدور نے جامع مسجد کی تولیت مولانا کے فرزند حاجی عبد اللہ صاحب کے نام کردی۔ یہ تولیت اس خاندان میں اب تک ہے جو سجادہ نشین ہو وہی جامع مسجد کا متولی بھی ہوتا ہے۔

خیالات لطیف

از جناب یس بی۔ آنند صاحب

سمندر کو اپنے بیشمار موتیوں پر ناز ہے، آسمان کو اپنے درخشان ستاروں پر فخر ہے؛
لیکن میرا دل! میرا دل!! میرا دل!!! محبت میں سرشار ہے۔
آسمان اور سمندر اپنی حیثیت میں عظیم ہیں: لیکن میرا دل ان سے عظیم تر ہے؛
گو ستارے اور موتی خوبصورت ہیں، لیکن میرے دل کی پر نور شعاعیں ان سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔

۱۔ محبت کیا ہے؟ "مشغلہ بیکاری" دانشمندوں کا یہ ناصحانہ جواب ہے۔
کیا میں بھی اسی خیال کی ہمنوائی کروں۔ فطرت صحیح کا جواب ہے "نہیں"
اے دانشمندو! احمقانہ وعظ کو ختم کرو، زمانہ نے تمہارے دلوں کو برف کی طرح شل کر دیا ہے۔
کیا تمہاری نصیحتیں مفید ہو سکتی ہیں؟ فطرت صحیح کا جواب ہے "ہرگز نہیں!!"

۲۔ میں نے اپنے محبوب کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا آواز آئی "کون ہے"؟
میں نے جواب دیا "میں ہوں"! لیکن دروازہ بند رہا، میں یاس و غم میں تڑپتا رہا۔
میں نے دوبارہ دروازہ پر دستک دی۔
صدا آئی "کون ہے"؟ میں نے کہا "تو ہے" اور دروازہ کھل گیا۔

(ماخوذ)

باغِ دکن

(۲)

میر غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی

سخن کے اورنگ آبادی ہونے کی تائید میں میں نے ان کا یہ قطعہ لکھا تھا ؎

اے آبروئے نخجستہ بنیاد تجھے! اے رونقِ شہرِ حمید آباد تجھے!
باللہ کہ اے سخن سخن سنج تمام کہتے ہیں وحید عصر و استاد تجھے!

اور اب ان کے اورنگ آبادی ہونے کی ایک حد تک شہادت ان کی مثنوی "صریرِ سخن" سے ملتی ہے۔ یہ ایک سراپا نامہ شوق ہے۔ "صریرِ سخن" (۱۲۱۰) تاریخی نام ہے۔ اور نام استاد (شفیق اورنگ آبادی) کا عطیہ۔ (عمر یافعی)

صریرِ سخن

(نامۂ شوق)

تجھ کو لازم ہے اے نسیمِ بہار! کیجیو اتنا سب کے گوش گذار
ہیں جہاں تک کہ دوستانِ سخن اور جتنے ہیں قدر دانِ سخن
پہلے ان کو سلام کہہ دینا بعد اتنا پیام کہہ دینا
کیا لکھوں شرحِ داستانِ شوق کیا لکھوں قصۂ بیانِ شوق
سوزِ ہجرِ اپنا۔ کیا کروں اظہار گردشِ روزگار نے اک بار
کیا شروعِ بہار میں مجھ کو نشۂ انتظار میں مجھ کو
دوستانِ وطن سے دور کیا بوستانِ وطن سے دور کیا
دلیں کیا کیا۔ کیا تھا میں نے خیال کیا کہوں ہے خدا ہی جانتا حال
آرزو تھی چمن میں جاویں گے حسبِ خاطر مزے اٹھاویں گے
ہر روش پہ پھریں گے خرم و شاد ہمرہِ مخلصانِ صاف نہاد
متفق ہو کے صاحبانِ سخن یعنی بر صدرِ رشتہ نشینِ چمن

غزل تازہ طرح کی دیویں گے کچھ طبیعت سے کام لیویں گے
نشہ پی پی کے مست ہویں گے اور شاہد پرست ہویں گے
اور اک تازہ آرزو یہ تھی ایک مدت سے جستجو یہ تھی
گل کا حسنِ غرور دیکھیں گے بلبلوں کا سرور دیکھیں گے
جلوۂ سرو و ناز دیکھیں گے قمریوں کا نیاز دیکھیں گے
رنگِ گل اور رنگِ روئے یار دیکھ لیتے ملا کے ہم اک بار
نظر آتا سرو کا بھی ناز اور سرفراز یئے قدِ طناز
دیکھ لیتے تمام غنچہ کا دہن اور گل رو کا اپنے غنچہ لب
گل خندان کی دیکھتے خوبی اور ہنسنے کی اس کے محبوبی
حسنِ لالہ بھی دیکھتے اکبار اور پان دسی کی اس کے بہار
شبنم و گل کو دیکھتے پدمش اور اس مست ناز کا دُرِ گوش

دیکھتے سنبلِ چمن کے تئیں — اور اس زلفِ پُرشکن کے تئیں
دیکھتے برگِ گل سے کرکے قرین — یار کے اپنے ناخنِ نگیں
دیکھتے حسن سیرِ آب روان — اور وہ خوش ادائی جانان
الغرض کیا کہوں ہوا ہے چمن — طول کھینچے ہے مدعائے سخن
ہوس دل کا کیا شمار کروں — سب سے بہتر ہے اختصار کروں
شرح کرتا ہے مجھ کو سوزِ ہجر — اور بیانِ بلائے روزِ ہجر
ارے! اس ہجر کا برا ہو جائے — اور جدائی کے دن کو آفت آئے
کاٹنا دن مجھے قیامت ہے — رات بھی سر پہ سخت آفت ہے
کس بلا کا عذاب رہتا ہے — رات دن اضطراب رہتا ہے
فکر کچھ ہے اگر تو فکرِ یار — ذکر کچھ ہے اگر تو ذکرِ یار
یہی بس مجھ کو کام رہتا ہے — صبح سے تا بشام رہتا ہے
غیرِ غم کے مرا نہیں نہیں — اور تصور سوا بلیس نہیں
یوں تو ساحبؔ مرا مصاحب ہے — سخن درد و غم کا طالب ہے
بس کہ اس کا ہوں مورد الطاف — میری تقصیر بھی رکھے ہے معاف
اس کی شفقت کو کیا کروں تنسیق — نام ہے اس جناب ہی کا شفیق
پر کروں کیا جہان ہو جائے ادب — کام آتا ہے کب سوائے ادب
وقتہ یہاں تک کہ ذوالجلال سخن — پھر سخن کو کہاں مجال سخن
اہمیں پھر کس سے گفت و گو کیجے؟ — شرحِ غم اپنا مو بمو کیجے
ایک ہم درد بھی نہیں صد حیف — رازِ دل جس سے کہتے بے کم و کیف
طرفہ تر اور اک غضب یہ ہے — دل کے رکھ جانیکا سبب یہ ہے
سب سے ملنا مرا رواج نہیں — آہ کیا کیجے وہ مزاج نہیں
ٹک بھی کو چک دلی اگر ہوتی — زندگی ہر طرح بسر ہوتی
آہ کیا کیجے بن نہیں آتا — غیر خود دار من نہیں آتا
جس کا اتنا مزاج عالی ہو — اس کا دل کس طرح سے خالی ہو
کون لایا ہے درد کا انباز — کیجے جس کو اپنا محرمِ راز

لطف سخن زبان شفیق دصاحب استاد مصنف۔

ہان! اگر دل سے گفت و گو کر لیے — یا تصور سے اپنے خو کر لیے
اس سے بھی جب نہ ہو تسلی دل — پھر کہے کہتے اس سے کیا حاصل؟
دل بہلنے کی کوئی طرح نہیں — غم ہے یہاں تک کہ جی کی شرح نہیں
الغرض زندگی بغیر وصال — امر مشکل ہے۔ اور خیال محال
لیک یہ سب کے تئیں رہے منظور — ہیں سخن دوست جتنے اہلِ شعور
جو تفنن کی طرح ہو ایجاد — جو تفرج کی شکل ہو روداد
یاد فرمائے مخلصان ہیوں — لیک غافل نہ ہوں جہاں ہوویں
مجلس نشہ ہو بہم جس دم — اور اسبابِ عیش سب ہو بہم
اس میں پھر جو کوئی کہ ساقی ہو — مئے پلانے کا اشتیاقی ہو
چاہیے اس کو یہ شعور رہے — دو ستوں پر نظر ضرور رہے
اس میں پھر اس کے دل میں جو آوے — آپ ہی پیوے یا کسو کو پلاوے
پر مرا پہلے نام لے لیوے — پھر جسے چاہے جام بھر دیوے
لیکن اس دولت کا بھی ہے احسان — لیوے ساقی سے جو کوئی فنجان
ساتھ ہی اس کے مجھ کو یاد کریں — آپ خوش ہوویں مجھ کو شاد کریں
پھر وہ پیوے نہ من شوق تمام — مئے انصر ہو یا مئے گل نام
اہمیں گر اگ کا سماں ہو جائے — مجمع رشکِ بوستان بن جائے
ہے یہ قانون دوستی ہر حال — رہے اس کے نوا کا دل میں خیال
یا کہو تو رقص کی بنیاد — خود نمائی یہ آوے رہرو شرار
بات اتنی ہی سب کے گوش رہے — اس ادا فہم پر ہی ہوش رہے
سوز خوانی کے میرے پیرِ حزیں — ایک دو سوز پڑھ مرے دل سوز
چاہیے دو ہن اشک بھر آویں — اس سافر کو یاد فرماویں
جب چمن میں گزار ہو جائے — دیدۂ دل بہار ہو جائے
چاہیے اس گھڑی بصد فریاد — بلبلِ گلشنِ وفا کی یاد
سیرِ صحرا کا جب کریں آہنگ — کھولنے کے لیے اگر دل تنگ
جو دہان کی بہار یاد آوے — یہ بھی امیدوار یاد آوے

جب کہ عشق خدا کا ہوئے ذکر ماسوا اللہ کی دور ہوئے فکر
کفر ہے پھر تو فکر غیر سخن مت کر اب تو بھی ذکر غیر سخن
یاد کو بس ہے اک قسم بھی دلیل ورنہ ہوتا ہے قصہ اور طویل
اس قدر بھی ہیلا نہیں ابرام ختم کر اور دعائے وصل مدام
حق تعالیٰ وہ دن شتاب کرے وصل سے مجھ کو کامیاب کرے
پردۂ ہجر کو اٹھا دیوے دوستوں سے مجھے ملا دیوے
تا غم دل یہ دور ہو جاوے وصل سے اک سرور ہو جاوے
پھر وہی دن ہیں پھر وہی راتیں وہی پہلی سی وہی باتیں
اور وہی مجلس و جدا ہے سب سماں طرب مہیا ہے

احباب کیا لکھے یہ خانہ خراب بس کہ ہے تطویل نامۂ شوق
فکر تاریخ بھی ابھی منظور تا سنین و شہور ہو مشہور
لیک یہ بھی ہے لازم و ملزوم نام نامہ بھی اس سے ہو معلوم
اور مصنف کا نام بھی ہووے معنیٔ خاص و عام بھی ہووے
تا میں اس ذکر و فکر میں اکبار میرے صاحب نے سن کے یہ تکرار
کہا "کیوں اس قدر تامل ہے یہ تو اک امر جزئی و گو کل ہے"
اور فرمایا مجھ سے سن بابا "ہے" سریر سخن سے کیا بہتر؟
اس میں سب کام ہے تمام اسم و تاریخ اور نامہ کا نام
دوست آباد و شادمان ہوویں خوش و خرم رہیں جہان ہوویں

اشعار

کیا ہے نذر تیغ یار ہم نے۔ یار اگر دن تک کہ مثل شمع اپنے تن پہ سر ہے بار گردن تک
برقع نہ منہ پہ اے مہ یوسف جمال ڈال دیکھوں نگاہ۔ دے تو آنکھیں نکال ڈال

زلف سے حظ مشک فام کو ہم خوش سمجھتے ہیں شب سے شام کو ہم
عشق سے باز کس طرح آویں؟ تا نہ پہنچائیں انتظام کو ہم
از مکاں تا بہ لامکاں۔ میں ہوں دیکھئے تو کہاں کہاں۔ میں ہوں؟
دل عالم فقط نہیں ہوں سخن! بل کہ جان جہانیاں۔ میں ہوں

تعذیر کے قابل ہوں۔ تعذیر ہے اور میں ہوں کیا دیر ہے پھر ظالم؟ شمشیر ہے اور میں ہوں
کچھ فکر بھی تلافیٔ دوراں کی ہے تجھے غافل! اگرچہ تو خوش خرم بہت ہے یہاں
ادب کرتے نہیں کچھ بے ادب ایسے ہی ہوتے ہیں جہاں تک شوخ ہیں یہ سب کے سب ایسے ہی ہوتے ہیں
اے یار! پھر وہ بات نہیں رہتی ایک بار آیا جہاں کہ فرق ذرا اعتبار میں
اہل نظر ادھر بھی کبھو اک نظر کریں جوں سرمہ ہم بھی خلق کی آنکھوں میں گھر کریں
لگے مضمون دل کش سو جھنے اک وہی ساغر میں سخن! یہ شے کہاں ہے؟ یہ تو عمل کل ہے شیشہ میں
آداب دوستی کا جسے حوصلہ نہیں پھر اس نے جو کہا سو کہا کچھ گلہ نہیں

ایک دل میں سنگ دل کے ہو تو ہو نہ ہو — ورنہ اثر کرے ہے یہ فسانہ سنگ میں

تفکر ہے کہ یار لعل ہوں یا سنگ ہوں کیا ہوں — کہ میں بھی رنگ کچھ کھتا ہوں یا بے رنگ میں کیا ہوں

اگرچہ کچھ نہیں پر کچھ تو ہوں کچھ ہوں تو پھر کیا ہوں — کہا جاتا نہیں یہ بھی کہ یہ ہوں ننگ ہوں کیا ہوں

فقط ہم ہی نہ تیرے در پہ اے دل داغ بیٹھے ہیں — تڑپتے اور کتنے ہی پس دیوار بیٹھے ہیں

یہی اکثر سخن ہے برسر پرخاش رہتے ہیں — الگ سب سے جو وہ کھینچے ہو تو وار بیٹھے ہیں

چھپائیں آپ سے ہستی تو فائدہ کیا؟ — ہنوز ہے مئی شب کا خمار آنکھوں میں

جدائی سے تری کچھ تو ہے آفات آنکھوں کی — کہ روتے ہی کٹی ہے کئے دنوں سے رات آنکھوں کی

اجی پھیر کیوں مکتے ہو ابھی تو دیکھتے تھے تم — اگر ایسے ہی تھے ہو۔ کھوٹی ہے بات آنکھوں پر

ایک پروانہ کیا کہ شمع تلک ... — جان و دل سے ہے پتنگ ہے رشک پر

ڈر ہے برادروں سے کہ اخوان عاقبت — لے ہی گئے فریب دے یوسف کو چاہ پر

ملتی کسو طرح نہیں یار شب فراق — کیسی خوشی کریں جو بڑھے دن یہ رات پر

کچھ ہیں آثار آتے ہیں نظر طوفان کے — خشک ہوتی ہی نہیں چشم نمود پھر

وقت رخصت مت الگ جا دوڑ کر — آ! مری چھاتی سے لگ جا دوڑ کر

اے سخن! تو گرم اتنا یار کو — دیکھتا کیا ہے؟ بلک جا دوڑ کر

خاک تھا خاک ہو گیا آخر — پاک تھا پاک ہو گیا آخر

غنچۂ گل کی طرح پیراہن — چاک تھا چاک ہو گیا آخر

دیکھئے! پھر ہمیں اُسے باہم — حق تعالیٰ ملائے گا کس روز

خبر آمد - آمد محبوب — دیکھئے حق سنائے گا کس روز

ایک مدت سے منتظر ہے سخن — یار تشریف لائے گا کس روز؟

حسن تاثیر میں بہم ہے سخن! — نالۂ شام اور دعائے صبح

پھر کہاں دل سوز اس نام جہاں میں اس لئے — طبع کے حق میں دعا کرتی ہے پرانے کی صبح

رشک بہار قامت گل پوش ہو گئی — پھولے سمائے ہے کوئی اب پیرہن میں شاخ؟

اے سخن! کاش کے وہ سرو موزوں کا پیوند — داغ سجدہ ہی ہو جس کی جبیں کا پیوند

یہ قد و قامت - اور یہ سن میں نہ اصید؟ — پھر تو یہ شوخ لائے گا دن میں ہزار صید!

ہے دیکھئے تو ایک اک اے سخن! لذیذ — لب ہے دہن لذیذ - دہن سے ذقن لذیذ

رسوائے خاص و عام کیا اس ہوس نے بس — یہ ہی اگر ہوس ہے تو اے خاک ہوس!
آتش زباں کو گرم کرے ایسے وہ کوئی — منظور ایک بات کی سُننی ہو جس کو دس بار
وہ آنکھ ہی نہیں جو کسی کو نظر پڑیں — پنہاں ہیں چشمِ خلق سے مردِ خدا شناس
داغ سے رنگ کو لالہ کے ہوا رنگِ دگر — تیرگی شب ہی کی ہے وجہِ بہارِ آتش
سرد مہروں کو کیا گرمیٔ دل نے ممنون — جیسے سرمازدہ ہوں شکر گزارِ آتش
بیزار مجھ سے غیر تو ہیں۔ آشنا[1] خصوص — بے گانے اک طرف ہیں۔ مرا آشنا خصوص
احوالِ انبیا ہے بلا دیدہ ہی گواہ — خاصوں ہی کے لئے ہے نزولِ بلا خصوص
کہ نہیں ہے یہ بھی۔ لے لے، ان اس دل کی عوض — جان ہم دیتے ہیں تجھ کو جان اس دل کی عوض
گر دل نہ ہو نہو۔ دلِ ناکام کی عوض — بوسہ تو دیجئے کوئی دشنام کی عوض
بے جا ہے انتظارِ سخن! اب جو دیجئے — وہ مل گیا ہے صبح ہی کو شام کی عوض
شوخ۔ سفاک ہے خدا حافظ ... — سخت بے باک ہے خدا حافظ
نے فسوں و فسانہ ہے مطبوع — غزل عاشقانہ ہے مطبوع
گرچہ ہے حیلہ جو اُس کا — ہر فریب و بہانہ ہے مطبوع
دوستوں سے سخن! اگر کیجے — گلۂ دوستانہ ہے مطبوع
اک زندہ دل کے فیض سے صد زندہ دل ہوئے — ہوتی ہے ایک شمع سے روشن ہزار شمع
گرمیٔ سوزِ عشق سے آہ! ہو گیا — ہم سینہ داغ و ہم جگر و ہم دماغ داغ
ہر چند بٹ رہا ہے مرا دھیان چو طرف — لیکن پر رنگ گل ہے مرا کان چو طرف
اک صدف کا دل اگر ٹوٹا تو اے گردونِ دوں! — سو گہر دینے پڑیں گے تجھ کو تا وان صدف
حُسن کے بے شمار ہیں عاشق — ایک گل اور ہزار ہیں عاشق
داغوں نے دل کے گلشنِ جنت دکھا دیا — ہے یہ بھی اک تصرفِ عشق و عطائے عشق
اتقا۔ ظاہر تو اتنا ہی کہ واقف ہی نہیں — بادۂ انگور تو کیا دانۂ انگور تک
اور با لمن پوچھئے ان کا تو ہے ناگفتہ بہ — ہو اگر مردار بھی چھوڑیں نہ یہ مقدور تک
خدا گواہ کہ اندھیر ہی رہے قائم — نہو جو نور ترا اشعہ دار آنکھوں میں
پھرتی ہے دیدۂ چشمِ بتِ خود کام نظر میں — بھرتی ہے کوئی نرگسِ بادام نظر میں؟

[1] پہلا آشنا معشوق کے معنوں میں دوسرا ہمشناساؤں کے معنے میں ہے ۱۲

وہ مست کہ اپنی ہی خبر جس کو نہ ہووے — شیشہ کو سنبھالے کہ رکھے جام نظر میں۔
یہ آگ لگائی ہے سخن! جس نے کہ باہم — باللہ کہ ہے اپنی وہ تمام[1] نظر میں۔

اُدھر مزاج کی وہ استواریاں پائیں — اِدھر یہ صبر کی سیمابیاں دکھائیں
شہید عشق آرائش بطرز تازہ کرتے ہیں — لہو ملتے ہیں مُنہ کو اور تصور غازہ کرتے ہیں
اِدھر مجنوں کو دیوانے ہزاروں نام رکھتے ہیں — اُدھر یہ مُڑ چڑے فرہاد پر آوازہ کرتے ہیں

نہ تنہا زخم بسمل اے ستم ایجاد ہنستے ہیں — کفِ افسوس ملنے پر ترے جلاد ہنستے ہیں
چلے جاتے ہیں یوں ہی کارخانے اہل دنیا کے — کہیں ناشاد روتے ہیں، کہیں دلشاد ہنستے ہیں
گئے وہ دن جو اتی کے اگرچہ اے سخن لیکن — وہ باتیں اب بھی آجاتی ہیں جس دم یاد ہنستے ہیں

کوئی سمجھے نہ سمجھے ہم تو فرزانہ سمجھتے ہیں — وہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ سمجھتے ہیں

غزلیات

دیکھ باغ و بہار کی صورت — یاد آئی نگار کی صورت
دن میں بدلے ہے سو طرح کے رنگ — ہے عجب روزگار کی صورت
تو نے کچھ غور بھی کیا بارے — اس دلِ بے قرار کی صورت
جس طرف کیجئے نگاہ اُدھر — نظر آتی ہے یار کی صورت

تو زلف و رخ کو ذرا دکھا دے باب اول دوم باتش — کہ موج و شعلہ نہ نکالے باب اول دوم باتش
غضب وہ جوشِ عرق ہے رہ کا ہے رنگ تن پر ہمیں بھگو کا — بلائے جاں ہے خدا بچائے باب اول دوم باتش
بہت سے موجِ وفا سے بے بس بہت سے جل بل چمن میں گئے — ان آفتوں سے خدا بچائے باب اول دوم باتش
قسم ہے ماہی کباب ہوئے۔ دل سمندر بھی آب ہوئے — جو ہوں موثر ہمارے نالے باب اول دوم باتش
کیا اگرچہ بہت پر یکھا یہ سرد و گرم زمانہ دیکھا — خدا کسی سے نہ کام ڈالے باب اول دوم باتش
ہمارے مشرب میں یکدگر سے اُلفت ہے مخالفوں سے — بھرے ہیں دل کے ہمارے چھالے باب اول دوم باتش
عجب نہیں میں سخن کے ترہوں رنگ گل میں بہار شرر ہو ساں — غزل لڑوں جو ہندوانے باب اول دوم باتش

---

[1] چغلیہ ۱۲ صـ (بطور تخلص مصنف کا مزعومہ انتخاب!)

کہتا ہوں جب میں "عشق ہوں تری جاں کی قسم" کہتا ہے "میں بھی محو ہوں ایمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "بندۂ خدمت گزار ہوں" کہتا ہے میں بھی "فدوی ہوں قرآن کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "کشتۂ لعل خوش آب ہوں" کہتا ہے "کھا تو چشمۂ حیوان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "شمع ہے تو بزم غیر کا" کہتا ہے "ماہ مصر ہوں کنعان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "خسرو دارا شکوہ ہوں" کہتا ہے میں بھی "جم ہوں سلیمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "پی کوئی ساغر تو جاں جان" کہتا ہے "مست ناز ہوں فنجان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "قصد حسن پری رخاں" کہتا ہے میں بھی "حور ہوں غلمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "اس سے کہ محسن ہوں آپ کا" کہتا ہے "کھاؤ تو مرے احسان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "خلق ہے تو بحر حسن کا" کہتا ہے "یم ہوں گوہر غلطان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "درد دل اپنا طبیب سے" کہتا ہے "میں حکیم ہوں لقمان کی قسم"
کہتا ہوں جب میں "لعل بھی دیکھا ہے آپ نے" کہتا ہے "لب ہی لعل ہیں مرجان کی قسم"

کہتا ہوں جب "سخن کی فصاحت پہ غور کر"
کہتا ہے "خود فصیح ہوں سحبان کی قسم"

کیا کروں بے کل ہوں اے جان! ایسی رات میں — میں ہے میں، واقف نہیں افسوس ہیں اوقات میں
بھول جانا شرط ہے یہاں اپنا یا دیار میں۔ — وہ ہی پھر باقی رہے مجھ سے اگر اٹھ جائیں میں
صبر ہی کرنا پڑا اے جان! بس اب کیا کروں — کس بلا میں پھنس گیا بیٹھے بٹھائے ہائے میں
آمد آمد کی خبر سد رمق کچھ ہو گئی — ورنہ کب کا چل بسا تھا آپ کے بن آئے میں
اب تو نظروں میں نہیں بھرتا بتوں کی پر کچھو — دل میں رکھتا تھا انھیں سنگیں دلوں کے جائے میں

جذبۂ لطف الٰہی راہ پر ہے اے سخن
راہ سے بھٹکوں نہ غولوں کے کبھو بھکائے میں

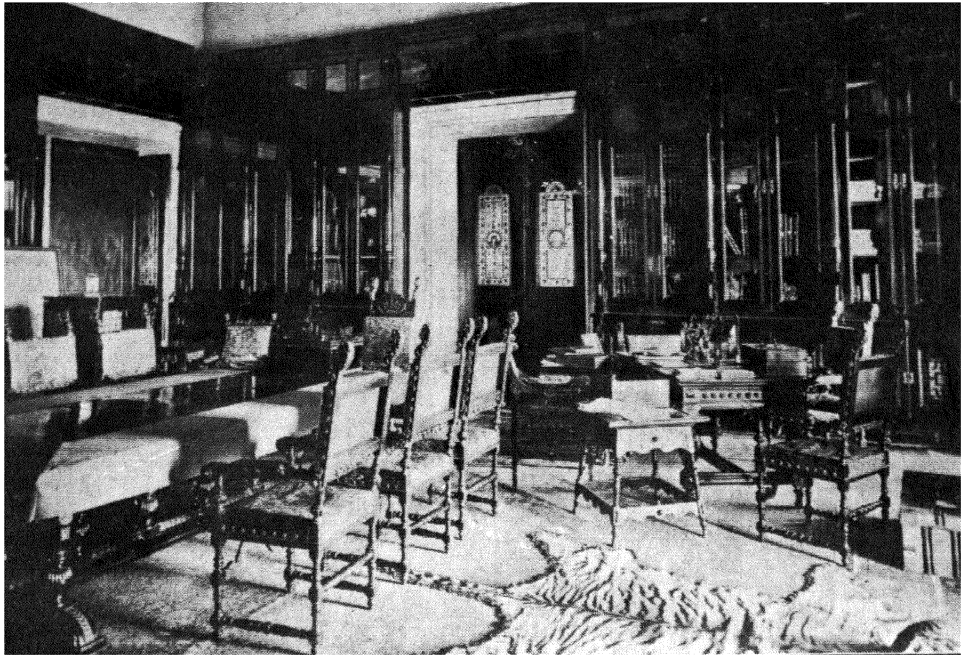

كتب خانم قصر فلک نما

میر عالم کی شاعری

(از جناب سراج الدین صاحب طالب)

میر عالم کو دنیا اس سے بڑھکر نہیں جانتی کہ وہ ریاست آصفیہ کے ایک لائق وزیر اعظم تھے یہاں ہم اُن کو ایک شاعر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ میر عالم کی عام علمی اور عملی قابلیتوں میں اُن کی شعر گوئی کی قابلیت خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اس کا ثبوت اسی سے مل سکتا ہے کہ اُن کی دنیاوی ترقی مدّاح کا سنگ بنیاد فی الحقیقت اسی شاعری پر رکھا گیا چنانچہ عنفوان شباب میں میر عالم نے مدّ الہام وقت ارسطوجاہ کی مدح میں اپنا زور طبیعت دکھایا جب اُنکا یہ کلام ارسطوجاہ کی نظر سے گزرا تو اُن کی طبیعت اور لیاقت کی بڑی تعریف کی اور اپنے دربار میں حاضر رہنے کا حکم دیا زمانہ کی سہل نگاری پر افسوس ہوتا ہے کہ ایسے قابل فرد کے کلام کو ایک جا جمع نہ کیا اور نہ کسی نے اس طرف توجہ کی کم از کم میر عالم کا وہ قصیدہ جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطوجاہ کی مدح میں لکھا تھا کہیں محفوظ کر رکھیں۔ اسی وجہ سے باوجود سعی بلیغ وہ ہمیں دستیاب نہ ہوا۔ اس عہد کے شعرا کے جستہ جستہ کلام اسی عصر کی ایک تصنیف "شعرا دربار یاب" میں ملجاتے ہیں جس کو منشی اسمٰعیل یار جنگ نے اسی عصر میں جمع کیا ہے (اُسکا ایک نسخہ ہمارے دوست سٹر تمکین کاظمی کے قبضۂ قدرت میں ہے) لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں بھی میر عالم کا نہ یہ قصیدہ ہے نہ کوئی اور کلام ممکن ہے کہ منشی اسمٰعیل یار جنگ نے قصداً اُن کے کلام کو نظر انداز کر دیا ہو۔ اس واسطے کہ میر عالم سے اُن کے تعلقات خوش گوار نہیں تھے جس کی تفصیل کسی متعلقہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے یا ہماری تالیف (میر عالم) سے۔ بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم کا فارسی دیوان مرتب و مکمل تھا لیکن اُس کا کہیں پتہ نہیں۔ اُنکا متفرق کلام جو ہمارے دیکھنے میں آیا ہے اس سے یہ تو گمان نہیں ہو سکتا کہ اسقدر پختگی اُن کے کلام میں معاً پیدا ہو گئی۔ اُن کی مشق سخن کی غزلیات یا اور کلام بھی ہو گا جو زمانہ کی دست برد سے یا معاصرین کے عدم اعتنا کے باعث محفوظ نہ رہ سکا۔

ان کا کل کلام غلام حسین خاں جوہر کی "ماہ نامہ" سے اور حکیم غلام حسین خاں کی "گلزار آصفیہ" سے ملتا ہے۔ اور یہ سب ایک مصرع، ایک رباعی، ایک مثنوی اور ایک قطعہ پر مشتمل ہے۔ صاحب گلزار آصفیہ نے

اِن کا وہ قطعہ نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے باغ کے محل کے بالاخانے پر لکھوایا تھا جس کے چار شعر ہیں اور وہ یہ ہیں ؎

مقصد ز کاخ و صفہ و ایوان نگاشتن — کاشانہ ہائے سر بفلک برفراشتن
گلہائے رنگ رنگ و درختان میوہ دار — در باغ و بوستان ز سر شوق کاشتن
دانی کہ چیست تا بمراد دل اندر آن — یک لحظہ دوستے بتواں شاد داشتن
ورنہ چگونہ مردم عاقل بنا کنند — از گل عمارتے کہ بباید گزاشتن

اس قطعہ کی روانی کلام و سلاست کو علیحدہ رکھ کر ہم محض تخیل کو لیتے ہیں تو کس قدر نفیس اور سبق آموز معلوم ہوتا ہے۔ اس قطعہ میں علت تعمیر کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مٹی کی عمارت جو عقبیٰ میں ساتھ رہ نہیں سکتی بنانے میں کوئی فائدہ نہیں لیکن چونکہ بہت سارے عقلمندوں نے یہ کام کیا ہے اور اُن کے کام بے معنی یا لاحاصل نہیں ہو سکتے اس لئے وہ اُس کی یہ علت قرار دیتے ہیں کہ ہستی چند روزہ کو ہنسی خوشی میں گزارنا ہے اور اُس کی تکمیل میں کوئی پھولوں اور میووں کے باغ لگاتا ہے۔ کوئی سر بفلک محل تعمیر کرتا ہے اسی غرض کے تحت انہوں نے بھی ایک عمارت بنائی یہاں ہم کو اس سے بحث نہیں کہ نظیر یا علت جو پیش کی گئی ہے منطقی طور پر کہاں تک قابل تسلیم ہے۔

صاحب ماہ نامہ کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ میر عالم کا کلام جمع کرتے۔ لیکن چونکہ وہ ماہ لقا بائی کے مورخ ہیں اس لئے اس مقام پر جہاں انہوں نے میر عالم اور ماہ لقا بائی کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہاں میر عالم کے کلام کو بھی پیش کیا ہے۔ قبل اس کے یہاں ان کے کلام کا کوئی ذکر کیا جائے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن دونوں کے باہمی تعلقات پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ اُن خیالات کی توضیح ہو سکے جو اس عنوان کے سنتے ہی "ماہ لقا بائی اور میر عالم کے تعلقات باہمی" خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

چندہ جی نظام علی خاں کے دربار کی طوائف تھی اس کا خطاب ماہ لقا بائی تھا۔ یہ اپنے عہد کی ممتاز ترین طوائف سمجھی جاتی تھی اور حضوری اور وزیری محرے میں رہتی اور بڑے انعام پاتی تھی۔ اس کے نام اور فرمائش پر غلام حسین خاں نے تاریخ ماہ نامہ لکھی ہے۔ اس میں ان دونوں کی بنا ملاقات یا اُس کے ارتقا پر کوئی تفصیلی نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔ کتاب سے صرف اس قدر استنباط ہو سکتا ہے کہ میر عالم اور ماہ لقا میں استادی اور شاگردی کے تعلقات تھے۔ چنانچہ کتاب کے اس جملہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے یہ ہے۔

"و میر عالم بہادر اکثر می فرمودند کہ تلمیذے برسائی فہم و ذکاوت طبع و جودت مزاج در زمرۂ تلامذۂ خود مثل ماہ لقا ندیدہ ام"

اس تلمذ کی ابتدا یا اور کچھ ارتقا، اس سے معلوم نہیں ہو سکتا ایک دوسرا اس جملے سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ میر عالم شاعر ہونے کے علاوہ شاعر گر بھی تھے چنانچہ 'در زمرۂ تلامذۂ خود' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فن شعر گوئی میں ماہ لقا کے علاوہ میر عالم کے اور شاگرد بھی تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے اور نہ اصلاح سخن کے طریق روشنی میں آئے۔ ماہ نامہ ہی کے مولف نے میر عالم کی ایک مثنوی اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ یہ ماہ لقا کے سراپا میں ہے اس مثنوی کے آغاز سے قبل یہ مصرع 'افسون جنون عالم ست ایں' بطور عنوان لکھا گیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عالم تخلص کیا کرتے تھے۔ اور یہ مصرع بطور عنوان انہوں نے ہی لکھا ہے۔ اگرچہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی باہمی تعشق کے واقعہ کی نشانی ہے لیکن ہم اسکا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ مضمون مثنوی میں تجرید و غلو کی وجہ سے اسکے معانی بہت وسیع ہو سکتے ہیں۔ ایک رباعی بھی آغاز مثنوی سے قبل لکھی گئی ہے جو محض عاشقانہ مضمون کی حامل ہے اور وہ یہ ہے۔

تا ہست ترا داغ کارے بارے دل را ندہی بدست دلدارے
بہتر نبود ز عشق ہرگز کارے گر نیست حقیقتاً تکلف بارے

اس مصرع اور رباعی سے غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ سامع کو اپنی عاشق مزاجی کی طرف رجوع کیا جائے تاکہ مثنوی کے پڑھنے والے کو کوئی سوء ظن پیدا نہ ہو۔

مثنوی بحر ہزج مسدس اخرب یا اخرم مقبوض محذوف میں ہے لیکن صاحب ماہ نامہ نے (جو اپنے نام کے پیچھے تخلص بھی رکھتے ہیں اور اس بنا پر ہم اُن کو شاعر تصور کر سکتے ہیں) اس کی بحر کا ایک نیا نام لکھا ہے جو بحر کے لئے ہم نے نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ اُن کی اصل عبارت یہ ہے

"نظم مثنوی در وصف سراپائے آن سرو جوئبار دلبری در بحر مجنون بفصاحت محاورہ تصنیف فرمودہ اند چنانچہ اکثر اشتہار دادہ"

معلوم یہ ہوتا ہے کہ جو ہر بیچارے عروض سے ناواقف شاعر تھے اس لئے اس بحر کا ایک سنا سنایا نام بتا دیا۔

اس بحر ہزج مسدس میں بعض مقامات پر خفیف سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں جن کو عروضی ہی سمجھ سکتے ہیں اور عروض داں شاعر ہی اُن کی صحت وزن کو قائم رکھ سکتا ہے ساری مثنوی میں

بہ اعتبار اوزان کوئی سہو نظری پائی نہیں جاتی۔ مثنوی کے لئے اس بحر کا انتخاب اور پھر اس میں ہر جگہ صحت وزن کا خیال میر عالم کی عروضی قابلیت اور وسعت نظر اور ذوق صحیح کی بیّن دلیل ہے بہ اعتبار زبان و محاورہ کسی جگہ کوئی لغزش نظر نہیں آتی۔ فارسی میر عالم کی خانہ زاد زبان تھی اُن کے والد سید رضی اقدس خاص بلدہ شوستر کے باشندے تھے اور نانیہال بھی ایرانی تھی۔ اور شوستر یا ایران چھوڑے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اُدھر کی زبان نسیاً منسیاً ہو جاتی۔ بہر حال کلام میں روانی سلاست، شیرینی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ تشبیہات یا استعارات ایسے استعمال کئے ہیں جن پر سامع کا دماغ معاً پہنچ جاتا ہے اور یہی ہے اصل شاعری۔

اول تو میر عالم کا کلام ہی مفقود ہے اور جتنا کچھ ہے ایک مثنوی ہے اور بس اُس کی بھی یہ حالت ہے کہ لوگ اُس سے مطلقاً واقف نہیں۔ عجب نہیں جو اس کے شائع نہ ہونے کے باعث یہ کچھ اور عرصے میں تلف ہو جائے اِن وجوہ کی بنا پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پوری مثنوی کو یہاں ہدیۂ قارئین کریں۔

اے ماہ سپہر روشنائی — سرتاپائے تو دل ربائی — از نقش خراست آدایا — گل گل بشگفت رنگ ہنایا
اے مردم دیدۂ محبت — سرتا قدمت طلسم الفت — اے برق خرام تست نیرنگ — آہنگ خرام شعلہ آہنگ
شکل تو بگلگ دل صور — جسم تو بآب جاں مخمر — اے آمدنت سیلاب ایجاد — وے رفتن تو قیامت ایجاد
تصویر تو از فرنگ حسن ست — نقش تو شریک رنگ حسن ست — اے ماہ لقا و ماہ پیکر — وے ماہ جبیں و ماہ منظر
اے عین تو دلربائی عشق — آئینہ خود نمائی عشق — از رشک جبیں تست یکساں — مہ داغ فروش چہر و نقصاں
تا حسن تو تا ختم بدان رو — عشقت رہ عیش متصل رو — از دفتر حسن نازنیں ست — یک صفحۂ منتخب حسین ست
از شوق تو شد چنان چالاک — از رگ رگ من میاں چو طوطی — جز چین جبیں ازاں سفینہ — حرف دگرم نشد شبینہ
شور تو عیاں نہ بر زبانم — سوز تو نہاں بہ مغز جانم — از چین جبینت اوج حیرت — آب آئینہ موج حیرت
از شعلہ حنت اے دل آرا — در عشق بہ سوختم سراپا — اے خود سر و خود پرست و خود کم — اے زلف تو حلقہ حلقہ دام
اے جلوہ فروش جاں خریدار — اغمزہ ستاع و عشوہ بازار — باشد ز جفا و جور تا چند — پُر حلقہ بکردن دلم بند
تا روے ترا بمن نمودند — در بلاے بلا بمن کشودند — زلف تو کہ رشتہ بیچ جانست — وصف پیچیدہ بر زبانست
تا قد تو شد نہال جانم — ہر شب بفلک رسد فغانم — حرف زلفت کہ تاب دارد — بیچیدگیش کہ تاب دارد
گر قامت تو نہال جانست — بر من بچہ رو قیامت آراست — اے رخ ماہ طلعت من — اے طلعت تو صداقت من
اے باغ بہار و ناز انداز — انداز تو آزیانۂ ناز — ابروے تو گر ہلال عیدست — بالیدن صد جہان امیدست
گر ریز صفاست موج رفتار — نقش قدم تو آئینہ زار — کاہیدن من ز دیدن تست — نو سیدی من ز آفرینست

چشم تو بصد هزار نیرنگ — سازد اشکم همیشه گلرنگ — گفتار خموشی تو با هم — در شعله فشانی اند با هم
چشم تو گرفته دام آبش — تا پرنگنی بجانم آتش — کز شمع زبان زبانه افروخت — یا قوت لبت بخامشی سوخت
چشمت نه تمام قطره آبست — ای شعله نگاه این چه تابست — ای ست طرب خنده ناز — حسن تو نموده زیر لب ساز
آهو نگهت اگرنه وحشیست — از سایه من رمیدنش چیست — باشد همیشه وزدودندان — در رنگ سی خزیده پنهان
سرمایهٔ دل که بود و سودم — وقف تاراج او نمودم — لب بفسوس چو برگشایند — خندان خندان دلم ربایند
هر دم ترگانت ای جفا جو — انگشت زند مرا به پهلو — دل چون شب برند در شب تار — عیار اند در شب تار
مژگان تو خار خار اگر نیست — هر لحظه ز خود در میدریم چیست — ای ناز طلسم و عشوه اعجاز — بر ناز تو ناز میکند ناز
تا گوش ترا من نمودند — حیرت بر حیرتم فزودند — وصف دهن تو حسرت انشا — حرف سخن تو جرأت افزا
در گوش تو در سلسلهٔ زر — خورشید بود ستاره در بر — گر نیست دهان سخن ریز است — ور هست نهان سخن ریز است
وین هر دو زکاکلت نمودار — خورشید ستاره و شب تار — برده دهنت ز صاحبر پها — پیرنگ کزو ز سامر پها
در هاست ز گوش تو هویدا — چندین مه و یک سپهر پیدا — در چاه ذقن ز سحر کامل — آتشکده گشت چاه بابل
از حسرت گوش آن بنا گوش — آب گوهر ز دا ز صد جوش — چاه ذقنت ز جوش تهلیب — از چشمهٔ ماه می برد آب
بینی تو با نظر پسندست — در مجمع حسن سربلندست — دل غرق در دناشکیبست — چاه ذقنت نظر فریبست
بینی به نگه نهال بادام — از خوشه چشمی ببال غاندم — دل بوسهٔ آن دهن نیارد — گویا که لب و دهن ندارد
این تازه نهال در دل زار — خشکی دماغ آورد بار — ای یافته از سربلندی — رعنائی حسن خود پسندی
من سرهوا شدم ز بینی — دور از زده در سم پیشینی — تا گردن دعوی تو شد راست — آمد خم بگردنم راست
از بینی تو سراغ دارم — از حق مگذر دماغ دارم — تا گردن تو بلند گردید — هیکل از خون من پسندید
ای هجر پسند و حور تابان — رخسار تو ماه ماه تابان — گر خون دلم بگردنت نیست — پنهان پنهان بگیسویت
از عکس رخ تو ای پریزاد — آئینه چرخ ماه انجاد — ای شمع گلوی شعله آواز — آواز تو برق پرده ساز
برق رخسارت ای بخاکار — آرام و قرار سوخت یکبار — آواز تو تا صدا به نی زد — آتش غیرت بجان وی زد
این طرفه که دهر دمه تنم سوخت — مهتاب بجانم آتش افروخت — حسرت کف نیستان ز بس بود — هر سال نخود بگاودود و
من سوخته اخترم ز مهتاب — مهتاب آمد ز من بجویاب — دست قدرت چو صنعت انگیخت — در قالب لطف بازوت ریخت
تا ماه رخ تو اخترم سوخت — مهتاب تب پیکرم سوخت — بازوئی تو میکشد سوی عشق — بازوئی تو زده بازوی عشق
ای برده ز من بیک سخن دل — جان بردن ز تست مشکل — از دست عنائی شفق پوش — چون گردی دل آبشه بجوش
تا راه سخن بمن گشودی — رائی بخموشیم نمودی — از رنگ عنائی خون دل بار — بر رنگ خلست خون دل بار

از جلوهٔ آن کف نگارین باشد تا شکم همیشه رنگین.

در دست تو نیست آبگینه خورشید تهی نمود سینه تا راز حیا نگردد افشا لغزید قلم ز دست تا پا

از حلقهٔ آبگینه ات داد کیں طوق جنون بگردن افتاد اے پائے تو داج پائے حسن از پائے تو داج پائے حسن

سرپنجهٔ دست اے پری وش چوں پنجه مرا کند بشوش نقش کف پایت از صفا زد بر زهرهٔ ستاره پشت پا زد

دل نقش نگین خاتمی شد انگشت نمائی عالمی شد تا بر سر دل زدی کف پا آشفت دماغ ما بسودا

اے ناز تو فتنهٔ زمانه انداز تو فتنه را بهانه برپاست ز پائے تو جنونم پامال حوادث ست خونم

از دست حیا که بر رخ آری دل می بری و حجاب میداری اے مهر دلسر بائی سر تا قدم تو بے وفائی

در بردن دل حجاب اگیست در خون من این چه بیحیائیست اے حسن تو در جهان فسانه دل گرمی عشق را بهانه

دلداری و دلبری غریب است گاں ساعالم بگردنت بست حسن تو همیں نه دلربا شد سر تا پائے من بلا شد

اے روی تو رشک ماه و خورشید آغوش تو صبح زار امید خوئے تو من جدا جفا کرد آشوب قیامتم بپا کرد

دل موج صفائی آن بر و دوش دل آئینه زار صبح آغوش روئے تو کند بجفائے دیگر خوئے تو بود بلائے دیگر

از عکس رخ تو سینه یکسر غرق دریائے آب گوهر از گرمی خویتا ے پریزاد افتاد بمن هر آنچه افتاد

از پرتو ماه عارض صاف آئینه فروش سینه تا ناف اے شعله مزاج آتشیں خو از خوئے تو شد فلک جفا جو

آئینهٔ سینه بیقرینه ست راز من و تو عیاں بسینه ست از خوے تو گر سخن برانم آتش افتد نه بر زبانم

نظاره عیاں به بے خودی نیست بر شوق چو طرح گرمی افگند هر جا غضب تو آتش افروخت مشت خاشاک من عجب سوخت

از جوش حیا عیاں شد اے نور بر سینه حباب تلزم نور اول دل من هدف بریزد

ناف تو چو چشمهٔ حیا پاک گرداب نگاه چشم بے باک پیچید زلف تو با من زار

تا کرد نگاه شوخی ابراز بر سینه مرا به بے خودی باز گر باد گری سر عتاب ست با من دو هزار پیچ و تاب ست

لغزید بناف و شد ز حجلت در چاه حیا غریق رحمت اغماض نظر ز دیگر انست با من چشم تو سر گرانست

نام کمر تو بے نشان ست ایں حرف همیشه در میاں ست بر دوے تو گر سخن اے جفا جو گویم بالائے چشمت ابرو

جز نام کمر نشاں نه پیوست جز آنکه تقبل من کمر بست ابروئے تو می کند کماں ساز چشمت بنگاه ناوک انداز

سر عرق حیا ز دانش آرائے از موی میاں تست تا پائے ویں غمزه خدنگ می کشاید آں پشت کماں همی نماید

مهتاب حیات موج اوج دریائے نشاط صبح در موج آخر تو نه گمان آبرو - چوں تیر روی مرا به پهلو

راز یست دریں میانه و بس محرم نشود بجز حیا کس آخر نه من جنوں فسانه هستم به محبت نشانه

واقف نه بود ازیں نهاں راز جز بے خود شوق عاقبت باز اے چشم و چراغ بزم الفت روشن ز تو خانهٔ محبت

اے مہر تو شہرہ بزبان ہا — در دوستی تو داستان ہا — بر ہم نخورد و چرخ احقر — پیمان من و سد سکندر
لطف تو بلائے بے گمانست — پنہاں نگہ تو برق جانست — گفتی کہ اگر سپہر بد خو — در راہ کند وفا نگاپو
اے رحم تو نازیانہ جور — آئین تو دلبری بصد طور — گفتی کہ سپہر ناتوان بیں — آید بجسد گراز در کیں
اے کردہ جہان بخویشتن رام — کفر و اسلام صید یکدام — رنگے ریزد خون ہجراں — نقشے آرد بروے حرماں
اے ناز فروش گرم جوشی — تا کے رسم و فا فروشی — من ہم ز رہ وفا در آیم — حسرت بر حسرتش فزایم
در عین وفا تو بے وفائی — در وقت جفا تو دلربائی — داغے بدلش دہم ز حسرت — خون جگرش کنم بغیرت
اے عہد نہ بستہ در شکستن — پیوند نکردہ در گسستن — آئینہ غیرتش نمایم — حیرت بر حیرتش فزایم
اے سست وفا گسستہ پیماں — الطاف تو قہر بر دل و جاں — با چرخ بجان و دل ستیزم — خاک قدمش بدیدہ ریزم
اے دوستی تو دشمن من — راہ کوئے تو رہزن من — ہرگز نہ کنم ز تو جدائی — ترک رہ و رسم آشنائی
اول تو رہ وفا کشادی — در صید دلم قدم نہادی — ہرگز نہ شود بہ بزم وصلم — چشم بدو در کار محرم
عمرے بکمین من نشستی — دل باد گری چو من نبستی — ہجر من و تو محال لعل است — دور از روش خیال عقل است
دزدیدہ نگاہ دلربائی — وحشت پیغام آشنائی — من از تو بایں فسانہ سازی — خوردم بفسون عقل بازی
یکچند بکوشش نہانی — بنخواند فسون دل ستانی — افسون جنوں چو باد در شد — ایں حرف غلط چو باد در شد
آنگہ ز رہ وفا و یاری — بستی پیمان دوستداری — دردام بلا شدم گرفتار
لب بسلے بفسانہ باز کردی — طومار امل دراز کردی — گفتم کہ کنون ز نقد بیدار — دل را ندہم بدست دلدار
کردی ز رہ وفا شعاری — در راہ محبت تو پویم — از وصل تو کام دل بجویم
گفتی فلک ہزار دیدہ — دلبر بوفائے من ندیدہ — اے داد و ہبا دد امن ناز — دل مست غبار شوق پرواز
از حسن وفا بدو رسن عشق — در یوزہ کند ز طور عشق — آخر تو چہ دیں رسیدی از من — دور از بزم آرمیدی ایمن
سازد بجفائے من مروت — نازد بوفائے من محبت — اے شست بآب بیوفائی — از سینہ حروف آشنائی
روشن کن خاندان حسنم — فخر ہمہ دودمان حسنم — اے بے خبر از طریق یاری — ایں بود طریق غمگساری؟
باشد ز من آبروئے الفت — سرسبزی گلشن محبت — ایں بود قرار دل ستانی؟ — ایں بود بہار مہربانی؟
در طینت من وفاست مضمر — از آب وفا گلم مخمر — ایں بود نسیم باغ الفت؟ — رنگ و بوئے گل محبت؟
ضرب المثل جہان وفاتم — شوریست ز حسن آفاقم — پیمان محبت تو ایں بود؟ — بنیان محبت تو ایں بود؟
پیوستہ خورد بمن نکوئے — سوگند وفا و خو بروئے — گاہے بروہ وفا نپوئی — احوال دلم گہے بجوئی
برداشتہ چرخ ناتوان نگ — از داغ وفا پرستیم ننگ — بارے بلغلط نہ گاہ گاہے — بر عہد و قرار خود نگاہے

من بے تو نزار زار و افگار — در تاب و تب و فاگر فتار
از برق عنان گسسته تر تاخت — جانم همه جسم عافیت باخت

هر روز چو روز در تب و تاب — هر شب چون شب تپه و بیتاب
صبر آرام و تاب و طاقت — آئین نشاط و رسم راحت

از نالهٔ من جهان پر آشوب — آهم بفغان قیامت آشوب
یکباره وداع من نمودند — وحشت بر و چشم فرودند

اے داده بآب بے نیازی — بنیاد بنائے دلنوازی
آنگه من و دل بفکر رویت — بودیم بهم بگفت و گویت

تا چند بود بلائے هجران — تا کے باشد جفائے حرمان
دل شد ز برم بدین بهانه — کادر سر راغ تو نشانه

در هجر تو اے مه شب افروز — شامم چون صبح اختر روز
آواره وش اوفتاد کوئے تو شد — من بے دل و دل بسوئے تو شد

دریاد تو لئے ز خود فراموش — شد دیده دل بهار خونجوش
از گردهٔ خود شوند پشیمان — تنها من و صد جفائے هجران

در دوستی تو اے دل زار — دل نیست بگفته من زار
هم روح و روان من تو باشی — من جسم و جان من تو باشی

افسون جنون زند چو بر هوش — دیوانه کجا سخن کند گوش
از محنت جسم و جان در رنج — دریاب که نکته است چون گنج

هم دل بتو اتفاق ورزید — هم دیده بمن نفاق ورزید
اے باد صبا تو ئی وفا سنج — آگاه خبر ز راحت و رنج

چشم چو ترا بمن نمودند — رمز نگهت بدل کشودند
بیماری تو شفائے جانها — غم خواری تو دوائے جانها

در خانه دل ترا نشاندند — مژگان ز هر تو تم فشاندند
آزاده وشی زناں هیکل — بزمی آئی بگرد عالم

آنگه در گریه باز کردند — غمازی تازه ساز کردند
سیاحی دلازمی کنی سیر — اوضاع جهان ز کعبه تا دیر

اشکم چون گشت آبرو پاش — راز هم همه ز آب دیده شد فاش
از فیض تو خاطرے که یابد — از سبزهٔ چرخ تازگی چید

اے وصل تو دیده مایهٔ عمر — از هجر تو بست پایه عمر
از تو دو لهائے غنچه سلاں — گلهائے شگفتگی بداماں

در وصل تو خار خار اغیار — هجر تو بصد جفا دل آزار
سحر است سخن گزاری تو — روشن دل سر راز داری تو

اصل تو سیک عنان بازخواب — دارد چه قدر هلال مهتاب
از راه وفا دلے گر آری — بر منزل ماه من گزاری

هجر تو گراں وقت چون کوه — باشد قطب سپهر اندوه
یک ره ز کرم تو اے وفا کوش — شرح هجراں که کردهٔ گوش

وصل تو سراب بود نمود — تا کے باشد نمود بے بود
رازے که بگوش دل شنیدی — رازے که عیاں بچشم دیدی

هجر تو کنول قیامت انگیز — طوفان بلا دمو ج بیداد
پنهاں پنهاں بگوش آن ماه — القصه بگو و قصه کوتاه

کھچڑ ✣

جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

بابو کندن لال کچہری سے لوٹے، تو دیکھا کہ ان کی بیوی ایک کنجڑن سے کچھ ساگ بھاجی لے رہی ہیں کنجڑن پالک ٹکہ سیر کہتی ہے وہ ڈیڑھ پیسہ دے رہی ہیں۔ اس پر کئی منٹ جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر کنجڑن ڈیڑھی پیسہ پر راضی ہو گئی۔ اب ترازو اور باٹ کا سوال چھڑا۔ دونوں پلڑے برابر نہ تھے۔ ایک میں پاسنگ تھا۔ باٹ بھی پورے نہ اترتے تھے۔ پڑوسن کے گھر سے سیر آیا۔ ساگ تل جانے کے بعد اب روکن کا سوال اٹھا۔ بیوی اور مانگتی تھیں کنجڑن کہتی تھی کہ اب کیا سیر دو سیر گھاتے میں ہی لے لوگی بی بی۔ خیر آدھے گھنٹہ میں یہ سودا پورا ہوا۔ اور کنجڑن پھر کبھی نہ آئینگی دہمکی دیکر رخصت ہوئی۔ کندن لال کھڑے کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ کنجڑن کے جانے کے بعد بیوی پانی لائی تو آپ نے کہا۔ آج تو تم نے ذرا سا ساگ لینے میں پورا آدھا گھنٹہ لگا دیا۔ اتنی دیر میں تو ہزار پالنسو کا سودا ہو جاتا۔ ذرا دو ذرا سے ساگ کیلئے مٹائین مٹائیں کرتے تمہارا سر بھی نہیں دکھتا؟ رامیشوری نے کچھ شرمندہ ہو کر کہا "پیسے مفت میں تو نہیں آتے" "یہ ٹھیک ہے لیکن وقت کی بھی تو کچھ قیمت ہے۔ اتنی دیر میں تم نے بڑی مشکل سے ایک دھیلے کی بچت کی کنجڑن نے بھی دل میں کہا ہوگا کہاں کی گنوار ان ہے۔ اب شاید بھول کر بھی ادھر نہ آئے"

"تو پھر مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ پیسے کی جگہ دھیلے کا سودا لیکر بیٹھ جاؤں"

"اتنی دیر میں تو تم نے کم سے کم بیس ورق پڑھے ہوتے۔ کل مہری سے گھنٹوں سر مارا۔ پرسوں دودھ والے کے ساتھ گھنٹوں ہاشمی بحث کی زندگی کیا انہی باتوں میں صرف کرنے کے لئے عطا ہوئی ہے"

کندن لال ہر وقت بیوی کو نصیحت کرتے رہتے تھے یہ ان کا دوسرا بیاہ تھا۔ رامیشوری کو آئے ابھی دو تین ہی مہینے ہوئے تھے۔ اب تک تو بڑی نند اوپر کے کام کیا کرتی تھیں۔ پر رامیشوری کی ان سے نہ نبھ سکی۔ اس کو معلوم ہوتا تھا یہ تو سارا دھن ہی لٹائے دیتی ہیں۔ آخر وہ چلی گئیں۔ تب سے رامیشوری ہی گھر کی مالک ہے۔ وہ بہت چاہتی ہے کہ شوہر کو خوش رکھے ان کے اشاروں پر چلتی ہے ایک بار جو بات سن لیتی ہے گرہ باندھ لیتی ہے۔ پر روز ہی تو کوئی نہ کوئی نئی بات ہو جاتی ہے۔ اور کندن لال کو اسے نصیحت کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

✣ فلرٹ نگار منشی پریم چند کے ایک افسانہ کا ترجمہ

ایک دن بلّی دودھ پی گئی۔ رامیشوری دودھ گرم کرکے لائی۔ اور میاں کے سرہانے رکھ کر پان بنا رہی تھی کہ بلّی نے دودھ پر اپنا قبضہ جمالیا۔ رامیشوری کو قرقی گوارا نہ ہوسکی۔ رول کے کر بلّی کو اتنے زور سے مارا کہ وہ دو تین لڑکیاں کھا گئی۔

کندن لال لیٹے لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ بولے۔ "اور جو مر جاتی"؟

رامیشوری نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "تو میرا دودھ کیوں پی گئی"؟

"اسے مارنے سے دودھ مل تو نہیں گیا۔"

"جب کوئی نقصان کر دیتا ہے تو اس پر غصہ آتا ہی ہے۔"

"نہ آنا چاہئے جانور کے ساتھ آدمی کیوں جانور ہو جائے؟ آدمی اور جانور میں اس کے سوا اور کیا فرق ہے۔"

کندن لال کئی منٹ تک رحم، حزم اور صبر و تحمل کی تعلیم و تلقین کرتے رہے حتیٰ کہ بیچاری رامیشوری مارے پیٹے کے بغیر رو پڑی۔ اسی طرح ایک دن رامیشوری نے ایک بھکاری کو دتکار دیا۔ تو بابو صاحب نے پھر نصیحت کرنی شروع کی۔ بولے تم سے نہ اٹھا جاتا ہو۔ تو لاؤ میں دے آؤں۔ غریب کو یوں نہ دتکارنا چاہئے۔" رامیشوری نے تیوری چڑھائے ہوئے کہا۔ "دن بھر تو تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی کہاں تک دوڑے سارا دیس بھیک منگوں ہی سے بھر گیا ہے۔" شائد کندن لال نے تجاہل عارفانہ سے مسکرا کر کہا۔ "اسی دیس میں تم بھی بستی ہو۔" "اتنے بھیک منگے آکہاں سے جاتے ہیں؟ یہ سب کام کیوں نہیں کرتے؟" "گوئی آدمی اتنا کمینہ نہیں ہوتا جو کام ملنے پر بھیک مانگے۔ ہاں شہدے ہو تو دوسری بات ہے۔ شہدوں کا بھیک کے سوا اور کیا سہارا ہو سکتا ہے۔" "سرکار ان کے لئے یتیم خانے کیوں نہیں کھلواتی؟" "جب سوراج مل جائیگا تب شائد کھل جائیں ابھی تو کوئی توقع نہیں ہے مگر سوراج بھی دھرم ہی سے آئیگا۔" "لاکھوں سادھو سنیاسی پنڈت پجاری مفت کا مال اڑاتے ہیں کیا اتنا دھرم کافی نہیں ہے؟ اگر اس دھرم سے سوراج ملتا تو کب کا مل چکا ہوتا" "اسی دھرم کی برکت ہے کہ ہندو قوم ابھی تک زندہ ہے ورنہ کب کے تحت الثریٰ پہنچ چکی ہوتی۔ روم، یونان، ایران، سیریا کسی کا اب نشان بھی نہیں ہے۔ یہ ہندو قوم ہی ہے جو ابھی تک زمانہ کی جفا کاریوں کا مقابلہ کرتی چلی جاتی ہے۔" "آپ سمجھے ہونگے ہندو قوم زندہ ہے۔ میں تو اسے اسی دن سے مردہ سمجھتی ہوں جس دن سے وہ محکوم ہو گئی ہے۔ زندگی آزادی کا نام ہے غلامی موت ہے۔"

کندن لال نے نوجوان بیوی کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھا ایسے باغیانہ خیالات اس میں کہاں سے آگئے؟ دیکھنے میں تو وہ بالکل بھولی بھالی تھی۔ سمجھے کہیں سن سنا لیا ہوگا۔ کڑک کر کہا "کیا بے کار جھگڑا کرتی ہو خرما تی تو نہیں، ہو بے اور بک بک کرتی ہو۔" رامیشوری یہ پھٹکار پاکر چپکی ہو گئی۔

یک لمحہ وہاں کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ کمرے سے چلی گئی۔

(۳)

ایک دن کندن لال نے کسی دوست کی دعوت کی۔ رامیشوری سویرے سے پکوان میں لگ گئی۔ تو شام تک سر نہ اٹھا سکی۔ اسے یہ بیگار بری معلوم ہو رہی تھی۔ اگر دوست احباب کی ضیافت کرنی تھی تو کھانا پکانے کا کوئی انتظام کیوں نہیں کیا؟ سارا بوجھ اسی کے سر کیوں ڈال دیا؟ اس سے ایک بار پوچھ تو لیا ہوتا کہ دعوت کروں یا نہیں۔ ہوتا تب بھی یہی جواب ہو رہا تھا وہ دعوت کے معاملے کی بڑی خوشی سے تائید کرتی۔ نہیں وہ سمجھتی دعوت میں کر رہی ہوں۔ اب وہ سمجھ رہی تھی مجھ سے بیگار لی جا رہی ہے۔ خیر کھانا تیار ہوا۔ لوگوں نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ مگر منشی جی منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ رامیشوری نے کہا "تم کیوں نہیں کھا لیتے یا ابھی سویرا ہے؟"

بابو صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "کیا کھا لوں۔ یہ کھانا ہے یا بیلوں کی غذا ہے"۔

رامیشوری کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ سارا دن چولھے کے سامنے جلی۔ اس کا یہ صلہ ہے۔ بولی۔ "مجھ سے جیسا ہو سکا پکایا۔ جو بات اپنے بس کی نہیں ہے۔ اس کے لئے کیا کرتی؟"

"پوریاں نمکین ہیں!"

"ہو نگی"

"کچوری میں اتنا نمک تھا کہ کسی نے چھوا تک نہیں"

"ہو گا"

"حلوہ ابھی طرح بھنا نہیں۔ کچا ہنڈا رہی تھی"

"آتی ہو گی"

"شوربا اتنا پتلا تھا جیسے چاء"

"ہو گا"

"عورت کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پکوان کے کام میں ہوشیار ہو"

پھر نصیحتوں کا تار باندھا۔ یہاں تک کہ رامیشوری تنگ آکر چلی گئی۔

(۴)

پانچ چھ مہینے گذر گئے۔ ایک دن کندن لال کے ایک دور کے رشتہ دار ملنے آئے۔ رامیشوری کو جونہی اس کی خبر ملی ناشتہ کے لئے مٹھائی بھیجی، اور مہری سے کہلا بھیجا۔ آج یہیں کھانا تناول فرمائیے گا۔

وہ صاحب پھولے نہ سمائے۔ بوریا بدھنا لے کر پہنچ گئے اور ڈیرا ڈال دیا۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ مگر آپ ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ آؤ بھگت میں کوئی کمی ہوتی تو شاید انہیں کچھ فکر ہوتی۔ پر رامیشوری ان کی خاطر توضع میں جی جان سے لگی ہوئی تھی۔ پھر وہ بھلا کیوں ہٹنے لگے۔ ایک دن کندن لال نے کہا "تم نے یہ برا روگ پالا"۔ رامیشوری نے چونک کر پوچھا۔ کیسا روگ؟

"انہیں ٹلا کیوں نہیں دیتیں؟" میرا کیا بگاڑ رہے ہیں؟"

"کم سے کم روزانہ ایک روپیہ کی چپت دے رہے ہیں اور اگر یہی خاطر داری رہی تو شاید جیتے جی ٹلیں گے یا نہیں"

"مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی دو چار دن کے لئے آجائے تو اس کے سر ہو جاؤں۔ جب تک اس کی خواہش ہو رہے"

"ایسے سفت خوروں کی خاطر داری کرنی پاپ ہے۔ اگر تم نے اسے اتنا سر نہ چڑھایا ہوتا۔ تو اب تک لمبا ہو گیا ہوتا۔ جب دن میں تین دفعہ ناشتہ۔ تین مرتبہ کھانا اور پچاسوں بار پان ملتے ہیں تو اسے کتے نے کاٹا ہے، جو اپنے گھر جائے"۔ روٹی کا چور بنا تو اچھا نہیں!"

"لائق اور نالائق کا خیال تو کر لینا چاہئے۔ ایسے احمقوں کو کھلانا پلانا در اصل انہیں زہر دینا ہے۔ زہر سے تو جان جاتی ہے یہ خاطر داری تو آتما کی سیتاناس کر دیتی ہے۔ اگر یہ حضرت مہینے بھر بھی یہاں رہ گئے تو پھر زندگی بھر کے لئے بیکار ہو جائیں گے پھر ان سے کچھ نہ ہو سکیگا۔ اور اس کا سارا الزام تمہارے سر رہیگا"۔ دلائل کا سلسلہ بند ہو گیا۔ نظائر کی جھڑی لگ گئی۔ رامیشوری کھسیا کر چلی گئی۔ کندن لال کو اس سے کب صبر آ سکتا ہے۔ ان کے نصائح کی بارش کبھی بند بھی ہو سکتی ہے۔ یہ سوال اس کے دل میں بار بار اٹھنے لگا۔

(۵)

ایک دن دیہات سے بھینس کا تازہ گھی آیا۔ ادھر مہینوں سے بازار کا گھی کھاتے کھاتے ناک میں دم ہو رہا تھا۔ رامیشوری نے اسے کھولایا۔ اس میں لونگ ڈالی اور کڑاہی سے نکال کر ایک مٹکی میں رکھ دیا اس کی سوندھی سوندھی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ مہری چوکا برتن کرنے آئی، تو اس نے چاہا کہ مٹکی کو چولہے سے اتار کر چبوترے یا آلے پر رکھ دے۔ پر اتفاق کی بات اس نے مٹکی اٹھائی تو وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، سارا گھی بہ گیا۔ دھماکا سن کر رامیشوری دوڑی، تو مہری کھڑی رو رہی تھی اور مٹکی چور چور ہو گئی تھی تڑپ کر بولی "مٹکی کیسے ٹوٹ گئی؟ میں تیری طلب سے کاٹ لونگی رام رام! سارا گھی مٹی میں ملا دیا! تیری آنکھیں پھوٹ گئی تھیں یا ہاتھوں میں دم نہیں تھا؟ اتنی دور سے منگایا، اتنی محنت سے گرم کیا، مگر ایک بوند بھی حلق کے اندر نہ گئی۔ اب کھڑی

کیا بسور رہی ہے۔ جا اپنا کام کر۔" مہری نے آنسو پونچھ کر کہا "بی بی اب تو غلطی ہوگئی۔ چاہے طلب کاٹو چاہے جان مارو۔ میں نے تو سوچا۔ اوٹھا کر آلے پر رکھ دوں تو چوکا لگاؤں۔ کیا جانتی تھی کہ قسمت میں یہ لکھا ہے۔ نہ جانے کس کمبخت کا منہ دیکھ کر اوٹھی تھی۔"

رامیشوری "میں کچھ نہیں جانتی سب روپے تیرے طلب سے وصول کرونگی ایک روپیہ جرمانہ نہ کیا تو کہنا۔"

مہری "مرجا ونگی سرکار لیکن ایک پیسہ کا ٹھکانہ نہیں ہے۔"

رامیشوری "مرجا جی جا میں کچھ نہیں جانتی۔"

مہری نے ایک منٹ تک کچھ سوچا اور بولی۔ اچھا کاٹ لیجئے گا۔ سرکار۔ آپ سے صبر نہیں ہوتا میں صبر کر لونگی۔ یہی نہ ہوگا بھوکوں مرجاؤنگی۔ جی کر کون سا سکھ بھوگ رہی ہوں کہ مرنے کو ڈروں سمجھ لونگی ایک مہینہ کوئی کام نہیں کیا۔ آدمی سے بڑا بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ یہ تو گھی ہی تھا۔"

رامیشوری کو ایک ہی لمحہ میں مہری پر رحم آگیا۔ بولی "تو بھوکوں مرجا یگی تو میرا کام کون کریگا۔"

مہری "کام کرنا ہوگا کھلائیگا نہ کام کرانا ہوگا بھوکوں ماریگا۔ آج سے آکر آپ ہی کے در پہ سویا کرونگی۔"

رامیشوری "سچ کہتی ہوں۔ آج تو نے بڑا نقصان کر ڈالا۔"

مہری "میں تو آپ ہی پچھتا رہی ہوں سرکار۔"

رامیشوری "جا گوبر سے چوکا لیپ دے۔ مٹکی کے ٹکڑے دور پھینک دے اور بازار سے گھی لیتی آ۔"

مہری نے خوش ہو کر چوکا گوبر سے لیپا اور مٹکی کے ٹکڑے بٹور ہی رہی تھی کہ کندن لال آگئے۔ اوہ اندی پڑی دیکھ کر بولے "یہ ہانڈی کیسے لوٹ گئی؟"

رامیشوری نے کہا۔ مہری اوٹھا کر اوپر رکھ رہی تھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔"

کندن لال نے چلا کر کہا "تو سب گھی بہ گیا؟"

"اور کیا کچھ بچ بھی رہا"

"تم نے مہری سے کچھ کہا نہیں؟"

"کیا کہتی۔ اس نے جان بوجھ کر تو گرا نہیں دیا"

"یہ نقصان کون اٹھائیگا"؟

"ہم اٹھائیں گے اور کون اوٹھائیگا۔ اگر میرے ہی ہاتھ سے چھوٹ پڑتی تو کیا ہاتھ کاٹ لیتی"

کندن لال نے ہونٹ چبا کر کہا "تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی جس نے نقصان کیا ہے اس سے وصول ہونا چاہیئے۔ یہی خدائی قانون ہے آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جان کے بدلے جان۔ یہ عیسیٰ مسیح جیسے رحم دل بزرگ کا کہنا ہے۔ اگر تاوان کا دستور دنیا سے اٹھ جائے تو یہاں رہے کون؟ ساری زمین خون سے سرخ ہو جائے۔ قاتل دن دھاڑے لوگوں کا گلا کاٹنے لگیں۔ تاوان ہی سے سماج کی آبرو قائم ہے۔ جس دن وہ نہ رہیگا۔ دنیا نہ رہیگی۔ منو قدیم سمرتی کے مصنف بیوقوف نہیں تھے جو تاوان کے قانون کو اتنی اہمیت دے گئے۔ اور کسی خیال سے نہیں تو تحفظ عزت کے خاطر ہی تاوان ضرور دینا چاہیئے۔ یہ روپیے مہری کو دینے پڑیں گے اس کی مزدوری کاٹنی پڑیگی۔ نہیں تو آج اس نے گھی کا گھڑا گرا دیا ہے۔ کل کو کوئی اور نقصان کر دیگی"۔

رامیشوری نے ڈرتے ڈرتے کہا "میں نے اسے معاف کر دیا ہے"۔

کندن لال نے آنکھیں نکال کر کہا "لیکن میں نہیں معاف کر سکتا"۔

مہری دروازہ پر کھڑی یہ قصہ سن رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ کندن لال کا غصہ بڑھتا ہی جاتا ہے اور میری وجہ سے رامیشوری کو گھرکیاں سننی ہی پڑ رہی ہیں تو وہ سامنے جا کر بولی "بابو جی اب تو قصور ہو گیا۔ آپ سب روپیے میری طلب سے کاٹ لیجئے۔ روپیے نہیں ہیں ورنہ ابھی لا کر آپ کے ہاتھ میں رکھ دیتی"۔

رامیشوری نے اسے ڈانٹ کر کہا "جا بھاگ یہاں سے۔ تو کیا کرنے آئی ہے؟ بڑی روپیے والی بنی ہے۔!"

کندن لال نے بیوی کی طرف غیظ آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تم کیوں اس کی وکالت کر رہی ہو؟ یہ موٹی سی بات ہے اور اسے ایک بچہ بھی سمجھتا ہے کہ جو نقصان کرتا ہے اسے اس کا ڈنڈ بھگتنا پڑتا ہے۔ میں کیوں پانچ روپیے کا نقصان اٹھاؤں؟ وجہ؟ کیوں نہیں اس نے مٹکے کو سنبھال کر پکڑا کیوں اتنی جلد بازی کی۔ کیوں تمہیں بلا کر مدد نہیں لی۔ یہ صاف اسکی لاپرواہی ہے"۔

یہ کہتے ہوئے کندن لال باہر چلے گئے۔

(۶)

رامیشوری اس بے غیرتی سے رنجیدہ ہو گئی۔ ڈانٹنا ہی تھا تو کمرے میں بلا کر تنہائی میں ڈانٹتے۔ مہری کے

سامنے اسے روئی کی طرح توم ڈالا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کون تماش کے آدمی ہیں۔ آج ایک بات کہتے ہیں کل اس کو کاٹتے ہیں جیسے کوئی مشتون مزاج آدمی ہو۔ کہاں تو رحم اور کرم کے اوتار بنتے تھے کہاں آج پانچ روپیے کے لئے جان دینے لگے۔ بڑا مزہ آجائے۔ جو کل مہری بیٹھ رہے۔ کبھی تو ان کے منہ سے تعریف کا ایک کلمہ نکلا ہوتا! اب مجھے بھی اپنی عادت بدلنی پڑیگی۔ یہ سب میری سادگی کا نتیجہ ہے جون جوں میں طرح دیتی ہوں آپ جامہ سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ایک کہین تو دو سناؤں۔ آخر کب تک اور کہاں تک سہوں! کوئی حد بھی ہے! جب دیکھو ڈانٹ رہے ہیں۔ جس کے مزاج کا پتہ ہی نہیں ہوا سے کون خوش رکھ سکتا ہے۔ اس دن ذرا سا بلی کو مار دیا تو آپ دیا کا اپدیش کرنے لگے۔ آج وہ رحم کہاں گیا ان کو ٹھیک کرنے کی تدبیر یہی ہے کہ سمجھ لوں۔ کوئی کتا بھونک رہا ہے نہیں ایسا کیوں کروں۔ اپنے دل سے کوئی کام ہی نہ کروں۔ جو یہ کہیں وہی کروں نہ جو بھر کہ نہ جو بھر زیادہ جب انہیں میرا کوئی کام پسند ہی نہیں آتا تو مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے جو خواہ مخواہ اپنی ٹانگ اڑاؤں۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ وہ رات بھر اسی ادھیڑ بن میں پڑی رہی۔ سویرے کندن لال ندی کو آشنان کرنے گئے۔ لوٹے تو نو بج گئے تھے۔ گھر میں جا کر دیکھا تو جوکھ کا برتن نہ ہوا تھا۔ پریشان ہو گئے بولے "چھاکھیا مہری نہیں آئی"؟

رامیشوری۔ "نہیں"۔

کندن لال۔ "تو پھر"۔

رامیشوری۔ جو آپ کا حکم۔

کندن لال۔ "یہ تو بڑی مشکل ہے"۔

رامیشوری۔ "ہاں ہے تو"۔

کندن لال۔ "پڑوس کی مہری کو کیوں نہ بلا لیا"؟

رامیشوری۔ "کس کے حکم سے بلاتی۔ اب حکم ہوا ہے بلائے لیتی ہوں"۔

کندن لال۔ "اب بلاؤ گی تو کھانا کب پکیگا! نو بج گئے ہیں اتنا تو تمہیں اپنی عقل سے کام لینا چاہئے تھا کہ مہری نہیں آئی تو پڑوس والی کو بلا لیتیں"۔

رامیشوری۔ "اگر اس وقت سرکار پوچھتے کیوں دوسری مہری بلائی تو کیا جواب دیتی! اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا اب تمہاری عقل ہی سے کام لونگی۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے آنکھیں دکھائے"۔

کندن لال۔ "اچھا تو اس وقت کیا ہوتا ہے"؟

رامیشوری "جو حضور کا حکم ہو"

کندن لال "تم مجھے بناتی ہو"؟

رامیشوری "میری اتنی مجال کہ آپ کو بناؤں۔ میں تو حضور کی لونڈی ہوں۔ جو کہئے وہ کروں"

کندن لال "میں تو جاتا ہوں تمہارا جو جی چاہے کرو"

رامیشوری "جایئے میرا جی کچھ نہیں چاہے گا اور نہ کچھ کروں گی"

کندن لال "آخر تم کیا کھاؤ گی"؟

رامیشوری "جو آپ دے دیں گے وہ کھالوں گی"

کندن لال "لاؤ بازار سے پوریاں لادوں"

رامیشوری روپیہ نکال لائی کندن لال پوریاں لائے اس وقت کا کام چلا۔ دفتر گئے۔ لوٹے تو دیر ہو گئی تھی آتے ہی آتے پوچھا "مہری آئی"؟

رامیشوری "نہیں"

کندن لال "میں نے تو کہا تھا پڑوس والی کو بلا لینا"

رامیشوری "بلایا تھا۔ وہ پانچ روپیے مانگتی ہے"

کندن لال "تو ایک ہی روپیہ کا فرق تھا کیوں نہیں رکھ لیا"؟

رامیشوری "مجھے یہ حکم نہیں ملا تھا۔ مجھ سے جواب طلب ہوتا کہ ایک روپیہ زیادہ کیوں دے دیا۔ خرچ کی کفایت پر نصیحت ہونے لگتی تو کیا کرتی"

کندن لال "تم بالکل مورکھ ہو"

رامیشوری "بالکل"

کندن لال "تو اس وقت بھی بھوجن نہ بنے گا"؟

رامیشوری "مجبوری ہے"

کندن لال سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ یہ تو نئی آفت گلے پڑی۔ پوریاں انہیں پسند نہیں تھیں دل میں بہت جھنجھلائے۔ رامیشوری کو دو چار الٹی سیدھی سنائی لیکن اس نے سنا ہی نہیں۔ کچھ بس نہ چلا تو مہری کی تلاش میں نکلے۔ گھر جس کے ہاں گئے معلوم ہوا مہری کام کر کے چلی گئی۔ آخر ایک کہار ملا اُسے بلا لائے کہ برتن دھو آئے اور برتن دھو کر چلتا بنا۔

رامیشوری نے کہا "بھوجن کیا بنے گا"؟

کندن لال "روٹی ترکاری بنا لو۔ یا اس میں بھی کچھ مصیبت ہے"۔

رامیشوری "ترکاری گھر میں نہیں"۔

کندن لال "دن بھر بیٹھی رہی ترکاری بھی نہ لیتے بنی؟ اب اتنی رات گئے ترکاری کہاں ملیگی"

رامیشوری "مجھے ترکاری رکھنے کا حکم نہ ملا تھا میں پیسہ دھیلا زیادہ دے دیتی تو؟"

کندن لال نے غصہ سے دانت پیس کر کہا "آخر تم کیا چاہتی ہو؟"

رامیشوری نے آہستہ سے جواب دیا۔ کچھ نہیں فقط بے عزتی منظور نہیں"۔

کندن لال "تمہاری بے عزتی کون کرتا ہے؟"

رامیشوری "آپ کرتے ہیں"۔

کندن لال "تو میں گھر کے معاملے میں کچھ نہیں بولوں؟"

رامیشوری "آپ نہ بولیں گے تو کون بولیگا۔ میں تو صرف حکم کی تابعدار ہوں۔ رات روٹی دال پر کٹی دونوں آدمی لیٹے۔ رامیشوری کو تو فوراً نیند آگئی۔ کندن لال بڑی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اگر رامیشوری اسی طرح ہٹ کریگی تو ایک دن بھی کام نہ چلیگا۔ آج ہی بڑی مشکل سے کھانا ملا۔ اس کی سمجھ ہی الٹی ہے میں کچھ سمجھاتا ہوں کچھ سمجھتی ہے' ڈانٹ رہا ہوں۔ مجھ سے بغیر بولے رہا بھی نہیں جاتا لیکن اگر بولنے کا یہ نتیجہ ہے تو پھر بولنا فضول ہے۔ نقصان ہوگا بلا سے۔ یہ تو نہ ہوگا کہ دفتر سے آکر بازار بھاگوں۔ مہری سے روپے وصول کرنے کی بات اسے بڑی لگی اور تھی بھی۔ بیچارو پیسے تو نہ ملے الٹے مہری نے کام چھوڑ دیا۔ رامیشوری کو جگا کر بولے کتنا سوتی ہو تم"؟

رامیشوری "مزدوروں کو اچھی نیند آتی ہے"۔ کندن لال "چڑھاؤ مہری سے روپے نہ وصول کرنا"۔

رامیشوری "وہ تو لئے کھڑی ہے شاید"۔ کندن لال "اسے معلوم ہو جائیگا تو کام کرنے آئیگی"۔

رامیشوری "اچھی بات کہلا بھیجو گی"۔ کندن لال "آج سے میں کان پکڑتا ہوں تمہارے بیچ میں نہ بولونگا"

رامیشوری "اور جو میں گھر لٹا دوں تو؟" کندن لال "لٹا دو، مگر رو دھو مت۔ اگر تم کسی بات میں میری صلاح پوچھو گی تو دے دونگا ورنہ منہ نہ کھولونگا"۔

رامیشوری "میں بے عزتی نہیں سہہ سکتی"۔

کندن لال "اس غلطی کو معاف کرو"۔

رامیشوری "سچے دل سے کہتے ہو نا؟"

کندن لال "سچے دل سے"۔

رنگِ تغزل

از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی اے ایل ایل بی وکیل گجرات

مرجھائے جلوۂ ایمن کہاں — اب وہ عشق زندگی دشمن کہاں
غم کی تاریکی غریق نور ہو — ساقیا وہ بادۂ روشن کہاں
مسکرا دیتے ہو اب شکووں پہ تم — اب وہ انداز خم گردن کہاں
پی چکے صہبائے رنگین پی چکے — کیفہائے چشم جادو فن کہاں
چشم پرنم کی بہاریں ہو چکیں — حسرتِ رنگینیٔ دامن کہاں
یوں تو گلشن بھی ہے فردوس شمیم — آپ کی خوشبوئے پیراہن کہاں
اس گل خوبی سے تھی ساری بہار — اب فروغ زینت گلشن کہاں
اب کہاں مہکے ہوئے پھولوں کے ہار — وصل و عشرت کی شب روشن کہاں
رحم شیوں پر انہیں آتا مگر — دل حریف ذلتِ شیون کہاں
ہائے وہ عہد محبت کی غزل — آہ وہ انداز آتش زن کہاں

بجلیوں سے عشق ہے عابد مجھے
اب غم بربادیٔ خرمن کہاں

قرض خواہ

مترجمہ جناب مختار عابدی صاحب

(۱)

دیونا ٹ دس برس سے ایک بنک میں قرض وصول کرنیکی خدمت پر متعین تھا۔ وہ ایمانداری اور خدمت گذاری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ ملازمت کے طویل عرصہ میں کبھی کوئی عیب اس میں نہیں پایا گیا اور اس کے بہی کہاتے میں کبھی ایک پیسے کی غلطی درج نہ ہوئی تھی۔

وہ تنہا تھا بہت خوش تھا اور اپنی قسمت پہ بھروسہ کیے بیٹھا تھا۔ نئے دوستوں سے راہ و رسم پیدا کرنا اس نے بالکل ترک کر دیا تھا۔ وہ عشق و محبت کے معاملات سے بھی بالکل انجان اور آزاد تھا۔ اگر کبھی کوئی اس سے دریافت کرتا کہ بڑی رقمیں قرض لینے میں کیا حرج ہے؟ تو وہ جواب دیتا۔ "کیون! روپیہ جو تمہارا نہیں وہ درحقیقت روپیہ نہیں" جس محلہ میں وہ رہتا تھا لوگ اُسے ایک قابل شخصیت تصور کرتے تھے اور اکثر اس سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے۔

ایک روز شام کو وہ قرض وصول کرنے کے بعد واپس نہ آیا۔ اس کے متعلق کبھی کسی کو بے ایمانی کا خیال نہ گذرا تھا تاہم یہ ممکن تھا کہ اس دن اس نے کوئی جرم کیا ہو پولیس کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تمام بل وقت مقررہ پر وصول کر کے سات بجے شام کو اس نے مونٹ روڈ گیٹ کے قریب آخری رقم وصول کی تھی اس وقت اس کے پاس دو لاکھ فرانک (فرانسیسی سکہ) سے زیادہ تھے اس کے بعد پھر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ لوگوں نے قلعہ کے اطراف ویران پڑے ہوئے کھنڈروں اور فوجی کوارٹروں میں تلاش کیا لیکن وہ نہ ملنے والا ٹھکانہ ملا۔ انہوں نے سرحدی اسٹیشنوں کو بھی تار دیا لیکن بنک کے ڈائرکٹر اور پولیس کو یقین ہو گیا کہ اسے ڈاکوں نے لوٹ کر دریا میں پھینکدیا ہوگا۔ اور یہ کہ پیشہ ور چوروں نے پہلے ہی سے اس قسم کی سازش کر رکھی ہوگی۔

جب پولیس تحقیقات میں مصروف تھی تو دیونا ٹ دریائے سین کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے دو لاکھ فرانک اپنے جیب میں رکھ لئے۔ دریا کے پل کی ایک کمان کے نیچے اس نے بنک کی وردی اتار ڈالی۔ اُسے ایک گٹھڑی بنا کر ایک وزنی پتھر سے باندھ دیا اور دریا میں ڈبو دیا۔ اب وہ نہایت مطمئن انداز سے پیرس کی طرف روانہ ہوا۔ رات کو وہ ایک ہوٹل میں بہت گہری اور سکون کی نیند سویا۔

چند گھنٹوں میں وہ ایک پکا چور بن گیا تھا۔

(۲)

صبح کو اس نے دو لاکھ فرانک ایک لفافہ میں رکھے اس پر پانچ مہریں لگائیں اور ایک وکیل کے پاس جا پہنچا۔ "جناب میں ایک ضرورت سے آپ کے پاس آیا ہوں اس لفافہ میں کچھ ایسے ضروری کاغذات ہیں جنہیں میں حفاظت سے رکھنا چاہتا ہوں میں ایک دور دراز سفر پر جا رہا ہوں اور یہیں کہہ سکتا کہ کب واپس آؤنگا۔ میں یہ لفافہ آپ کے پاس بطور امانت رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس میں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" "نہیں کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس کی رسید بھی دونگا۔"

اس نے منظور کر لیا اور سوچنے لگا۔ "رسید؟" وہ کہاں رکھیگا۔ کس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ اپنا اصلی نام لکھائیگا تو اسے یقیناً یہ رقم لوٹا دینی پڑیگی۔ وہ اس خیال سے ہچکچایا کہ اس نے پہلے ہی اس کے متعلق کیوں نہ کوئی تدبیر سوچ لی آخر کار اس نے اطمینان سے کہا۔

میں دنیا میں تن تنہا ہوں۔ میرے کوئی عزیز اور دوست نہیں ہیں۔ جو سفر میں کرنا چاہتا ہوں وہ یقیناً خطرات سے خالی نہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ یہ لفافہ اپنے کاغذات میں حفاظت سے رکھ لیں اور جب میں واپس آؤں تو اپنا نام بتا کر اسے واپس لے لوں؟"

"لیکن اگر میں ایسا کر دوں ——"

"آپ رسید پر صرف میرا نام لکھ لیجئے اور اپنے پاس ہی رکھ لیجئے۔ اگر میں دس برس تک واپس نہ آؤں تو یہ لفافہ آپکی ملکیت میں شمار کیا جائے گا۔"

"مجھے منظور ہے —— آپ کا نام؟"

اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ "ڈیورجر۔ ہنری ڈیورجر" جب وہ وہ بارہ سڑک پر آیا تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کے پیش نامہ (پروگرام) کا پہلا باب ختم ہو چکا تھا۔ اب خواہ لوگ اس کیلئے کتنا ہی کف افسوس کیوں نہ ملیں۔ مگر چوری کا مال ہر شخص کی دسترس سے باہر ہو گیا تھا۔

(۳)

وہ اب اس قسم کے خیالی پلاؤ پکا رہا تھا کہ قید سے رہا ہونے کے بعد وہ اپنی امانت وصول کر لیگا اور کوئی دوسرا شخص اس کے لئے مدافعت نہ کر سکیگا اور اس کی زندگی اس زندگی سے بہتر ہو جائیگی کہ جب وہ در در قرض مانگتا پھرتا تھا۔ ہر شخص اسے مسٹر ڈیورجر کہے گا اور وہ سکون اور یقین سے اپنی زندگی بسر کریگا۔ اور بوڑھا ہو جائے گا۔ لوگ اسے ایک ایماندار اور سخی کی نگاہ سے دیکھیں گے

کیونکہ وہ کچھ روپیہ سے دوسروں کی امداد بھی کرتا تھا۔

وہ چوبیس گھنٹے اس امر پر غور و خوض کرنے کے لئے اور پڑا رہا کہ آیا ان نوٹوں کے نمبر تو کسی کو معلوم نہیں اور جب اس کی طرف سے بھی اطمینان ہو گیا تو اس نے ایک سگریٹ جلایا اور پینے لگا۔

چند گھنٹوں کے بعد وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن مقدمہ کے وقت یہ معلوم کرنا بالکل ناممکن ہو گیا کہ اس نے دو لاکھ فرانک کیا کئے۔ وہ صرف اتنا جواب دیتا تھا "میں نہیں جانتا۔ میں ایک بنچ پر سو گیا اور میرا خیال ہے مجھے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔"

اسے پانچ سال کی قید کا حکم ہو گیا۔

اس نے حکم سنا مگر اس کی پیشانی پر بل نہ آئے اس نے خیال کیا کہ ابھی اس کی عمر (۳۵) سال کی ہے (۴۰) برس میں وہ آزاد ہو جائیگا اور امیر بھی۔ اس نے اس قید کو ایک معمولی مگر ضروری قربانی سمجھا تھا۔

وہ صبر اور استقلال سے دن کاٹ رہا تھا اُسے کوئی فکر اور پریشانی نہ تھی۔ ہاں صحت کا خیال ضرور تھا مدت قید ختم ہو گئی اور وہ جیل خانے سے رہا کر دیا گیا۔ وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ اس وقت وہ دنیا کو بھولا ہوا تھا۔ اور صرف وکیل سے ملنے کے خیال میں ہمہ تن مصروف تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ وکیل کے پاس پہنچیگا۔ اور خود دفتر میں بلایا جائے گا۔ کیا وکیل اسے پہچان لیگا؟ ۔ وہ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا یقیناً وہ زیادہ معمر ہو گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے چہرہ سے تجربہ کاری کے آثار بھی نمایاں ہیں ـــــ نہیں وکیل اسے ہرگز نہ پہچانیگا۔ ہا ـــ ہا ـــ ہا کیسی ہنسی کی بات ہوگی اس وقت

(۴)

"جناب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" "میں اپنی امانت واپس لینے کی غرض سے آیا ہوں جو میں نے پانچ سال ہوئے آپ کے پاس رکھی تھی۔"

کونسی امانت ـــــ؟ کب؟ ـــــ کس کے نام سے؟

کس کے نام سے؟ ـــــ مسٹر ـــــ"

ڈیونائٹ یہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور اپنے آپ گن گنانے لگا "کیسے تعجب کی بات ہے مجھے نام یاد نہیں جو میں نے لکھایا تھا" وہ اپنے دماغ پر پتھر مارنے لگا۔ اور ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت بے چین ہونے لگا اور غصہ سے اس کا سبب دریافت کرنے لگا۔ وکیل نے کاغذات الٹتے ہوئے کہا۔

"آیئے، آیئے جناب! ان کس حرف سے نام شروع ہوتا ہے؟"

ایک گھنٹہ تک وہ خیالات میں سرگرداں بیٹھا رہا اور رہ رہ کر خیال دوڑا رہا تھا کہ نام یاد آجائے لیکن وقت بیکار گذر رہا تھا۔ نام اس کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اطراف پھر رہا تھا اس نے حروف چمکتے ہوئے دیکھے لیکن لفظ غائب ہو جاتا تھا۔ ہر لمحہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نام یاد آگیا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ اس کے ہونٹوں پر ہے۔

اب وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور اسے معلوم ہونے لگا کہ وہ فراموش کردہ لفظ تیر بنکر اس کے قلب و جگر کو زخمی کر رہا ہے۔ خون اس کی رگوں میں کھولنے لگا اور گرم پانی کی طرح ابلنے لگا۔ اس کے اعضاء میں اینٹھن پیدا ہو گئی۔ اب خاموش اور ساکت بیٹھے رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں برانے لگے۔ وہ دانتوں سے ہونٹ چبانے لگا۔ وہ اب دو مختلف کیفیات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کبھی رونے کا خیال کرتا اور کبھی لڑنے کا لیکن جوں جوں وہ زیادہ عزاد و سمجھ سے کام لیتا ویسے ہی نام اور زیادہ موہوم نظر آنے لگتا۔ اس نے بیساختہ زمین پر پاؤں دے مارے۔ اٹھکر کھڑا ہو گیا اور زور سے چلایا۔ اس پریشانی سے کیا فائدہ اس سے سوائے برے نتائج کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر میں سوچنا چھوڑ دوں تو وہ خود ہی یاد آجائیگا۔ لیکن ایک قلب سوز اور غالب خیال اس آسانی سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ راہروؤں کو دیکھکر کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتا لیکن سب بے سود۔ وہ دوکانوں کی کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ سڑک کا شور و غل سنتا۔ مگر سنائی نہ دیتا۔ دیکھتا لیکن دکھلائی نہ دیتا اس کے کانوں میں صرف ایک لفظ مستفسرانہ لہجہ میں گونج رہا تھا "مسٹر ۔۔۔ ؟ مسٹر ؟"

(۵)

رات ہو گئی سڑکیں سنسان ہو گئیں۔ تھکا ماندہ وہ ایک ہوٹل پہنچا ایک کمرہ کرایہ پر لیکر اسی حالت میں کپڑے پہنے ہوئے سو گیا۔ چار گھنٹے مسلسل وہ دماغ لڑاتا رہا اور صبح سڑکا ہوتے گہری نیند میں غرق ہو گیا۔

وہ اٹھا تو صبح ہو چکی تھی اور دھوپ نکلی ہوئی تھی وہ بہت اطمینان سے جمائیاں لیتا ہوا اٹھا اس وقت گو دماغ کو سکون تھا مگر جسم کے ہر عضو سے رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہو رہا تھا مسٹر ؟ مسٹر ؟"

ایک نئی خلش اس کے سکون دماغ کو پھر منتشر کرنے لگی ایک خوف کہ تمام عمر وہ نام یاد نہ آئیگا کبھی نہیں۔ وہ آٹھ بیٹھا باہر آیا اور کئی گھنٹہ تک وکیل کے دفتر کے اطراف پریشانی سے چکر لگاتا رہا۔ دوسری رات بھی آگئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اور زور سے ہلاتے ہوئے غم و غصہ کے لہجہ میں چلانے لگا "آہ میں دیوانہ ہو جاؤں گا"

اب ایک زیادہ وحشت ناک انجام اس کے دماغ مضطرب میں جاگزین ہو گیا۔ اس کے پاس دو لاکھ فرانک تھے جو دراصل اس نے بے ایمانی سے حاصل کئے تھے۔ تاہم اس کے تھے مگر اب اس کے قبضہ سے باہر تھے انہیں حاصل کرنے کے لئے اس نے پانچ سال کی قید بھی برداشت کی تھی اور اب وہ انہیں دیکھ بھی نہ سکتا تھا تو لے اس کا انتظار کر رہے تھے اور ایک لفظ ——— صرف ایک۔ لفظ اسے یاد نہ آتا تھا جواب اس کے اور نوٹوں کے درمیان سد راہ ہو رہا تھا اس نے غصہ میں آکر اپنے سر پر گھونسے مارے تاکہ بھولا ہوا نام یاد آجائے لیکن سب لاحاصل تھا۔ وہ ایک شرابی کی طرح لالٹینوں کے کھمبوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا۔ اب یہ فراموشی صرف ایک خیال ہی نہ تھی۔ بلکہ اس کا تمام جسم اور اس کا دماغ ایک ناقابل برداشت سوزش سے تپنے لگا تھا اور اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بھولا ہوا نام تمام عمر نہ یاد کر سکے گا۔ اس کا تصور ایک وحشت ناک تبسم کی آوازیں اس کے کانوں میں سما گیا جب وہ سڑک پر سے گذر رہا تھا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور اس پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ اس کی رفتار زیادہ تیز ہو گئی۔ اور وہ سیدھا دوڑنے لگا۔ وہ سڑک کی آمد و رفت سے بالکل بے پروا لوگوں سے ٹکراتا چلا جا رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ وہ کسی چیز سے ٹکرا جائے۔ لوگ اسے پیروں میں روند ڈالیں اور وہ کچل کر مر جائے۔

"مسٹر ——— ؟ مسٹر ——— ؟"

(۶)

اب اسکے قدموں کے نیچے دریائے سین تیزی سے لہریں مار رہا تھا۔ وہ فرط غم سے روتا ہوا چلایا "مسٹر آہ ——— وہ نام ——— وہ نام" وہ آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھا۔ اسکا چہرہ غمگین تھا۔ وہ دریا کے کنارے پہنچ گیا آہ پانی سے اپنا منہ دھوئے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پانی اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اسکو اسکی سرخ آنکھوں کو اس کے اعضاء کو اس کے تمام جسم کو، اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کا پیر پھسل رہا ہے اور اب اس کے نیچے دریا کے پایاب کنارے پر نہیں جمتے۔ وہ گر پڑا۔ ٹھنڈے پانی کی ایک زوردار لہر نے اس کے جسم کی رگ رگ میں ایک اضطراب کی رو دوڑا دی۔ وہ کشمکش عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلا دیا۔ سر اوپر اٹھایا نیچے غائب ہو گیا۔ پھر سطح پر نمودار ہوا۔ اور یکایک وہ نہایت کوشش اور ڈراؤنی آواز میں چلا اٹھا اسکی آنکھیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ "مجھے یاد آگیا ——— مدد ——— ڈیوجرے ——— ڈیو ....." دریا کا کنارہ ویران ہو گیا۔ موجیں پل کے کھمبوں سے سر ٹکرانے اور ایک سنسنی خیز گونج پیدا کرنے لگیں۔ ایک بہت بڑی لہر جہاز کی زنجیروں سے سر ٹکراتی ہوئی بہت دور تک خشکی پر پھیل آئی ——— اور اب بالکل خاموشی تھی۔

جوانی

از جناب سید قادر حسین صاحب قادر حیدرآبادی ۔

ڈھلی جو عمر کہاں گرمیاں جوانی کی
بنی چراغ سحر شمع زندگانی کی

غرور حسن سے یہ شان ہے جوانی کی
وہ ظلم کر کے سمجھتے ہیں مہربانی کی

دبا کے رکھینگی ہنگامہ ہائے محشر کو
یہ شوخیاں تری اٹھتی ہوئی جوانی کی

نہ اب ہے دل کی امنگیں نہ اب ہے جوش طرب
وہ چلتی پھرتی ہوئی چھاؤں تھی جوانی کی

قرار جس کو نہ ہوا عمر بھر کیا اس کا
قسم نہ کھاؤ دم وعدہ تم جوانی کی

اٹھاتے جاتے ہیں ہر ہر قدم پہ وہ فتنہ
ابھارے پھرتی ہے شوخی انہیں جوانی کی

جمائیاں سی کچھ آجاتی ہیں ضعیفی میں
جو یاد آتی ہیں بدمستیاں جوانی کی

وہ فیض عشق زلیخا کا خاص تھا ورنہ
دوبارہ ملتی ہے دولت کہیں جوانی کی

ابھی تو توبہ سے قادر مجاب آتا ہے
ابھی نظر میں ہیں بدعہدیاں جوانی کی

یورپ کی موجودہ ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

از جناب خواجہ ظہور الدین صاحب سکندرآباد دکن

انگلستان کے ایک مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر کے قول کے مطابق "قوم مجموعہ ہے افراد کا" جس طرح افراد اپنی زندگی میں مختلف حالتوں سے گذرتے ہیں اسی طرح ایک قوم کو بھی مختلف منازل طے کرنے پڑتے ہیں جس طرح افراد پر طفولیت و جہالت، شباب و قوت اور پیری و انحطاط کا زمانہ آتا ہے بالکل اسی طرح قوموں پر بھی وحشت و جہالت، عروج تہذیب و تمدن اور پھر انحطاط و زوال کا زمانہ آتا ہے، یہ ایک دستور فطرت ہے جو کسی ایک قوم، فرد یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں رہا، بلکہ دنیا کے تمام افراد اور کل ممالک اور تمام اقوام پر یہ اصول محیط ہے۔ یونان قدیم تاریخ میں وہی مرتبہ رکھتا تھا جو آج مغرب کو حاصل ہے لیکن کسی وقت یہ بھی تاریکی اور جہالت میں مبتلا تھا۔ رومی قوم جو یونان کے بعد سطح ارض کی سب سے بڑی متمدن قوم بن گئی تھی۔ یونان کے عروج و اقتدار کے زمانہ میں کہنا چاہیئے کہ جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھی۔ ہندوستان، آریاؤں سے قبل جاہل و غیر متمدن اقوام کا مسکن تھا لیکن اسی ہندوستان کی قدیم روایات اس کے عظیم الشان عروج و ترقی اور حیرت انگیز تہذیب و تمدن کو ظاہر کرتی ہیں اور تو اور خود عرب پر اسلام سے قبل ایک ایسا زمانہ گذرا ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ چنانچہ "جاہلیت عرب" تاریخ کی ایک اصطلاح قرار پائی ہے۔ عرب کی تاریخ طلوع اسلام سے پہلے وحشت و بربریت کی جو مثالیں پیش کرتی ہیں، اس کی نظیر دوسری اقوام کی تواریخ میں بے حد تلاش کے بعد مشکل سے مل سکیگی۔ اس اصول فطرت کا ایک زندہ نمونہ موجودہ زمانہ میں آفریقہ خاصکر وسط آفریقہ کی حبشی اور وحشی قوم ہے کیا عجب ہے کہ یہی وحشی قوم رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن کی معراج کمال پر پہونچ جائے جس طرح ہر فرد اپنی ترقی و تربیت کے لئے اپنی سوسائٹی اپنے استاد اپنے عزیزوں اپنے رفیقوں وغیرہ کا ممنون ہوتا ہے بالکل اسی طرح قومیں بھی اپنے عروج و ترقی تہذیب و تمدن کمال و شائستگی کے لئے اپنے ہمسایہ اقوام کی رہین منت ہوکر رہتی ہیں جس طرح ایک فرد اپنی ترقی کے لئے اپنے سے زیادہ تعلیم یافتہ اپنے سے زیادہ عقلمند اور اپنے سے زیادہ تجربہ کار شخص سے استفادہ کرنے پر قدرتاً مجبور ہے۔ اسی طرح قومیں بھی اپنی پست حالت سے نکلنے کیلئے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کے لئے اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ اقوام سے شرف تلمذ اختیار

کرنے پر مجبور ہیں۔ جاپان جو آج اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کے لحاظ سے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ نصف صدی ادھر بالکل پست حالت میں تھا۔ اسی یورپ کی شاگردی اور جاپانی قوم کی غیرت اور خودداری نے آج اس کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا چین جس کا قدیم تمدن آج بھی اپنی عظمت و شان کے لئے مشہور ہے بہت بڑی مدت تک ترقی یافتہ مغربی اقوام کا ممنون احسان ہے۔ ہندوستان جو کسی زمانہ میں روم و یونان کا ہمسر تھا۔ تہذیب و تمدن کے معاملہ میں مغرب کی خوشہ چینی کر رہا ہے۔

ع "دیئے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے"

کچھ ایسا ہی اندھیرا شاید اس سے بڑھ کر ایک زمانہ یورپ پر آچکا ہے۔ تاریکی، جہالت اور ناشائستگی اس وقت نہ صرف یورپ ہی میں پھیلی ہوئی تھی بلکہ دنیا کے اکثر و بیشتر حصے ان کا شکار تھے۔ علم سے وہ بالکل نام آشنا تھے معاشرت کا یہ حال تھا کہ کلیسا کے مکانات میں رہا کرتے تھے جن کو ڈربہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا وہ بہت غلیظ ہوتے تھے۔ ان کی زبان ابھی بنی نہیں تھی۔ غسل کرنا ایک گناہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ ایک عیسائی راہب نہایت فخر کے ساتھ اپنا حال بیان کرتا ہے کہ ساٹھ سال تک اس نے اپنے جسم کا کوئی حصہ نہیں دھویا سوائے اپنی انگلیوں کے جب اس طرح عیسائی گندگی و جہالت میں پڑے ہوئے تھے مسلمان حد درجہ پاک و صاف رہا کرتے تھے۔ جب ہسپانیہ عیسائیوں کے ہاتھ لگا تو شاہ فلپ دوم نے تمام حماموں کو مسمار کروا دیا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ وہ نہایت پاک و صاف ستھرے اور پاکیزہ مکانوں میں رہا کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف کی گرم بازاری تھی۔ شعر گوئی تو ہر ادنیٰ و اعلیٰ کا مشغلہ تھا۔ صرف قرطبہ کے اندر امیروں کے مکانات پچاس ہزار غربا کے مکانات ایک لاکھ سے زائد اور سات سو مساجد نو سو حمام تھے۔ مسلمانوں کے ذہین بھی ان کے مسیحوں کی طرح پاک و صاف تھے۔ مسلمان علماء نے ہسپانیہ کو یورپ کا علمی مرکز بنا دیا تھا۔ اور یورپ کے ہر حصے سے طالبان علم مسلمانوں کے ہاں علم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ علم کے ہر شعبہ میں نہایت سنجیدگی و مستعدی سے ترقی کی جاتی۔ اور علم طب کو انہوں نے بہت ترقی دی۔ ابوالقاسم گیارھویں صدی کا مشہور طبیب مانا جاتا ہے۔ عمل جراحی میں اس کو خاص کمال حاصل تھا۔ ابن زہر نے فن جراحی و طب میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ ابن بطار ماہر نباتیات تھا جس نے تمام مشرق کا سفر کیا ہے اور نباتیات پر ایک نہایت بلند پایہ کتاب بھی لکھی ہے۔ ابن رشد نے فلسفہ روم و یونان کو فلسفہ ازمنہ متوسط سے ملا دیا ہیئت جغرافیہ، کیمیا، سائنس وغیرہ غرض تمام علوم کی مسلمانوں کے ہاں اس وقت پرورش ہو رہی تھی جب کہ اہل یورپ جہالت تعصب اور رسم و رواج کی کڑی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے صرف مسلمان

ہی تھے جنہوں نے تہذیب و تمدن اور علم کی شمع کو بجھنے سے بچا لیا۔ قرطبہ میں زنانہ طبابت بہت عام تھی۔ ریاضیات، ہیئت، حیاتیات، تاریخ، فلسفہ اور قانون صرف مسلمانوں ہی کے پاس سیکھے جا سکتے تھے۔ فنون جنگ، ابر رسانی۔ فن تعمیر، فن جہاز رانی میں مسلمانوں کو خاص کمال حاصل تھا اور سونے چاندی کے برتن اور چینی کا کام مسلمانوں کے ہاں تو بالکل معمولی چیز تھی ان کے جہاز دنیا کے تمام سمندروں میں پھر رہے تھے۔ یہ تھے مسلمان مگر دنیا کا قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ قومیں ان سے سبق سیکھنے کا اعتراف نہیں کرتیں۔ ایسا ہی سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا۔ خلفاء نے اہل علم و فضل کو جو عزت دی اسکے ہاتھ سے جو مستند کتابیں لکھوائیں اور جو بڑی بڑی یونیورسیٹیاں کالج انہوں نے کھولے جن کی شاندار عمارتوں کا نہ صرف ہم بلکہ بعض انصاف پسند و حق گو اہل یورپ بھی ماتم کر رہے ہیں۔ اور جس میں انہوں نے فلسفہ، ریاضیات، طب، ہیئت، ادب غرض ہر اس علم کی جس کو آج یورپ نہایت فخر سے اپنا کہہ رہا ہے تعلیم ہوتی تھی۔ اسکی نسبت انگریز مورخ مرفی (مصنف ہسٹری آف دی محمڈن امپیرا ان اسپین) کہتا ہے کہ میں مسلمانوں کو رومیوں اور یونانیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں سمجھتا" اس نے اپنی تاریخ میں اہل اسلام کے وہ احسانات جو انہوں نے یورپ پر کئے ہیں بالتفصیل گنوائے ہیں۔ جس کا کچھ حصہ اور دیگر مورخین کی اسناد ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ موجودہ یورپ کے نہ صرف علوم بلکہ فنون بھی عربوں ہی کی شاگردی کا صلہ ہیں۔ جس زمانہ میں مسلمان سپین، سسلی اور صقلیہ میں علوم و فنون کے دریا بہا رہے تھے اس زمانہ میں یورپ جہالت کے ذخار سمندر میں ڈوبا ہوا تھا یہ نادانی اپنے علوم بھول چکے تھے اور رومی عیسائی مذہب قبول کر کے بے علمی کا طوق اپنے گلے میں ڈال چکے تھے صرف مسلمان بلکہ عیسائی مورخین بھی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ کوئی علم مسلمانوں نے ایسا نہیں چھوڑا جس میں انہوں نے کچھ نہ کچھ ترقی کی ہو اور ان کو اہل یورپ کے سینوں میں نہ بھر دیا ہو۔ جب مسلمان سپین، سسلی، صقلیہ پر قابض ہو گئے تو انہوں نے وہاں کے باشندوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ علوم و فنون سیکھیں یہاں تک کہ اتورو نے لاطینی زبان کی مخالفت دیکھکر عربی زبان میں انجیل وغیرہ کا ترجمہ کر ڈالا۔ عربی زبان اس قدر عام ہو گئی تھی کہ ان ممالک کے تمام باشندے بے تکلف عربی بولا کرتے تھے۔ اور اس طرح سے عربوں کی عملی تہذیب اور ان کے علوم کا سکہ یورپ پر بیٹھ چکا تھا جس کو موجودہ یورپ کی ترقی کا ابتدائی مرحلہ سمجھنا چاہئے دسویں صدی میں جب کہ یورپ تاریکی میں پڑا ہوا تھا اسپین بیشمار اہل علم کا مسکن بنا ہوا تھا ان میں سے چند لوگوں کے نام یہ ہیں:۔

ایتون، اسقف اسونیہ وک، قطلونیہ میں لوفی طو، برشلونہ میں جو علم ہیئت کا مشہور عالم سمجھا جاتا ہے یوسف عیسائی جو علم حساب میں مستند مانا گیا ہے وغیرہ کا اس قدر شہرہ تھا کہ طالبان علم جرمنی، اطالیہ، انگلستان، فرانس سے جوق جوق ان کے پاس آتے اور عربی زبان کے ذریعہ سے علوم کی تحصیل کرتے چنانچہ جن لوگوں نے اس طرح پہونچکر علم حاصل کیا تھا ان میں سب سے مشہور جربرٹ فلسفی تھا جو بعد میں چلکر اعلی قابلیتوں کے باعث پاپائے روم بن گیا اور اس کے بعد شہنشاہ، اس شخص نے جامعہ قرطبہ میں مدت مدید تک مسلمان علما و فضلا کے آگے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے دو کالج کھولے۔ ایک بوبیو ملک اطالیہ میں دوسرا شہر ریم ملک فرانس میں وہ عربی علم ہندسہ کا یورپ میں سب سے پہلا ماہر تھا۔ ان دونوں کالجوں میں ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی۔ اور مورخین کا بیان ہے کہ ان علمی سرچشموں سے بے شمار تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی۔

فلبسٹر اسقف شارتر س جربرٹ کا شاگرد تھا۔ جربرٹ نے فلبسٹر کی مدد سے پوپ کا عہدہ حاصل کیا اور بعد میں شہنشاہ سلوسٹر دوم کے نام سے مشہور ہوا شہنشاہ اوتھو سوم اور شہنشاہ سلوسٹر دوم نے علوم و فنون کی تبلیغ میں بہت حصہ لیا ہے اس شخص نے بہت سے مدارس کھولدیئے اور عربوں کی کتابوں کو چن چن کر جمع کیا اور ان کا ترجمہ کروایا لوگ اس کو فوق الانسان سمجھتے تھے۔ جربرٹ کی مثال نے لاتعداد انسانوں کے دلوں میں علم کا شوق پیدا کر دیا۔ اور بے شمار لوگ قرطبہ بغداد اور دوسرے اسلامی مرکزوں میں پہونچکر علوم حاصل کرنے لگے اور جو لوگ اپنے کو شریف کہلانا پسند کرتے تھے۔ ان کے لئے لازمی امر تھا کہ وہ عربی زبان سیکھیں اور عربی کتابوں کا ترجمہ کریں۔

مانٹکلا کہتا ہے کہ جو لوگ ریاضی اور سائنس میں شہرت رکھتے تھے وہ سب مسلمانوں کے شاگرد تھے۔ جرارڈ دوائی کریمونا اطالیوں میں سے فلسفہ، طب اور ہیئت کو شہر طلیطلہ کے عربی مدرسہ میں حاصل کیا اور ہیئت کی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ سب سے مشہور انگریز جس نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کی شاگردی کی وہ ایڈیلارڈ تھا اس نے طبعیات اور ریاضیات کو عربوں سے سیکھا، اقلیدس اور دوسرے مشہور ریاضی تصانیف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا بارھویں صدی میں دانیال مارلے ایک انگریز نے ریاضیات کو طلیطلہ میں حاصل کیا۔ جرمنی میں شاہ اوتھو اور شہنشاہ فریڈرک ثانی نے اطالوی میں خود کئی کتابوں کا ترجمہ کیا اور لاکھوں روپے صرف کر کے مشہور عربی کتابوں کا ترجمہ کروایا۔ یورپ کے زمانۂ تاریکی یعنی ازمنہ متوسط میں سب سے پہلا

طبی کالج شہر سیلرنو واقع نیپلس میں کھولا گیا اور اس مدرسہ میں عربی تعلیم ہوتی تھی۔ ان کے پاس سوائے عرب ڈاکٹروں کی کتابوں کے دوسری کتاب موجود ہی نہ تھی۔ یونانی اپنے علوم بھول چکے تھے اور یہودی عربوں کی شاگردی کرکے بہت نام پیدا کر رہے تھے۔ علم ہیئت پر عربوں نے بہت سے احسانات کئے اور ہیلی صاحب کہتے ہیں کہ محمد کی کتابوں نے اس فن پر خاص احسان کیا ہے۔ الفانسو دہم شاہ قسطلہ نے جو علما ہیئت میں خاص مرتبہ رکھتا ہے اس علم کے حاصل کرنے کے لئے طلیطلہ میں سکونت اختیار کی اس نے جو جدول ہیئت کی ترتیب دی ہے۔ اس سے اس علم میں بہت آسانی پیدا ہوگئی مشہور انگریز فلسفی روجر بیکن نے عربی زبان میں فلسفہ، ریاضیات طبیعات، ہیئت، طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور اس کی تصانیف میں الخازن کا نام مختلف جگہ ملتا ہے جس نے تصریحات علم میں بہت نام حاصل کیا ہے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس نے الخازنی کی کتابوں کا ترجمہ کرکے ان پر حواشی لکھے ہیں جو شہر پیشہ کا باشندہ تھا۔ جبر و مقابلہ اور علم حساب کو جو اس نے عربوں سے حاصل کیا تھا اٹلی میں فروغ دینے لگا۔ ارنالڈ جو ویلانوا کا باشندہ تھا عربوں سے ان تمام علوم کو حاصل کیا جن کے لئے وہ مشہور ہے خصوصاً طبیعات ہیئت اور طب اور فبرشش جس نے اس کے بہت زمانہ بعد اٹلی میں نام پیدا کیا۔ اپنی تصانیف میں لکھتا ہے کہ میں عربوں کا شاگرد ہوں خصوصاً ابوالقاسم اور اس کی تصانیف میں رطب اللسان ہے۔

ہوٹ بڑے دعوی سے کہتا ہے کہ فلسفی دیکارٹ اپنے مشہور قانون وآئین ..... کے لئے عربوں کا ممنون ہے۔ ہیلی دعوی کرتا ہے کہ نورالدین پتروشی درحقیقت کیپلر کے قانون ہیئت کا مکتشف ہے، غرض ہم بلا کسی مبالغہ کے کہہ سکتے ہیں کہ یورپ عربوں کا بہت ممنون احسان ہے اور انہی کی وجہ سے عیسائیوں نے اپنے دینیاتی مسائل کو علم دینیات کہلانیکا مستحق ٹھیرایا اگرچہ مذاہب فلسفہ دوسری صدی عیسوی میں بھی موجود تھے مگر جب تک کہ مسلمانوں نے یورپ پر فلسفہ ارسطو و دیگر فلاسفہ پر اپنے اعتراضات کرکے ان کے مذاہب کو اہل یورپ تک نہیں پہونچایا اس وقت تک ان کا علم دینیات کوئی چیز ہی نہ تھا۔ نویں صدی میں حکومت ارگان نے اپنا قانون تیار کیا مگر عربوں ہی کی مدد سے برشیلونہ اور قسطلہ والوں نے عربوں کی مدد سے اپنا قانون تیار کیا

مرفی اپنی تاریخ (ہسٹری آف دی محمڈن امپائر ان اسپین) میں اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ شاعری کے عروض و قوافی بھی عربوں کی ایجاد ہے۔ ہم اس جگہ پر ان کے خیالات نہیں لکھ سکتے کیونکہ مضمون طویل ہو جائیگا۔ اس زمانہ میں مسلمان علوم و فنون کے لئے بہت مشہور ہو چکے تھے [illegible]

ادب و دیگر فضلا مسلمانوں کے درباروں میں رہکر عیسائی شہزادوں کے ہاں چلے جاتے وہاں ان کی بہت عزت ہوتی اور اس طرح مسلمانوں کی لطافت پسندی اور تہذیب وغیرہ عیسائیوں میں پھیلتی جاتی تھی۔ انڈریس کہتا ہے کہ نیوٹن کا قانون کشش ثقل محمد بن موسیٰ الخوارزمی ماہر ریاضیات کا دریافت کیا ہوا ہے۔ مگر مورخ موصوف کہتا ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ نیوٹن نے محمد بن موسیٰ کی کتاب سے اخذ کیا بلکہ یہ بہت ممکن ہے کہ اس نے محمد بن موسیٰ کی تصانیف کا مطالعہ ہی نہ کیا ہو۔ کیا ہم ان تمام واقعات کی موجودگی میں یہ کہنے کے مجاز نہیں ہیں کہ موجودہ یورپ درحقیقت عربوں کا شاگرد ہے اور اس شاگردی کو کسی زمانہ میں باعث فخر و ناز سمجھا کرتا تھا۔

ازمنہ متوسط میں یورپ میں نہایت چھوٹے اور غلیظ شہر ہوتے تھے اور کوئی شخص سفر کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کیونکہ چوری وغیرہ کا خوف لگا رہتا تھا مگر مشرق میں قاہرہ، بغداد، دمشق وغیرہ مشہور شہر تھے جن میں سنگ مرمر کے محلات بڑی بڑی تجارتی منڈیاں، بڑی بڑی یونیورسیٹیاں کالج اور وسیع و خوبصورت بازار اور باغات تھے۔ ملک میں آبرسانی کا بہت اچھا انتظام ہوتا تھا اور لوگ شائستہ و خوش حال تھے۔ دنیا کے دور دراز ملکوں کے ساتھ تجارت کی جاتی تھی۔ عیسائیوں کو خود اس بات کا احساس تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں نہایت وحشی و حقیر ہیں۔ اور وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کے برابر ہو جائیں۔ گیارھویں صدی میں مشرق و مغرب ایک دوسرے سے واقف ہونے لگے، اور وحشی عیسائی مہذب مسلمانوں کے ملکوں میں گھسنے لگے اور وہ دو طریقوں سے جنگ اور تجارت جب عیسائیوں کو عروب صلیبیہ یعنی صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے ناکامیابی ہوئی تو یہ استفادہ کا خیال تجارت کی خواہش کی صورت میں رونما ہوا (یہ اہل یورپ کا ریشہ سے قاعل رہا ہے کہ پہلے جہل کسی ملک میں نشان تجارت بلند کئے ہوئے داخل ہوتے ہیں) وہ ان ممالک سے کئی قسم کے مصالحے کھانے پینے کی اشیا، سونے، چاندی کی چیزیں، کپڑے، مخمل، شکر، کاغذ، ہاتھی دانت ریشم وغیرہ جو وہاں مل سکتے ہیں، اپنے ملکوں کو تجارت کے بہانے لیجانے لگے اور یہ چیزیں یورپ میں بہت مقبول ہوئیں۔ اطالوی تو ان چیزوں کی تجارت میں بہت پیش پیش تھے اور اسی وجہ سے وہ بے حد دولت مند بھی بن گئے تھے۔ وینس، جنیوا، پاسرا وغیرہ ان تاجروں کے مرکز تھے۔ اور رونق میں یورپ کا کوئی شہر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عیسائیوں نے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں سفرا حاصل کئے اور ان سے تجارتی فرامین حاصل کر کے بہت دولت مند ہونے لگے۔ اس طرح سے جو لوگ لوٹنے کی خاطر سے گئے تھے وہ تاجر ہو گئے اور تمام [illegible] کے لئے اطالیہ ایک تجارتی منڈی کا کام دینے لگا

وہ لوگ جو نشاۃ جدید کی تاریخ سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ نشاۃ جدیدہ یورپ کا آغاز اطالیہ سے ہوا سینو باس مورخ کا خیال ہے کہ اس طرح سے مشرقی تہذیب مغرب میں منتقل ہو رہی تھی اور یورپ مہذب ہوتا جا رہا تھا

ایجادات بارود کی ایجاد چینیوں میں پہلے ہی ہو چکی تھی مگر وہ زیادہ تر آتشبازی کیلئے استعمال ہوتی تھی۔ مگر مسلمانوں نے اصلی بارود بنائی اور اس ایجاد سے انھوں نے نلکیوں میں سے وزنی اشیا باہر پھینکنے کا کام لیا۔ اہل یورپ نے ۱۳۲۵ء میں اس کی نقل تاری اور شہر فلارنس میں لوہے کی توپ کے گولے بنائے گئے اور یہ ایجاد تمام یورپ میں پھیل گئی قطب نما یا مارینرس کمپاس کا اصول عربوں ہی سے دریافت کیا اس سے فن جہازرانی میں جان پڑ گئی یہاں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ اہل یورپ جو سمندروں سے بہت ڈرا کرتے تھے جب ان کو قطب نما کا اصول معلوم ہو گیا تو پہلے پہل پرتگالیوں ولندیز و انگلینڈ و فرانسیسیوں نے سمندروں میں سفر کرنا شروع کیا اور یہ معلوم کر کے ان کو بڑا تعجب ہوا کہ عربوں کے قدم مالابار، سیلون (لنکا) جاوا بورنیو، سیلیبس، ملاکس وغیرہ ممالک میں ان سے بہت پہلے پہونچ چکے ہیں نہ صرف پہونچ چکے، بلکہ وہاں کے اکثر باشندوں کو مسلمان بنا چکے ہیں۔

کاغذ کی ایجاد یورپ میں عربوں نے کاغذ سازی کو ترقی دی جس کو انہوں نے دریافت کیا تھا۔ کاغذ کی ایجاد نے بھی یورپ کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

ممالک کی دریافت ازمنہ متوسطہ میں یورپ کے تاجر مصر، شام، ایشیائے کوچک وغیرہ سے اپنی تجارت کیا کرتے مگر جب ان ممالک پر سے عربوں کا اقتدار اٹھ گیا اور ترک قابض ہو گئے تو اہل یورپ ان کو اپنے راستہ میں حائل اور نفع کا شریک سمجھنے لگے اور اور اس وجہ سے ان کو اپنی نفع بخش تجارت کے ضایع ہونیکا بہت شبہ ہونے لگا اسی لئے انھوں نے کوئی نیا راستہ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی جس سے وہ ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک تک پہونچکر تجارت کر سکتے تھے۔ چنانچہ کولمبس، واسکوڈی گاما، جان لیبوٹ وغیرہ نے اسی دھن میں مدتوں سمندر کا سفر کیا اور آخر کار جنوبی آفریقہ کے راس امید تک پہونچ گئے۔ ادھر کولمبس نے امریکہ اور جزائر غرب دریافت کئے۔ اگر تر کون ان ممالک پر قبضہ نہ کیا ہوتا اور اہل یورپ کی تجارت نہ رکتی تو آج یورپ کو یہ برتری کیسے حاصل ہو سکتی؟ یہ بھی ان پر اسلام کا ایک احسان ہے گو بلا واسطہ ہے [illegible]

وہ ہندوستان پر قابض ہونے کے قابل ہو سکے اور جزائر شرق الہند، برما، چین اور خود چین کو اپنا غلام بنا لیا۔ کون نہیں جانتا کہ یہ ممالک یورپ کو ہر لحظہ مالا مال کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر آج یورپ کے قبضہ سے یہ ممالک اور مقبوضات نکل جائیں تو وہ پھر یہ یورپ نہ رہے۔ ایک کا نقصان دوسرے کا فائدہ ہے۔ انگلستان کی عظمت، فرانس کی شوکت، امریکہ کی تجارت سب کچھ انہیں مقبوضات کے مرہون منت ہیں۔ غرض مسلمانوں نے مست خواب یورپ کو ہر طریقہ سے جگایا علمی، فتوحاتی، تجارتی، صنعتی، ذہنی سبق پڑھائے اور ان کو جہالت و وحشت کے تاریک گڑھے سے نکال کر تہذیب و شائستگی کی شاہراہ پر چھوڑا۔ ممکن ہے کہ مسلمان اہل یورپ کے دانا دشمن رہے ہوں۔ مگر ہم جب تک نتائج کو دیکھ کر رائے دیتے رہیں گے اس وقت تک ہم کو یہی کہنا پڑیگا کہ یورپ مسلمانوں کا بے حد ممنون ہے اس میں شک نہیں کہ یورپ نے اپنی جدت طبع سے بعض خصوصیات عجیب و غریب اور مابہ الامتیاز پیدا کر لی ہیں لیکن خود ان کے غیر متعصب علماء کو اقرار ہے کہ وہ مسلمانوں کے بڑی حد تک منت پذیر ہیں۔ یہ سب کچھ نتیجہ ہے نشاۃ ثانیہ کا اور یہ نشاۃ ثانیہ جس کے پیدا کرنے والے زیادہ تر مسلمان ہی تھے اور جس کے نتائج آگے چلکر نکلے جس کی وجہ سے آج یورپ دنیا کے بڑے حصہ پر قابض ہے۔

کلام اعظم

جناب ڈاکٹر اعظم کریوی صاحب ایڈیٹر اکبر الہ آباد

راز قدرت کا جو میں جاننے والا ہوتا
تو دو سجدہ کہیں ہوتی نہ شوالا ہوتا

وہ بھی روتے مرے احباب بھی روتے سنکر
اتنا پُر درد شب غم کہیں نالا ہوتا

ہائے یہ موسم گل، عارض گل، جلوۂ گل
کاش ایسے میں مرا کیسوؤں والا ہوتا

کوئی ملتا جو مجھے دشت وفا کا ساتھی
آبدیدہ نہ مرے پاؤں کا چھالا ہوتا

ہر جگہ تو ہے کہیں بھی تری تخصیص نہیں
تجھ کو پاتا جو کہیں ڈھونڈنے والا ہوتا

سیکڑوں دل میں ہیں ارمان نکلنے کے لئے
کوئی ارمان مرا تم نے نکالا ہوتا

شاعری میں تری آتا نہ مزا اے اعظم
تو نے الفت کا اگر روگ نہ پالا ہوتا

(۱)

پردہ

(از جناب آبرو بیگم صاحبہ سکریٹری لیڈیز کلب بھوپال)

یہ مضمون گزشتہ آل انڈیا مسلم لیڈیز ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ حیدرآباد دکن میں پڑھا گیا تھا۔ مسلمان عورتوں سے متعلق ایک مسئلہ پر خود انہیں میں سے ایک قابل بی بی کی یہ رائے ہے، جس پر نہایت فصاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کانفرنس کی سکریٹری صاحبہ نے براہ مہربانی یہ مضمون "مکتبہ" میں شائع کرنے کے لئے ارسال فرمایا ہے (مجلہ مکتبہ)

اس وقت نمبر (۱۵) کا رزولیشن متعلق پردہ پیش ہے اور یہ مطبوعہ رزولیشن مجھے حیدرآباد پہنچنے پر عین اجلاسوں میں ملے ورنہ میں اس پر بہت کچھ مدلل اظہار خیالات کرتی کیونکہ یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہندوستان میں پیش ہے کہ مخالفین پردہ نے مغربی تقلید کا نام بھی شرعی پردہ رکھا ہے اور حامیان پردہ بھی اپنے رائج پردہ کو شرعی پردہ کہتے ہیں یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے جہالت سے اس مذہبی پاک اور جائز آزادی پر جو سختی رائج کی وہ صریحاً مذہب پر افترا ہے اور حد شرعی سے تجاوز کسی مسئلہ میں بھی کرنا جرم اور قابل نفرت حرکت ہے۔ لیکن مذہبی حدود سے آگے قدم رکھنا بھی اسی طرح گناہ ہے۔

اگر ہندوستان کی وہ جماعت جس نے پردہ کو حدود شرعی سے بھی مزید تر سخت کر رکھا تھا۔ ضلالت پر تھی اور ہم ان کے ستم کے نالاں رہے تو اب یہ جدید فرقہ بھی صریح غلطی پر ہے جو حدود شرعی کی جائز آزادی سے کہیں بڑھ کر گامزن ہے تو پہلے سے زیادہ ہم اتم کناں ہیں کہ ہم کو مذہب کے تحت سے بھی باہر کر کے ذلیل اور تباہ عقبےٰ کرنے کا ہمارے حامیوں کا ارادہ ہے۔

خواتین اخال کو شاعران نازک خیال ہمیشہ حسن محبوب میں تشبیہ دانہ مرغ دل سے تعبیر کرتے رہتے ہیں لیکن جب خال بڑھ جاتا ہے تو ستہ کہلاتا ہے کہ۔

جو کوئی حد سے بڑھا اسکی خرابی آئی　　خاک پر لوٹتے ہیں یار کے گیسو بڑھ کر

جب تک ہمارا نشان قومی اسلام ہے اور آپ ہم مسلمان کہلاتے ہیں تو قرآن حکیم کی آیات اور احادیث ہمارا ایمان ہے۔

مخالفین پردہ باآواز بلند اعلان کر رہے ہیں کہ قرآن حکیم میں صرف ایک آیت پردہ کے متعلق ہے۔ جس کو ہمارے علمائے سلف نے اپنے مفہوم کی غلطی سے غریب صنف نازک پر سخت کر دیا۔ ورنہ

اسلام نے عورتوں کو ویسی ہی متجاوز آزادی، بے پردگی جنس مذکور سے اختلاط اور میل جول کا حکم دیا ہے جیسا کہ غیر قوم میں مستحسن ہے اور مغربی خواتین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش جاری ہے۔

اس لئے میرا یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ قرآن میں متعدد مقام پر ہمارے پردہ کا ذکر ہے اور میری مسلمان بہنیں اور بھائی کسی طرح بھی کلام ربانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پردہ کی اسلامی حقیقت کیا ہے اور پردہ کے شرعی حدود واقعی کیا ہیں تاکہ یہ نافہمی دور ہو جائے کہ قرآن حکیم میں صرف ایک آیت ہے حالانکہ متعدد آیتیں ہمارے لئے شمع ہدایت ہیں۔

خواہران عظام!

پردہ یا حجاب ایک قرآنی قانون ہے جو امت اسلامیہ کے طبقہ نسوان کو حق تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے اس لئے دیا گیا ہے کہ ایک قانون کے ذریعہ سے وہ اپنی قدرتی عزت اور وقار کی ذاتی قدر و قیمت اور ان اعلیٰ خصوصیات و کمالات اور قیمتی جذبات و سعادات کی حفاظت و تعظیم کر سکیں جو بطور پیدائشی حقوق کے اُن کو خدا کی جانب سے ملے ہیں۔ آج اسلامی گھرانوں میں زوجین کے باہمی تعلقات تعہد اعتماد و اطمینان کے جن مضبوط چٹانوں پر قائم ہیں ایسا اعتماد و اطمینان جو ہر قسم کے آلایشوں اور بدگمانیوں سے مصفا اور پاک ہے زیادہ تر وہ اسی الٰہی قانون کے پاکیزہ نتائج ہیں الحاصل چند درجہ روحانی۔ اخلاقی۔ معاشرتی بلکہ جسمانی و طبعی اغراض و مقاصد کو سامنے رکھکر کسی مرد و عورت نے نہیں بلکہ عورتوں اور مردوں کے خالق اور بنانے والے نے قوانین کا ایک مجموعہ عورتوں کو عطا فرمایا ہے جس کی اجمالی تعبیر پردہ یا حجاب سے کیجاتی ہے۔ اس وقت یہ موقع نہیں ہے کہ قانون کے عقلی پہلوؤں سے بحث کیجائے اس لئے اُن اغراض کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے اس وقت صرف ترتیب کے ساتھ ان قوانین و احکام کو بیان کرتی ہوں جو براہ راست اسلامی مستند کتابوں قرآن و حدیث و فقہ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

میں عورتوں کو صرف بتانا چاہتی ہوں کہ پردہ اور اس قسم کے جتنے اسلامی قوانین ہیں یہ مرد نے عورتوں پر زبردستی یا ان کو کمزور پاکر عائد نہیں کئے ہیں۔ میں اس کو نسوانی عقل و حمیت۔ شرافت و بزرگی پر بدترین حملہ سمجھتی ہوں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جطرح الٰہی احکام و فرامین کے براہ راست خطاب کے مستحق اپنے کو مرد سمجھتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ خطاب کے اس شرف و امتیاز سے عورتوں کو محروم کیا جائے۔ مرد اگر خدا کے بندے ہیں تو ٹھیک اسی طرح عورتیں بھی خدا کی بندیاں ہیں اور مذاہب میں کچھ تفریق و امتیاز کیا گیا ہو تو کیا گیا ہو لیکن قرآن عظیم کا اعلان عام ہے۔

إِنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۚ

یعنی میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل اور کام کو برباد نہ کروں گا وہ مرد ہوں یا عورت۔ تم میں سے بعض بعض سے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

جو نیک کام کریگا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان والے ہوں تو میں انہیں پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھونگا اور ان کے کاموں کی اجرت عطا کرونگا۔

قرآن عظیم اس قسم کے آیات سے معمور ہے بہر حال اب میں اس مسئلہ کی طرف آپ کو متوجہ کرتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ انسانی زندگی کے اور بہت سے شعبے ہیں اور ہر شعبہ کے متعلق اسلام میں مختلف مسائل ہیں ان میں چند مسائل بھی ہیں۔

(۱) انسانوں کے باہمی میل جول یا سوسائٹی کا کیا اصول ہونا چاہئے۔

(۲) مردوں اور عورتوں کے لباس کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔

(۳) گھر میں رہنے اور باہر نکلنے میں کن ضوابط کی پابندی کرنی چاہئے۔

ان مسائل یا سوالات کا تعلق صرف عورتوں سے نہیں ہے بلکہ مردوں سے بھی ہے ان کے متعلق تفصیلی احکام شریعت میں موجود ہیں البتہ ان ہی مسائل کے وہ دفعات جنکا تعلق عورتوں سے ہے ان کی اجمالی تعبیر ادب میں لفظ پردہ یا حجاب سے کیجاتی ہے۔ لوگ عموماً پردہ کے ان تفصیلی اجزاء و قوانین سے کسی ایک جزو یا قانون کو لے کر الجھ پڑتے ہیں ہر ایک کے سامنے چونکہ ناقص ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ ہر دفعہ کے متعلق اسلامی تصریحات کو جدا جدا عنوان میں آپ کے سامنے پیش کرتی ہوں۔

فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (قرآنی آیت)

یعنی جس کا دل چاہے یقین کرے اور جسکا دل چاہے انکار کرے

(۱) میل جول یا سوسائٹی کا مسئلہ۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح مرد مرد سے اور عورتیں عورتوں سے ملتی جلتی ہیں کیا ٹھیک اسی طرح ان ہی آداب و مراسم کے ضوابط کے تحت عورتوں کو اجنبی مردوں سے ملنے کی اجازت ہے یہ سوال یوں بھی کیا جاسکتا ہے۔ ایک ماں جس طرح اپنے بیٹے سے اور ایک بیٹی اپنے باپ سے

ایک عورت اپنے بھائی سے یا ایک بیوی اپنے شوہر سے جس طرح ملتی ہے کیا اسی طرح وہ ہر غیر محرم اجنبی مرد سے مل سکتی ہے۔ کسی متعصب تنگ نظر۔ ظالم مرد کا نہیں بلکہ عورتوں کے خالق رحمٰن و رحیم کے ارشادات و ہدایات کا شرف جس طرح مردوں کو حاصل ہے اسی طرح عورتوں کو بھی ہے۔

اُن احکام کے تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔

اول۔ حکم ہے کہ مردوں کی نگاہ عورتوں سے اور عورتوں کی نگاہ مردوں سے علیحدہ رہے قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ

ایمان والے مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور ایمان والی عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

بینائی کے احساس کو باہم ایک دوسرے سے جدا رکھنے کی شرح اس حدیث میں ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین۔ ام سلمہ اور میمونہ رضی اللہ عنہا کو ایک نابینا سے اپنی نگاہ کو جدا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ابوداؤد و ترمذی میں اس حدیث کا مشہور جملہ یہ ہے کہ حضور نے عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اَفَعَمْيَاوَانِ اَنْتُمَا اَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِهٖ

کیا تم دونو عورتیں بھی اندھی ہو کیا تم اُسے نہیں دیکھتی ہو

یہ ارشاد نبوی اس موقع پر ہوا تھا جبکہ ام مکتوم صحابی نابینا حضور کے پاس حاضر ہوئے۔ اپنی بیویوں سے فرمایا تم ہٹ جاؤ۔ بیویوں نے کہا کہ یہ تو اندھا ہے ہم کو کیا دیکھیگا۔ تو آپ نے فرمایا تم تو اندھی نہیں ہو۔

(۲) نہ صرف نگاہ کے واسطے بلکہ قرآن پاک میں یہ بھی حکم ہے کہ اپنے زیورات کے آواز کو بھی مردوں کے کانوں سے بچاؤ۔ ارشاد ہے۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ

یعنی عورتیں اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں جس سے زینت ظاہر ہو جائے یعنی ان کے پازیب وغیرہ کی آواز مردوں کے کان میں نہ پہنچے۔

(۳) صرف بینائی اور شنوائی کے ہی احساسات نہیں بلکہ حدیث صحیح میں بتصریح موجود ہے کہ عورتیں اپنی خوشبو کو بھی مردوں کی ناک سے جدا رکھیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ

اَيُّمَا امْرَاَةٍ اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ

یعنی ہر وہ عورت جس نے عطر ملا ہو وہ مردوں کے

عَلٰی قَوْمٍ لِیَجِدُوْا رِیْحَهَا فَهِیَ زَانِیَةٌ — پاس سے گزرے تاکہ اُس کی خوشبو وہ لوگ سونگھیں تو ایسی عورت زانیہ ہے۔

(۴) جب دور کے احساسات و تاثیرات کے متعلق اتنے احکام ہیں تو اُن سے سمجھا جا سکتا ہے کہ باہم اجنبیوں کا ایک دوسرے سے مصافحہ کرنا اور اُن کے چھونے کی اسلام نے کیسی سخت ممانعت کی ہوگی حدیث پاک میں صاف موجود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ یُّطْعَنَ فِیْ رَأْسِ اَحَدِکُمْ بِمِخْیَطٍ مِّنْ حَدِیْدٍ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّمَسَّ امْرَأَةً لَا تَحِلُّ لَهٗ رواہ الطبرانی و بیہقی یعنی تم میں سے کسی کے سر میں سوئی چبھوئی جائے تو بہتر ہے اس سے وہ کسی ایسی عورت کو چھوئے جو اس کے لئے حلال نہیں ہے۔ الغرض ان نصوص کا صاف و صریح اقتضاء یہ ہے کہ اجنبی عورتیں غیر محرم مردوں سے جس حد تک جدا رہ سکتی ہیں اُن کو جدا رہنا چاہئے اُسکا خلاصہ حضرت فاطمہ ہرا رضی اللہ عنہا کی اس روایت میں ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے۔

عَنْ عَلِیٍّ اَنَّهٗ کَانَ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَیُّ شَیْءٍ خَیْرٌ لِّلْمَرْأَةِ فَسَکَتُوْا قَالَ فَلَمَّا رَجَعْتُ قُلْتُ لِفَاطِمَةَ اَیُّ شَیْءٍ خَیْرٌ لِّلنِّسَاءِ قَالَتْ لَا یَرَیْنَ الرِّجَالَ وَلَا یَرَوْنَهُنَّ فَذَکَرْتُ ذٰلِکَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے۔ حضور نے پوچھا کہ عورت کے لئے سب سے اچھی بات کونسی ہے۔ لوگ چپ رہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ جب میں گھر آیا حضرت فاطمہ سے اس سوال کا ذکر کیا آپ نے فرمایا کہ عورتوں کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ نہ مرد عورتوں کو دیکھیں نہ عورتیں مردوں کو دیکھیں۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ حضرت علیؓ نے حضور سرور کائنات سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ فاطمہ میرے بدن کا ایک حصہ ہے۔

بہرحال اجنبی عورتوں اور مردوں کے باہمی میل جول کے اصل احکام یہی ہیں اور مسلمانوں کی شریف عورتیں جو اسلامی احکام اور قرآنی قوانین کی پابند ہیں ان کا ابتداء اسلام سے اس وقت تک ان ہی احکام پر عمل رہا ہے جس کی بنیاد نہ کسی ملک کے رواج نہ کسی غیر قوم کی تقلید پر قائم ہے بلکہ قرآن و حدیث کے بالکل کھلے ہوئے الفاظ کی اطاعت ہے۔ مثلاً اگر کسی اجنبی مرد کو کسی اجنبی عورت سے کوئی چیز مانگنی ہو یا لین دین کا معاملہ ہو تو حکم ہے۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِکُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِکُمْ

جب تم عورتوں سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو۔ تمہارے اور اُن کے لئے

وَقُلْنَ بِهِنَّ پاک طریقہ ہے۔

عورت کو ضرورت مردوں سے گفتگو کرنے کی اجازت ہے لیکن قرآن پاک نے اس میں شدید ترین لگادی ہے کہ اجنبی مردوں سے نرم اور رقیق لہجہ میں گفتگو نہ کرو بلکہ اس میں سختی ہونی چاہیئے۔ وہ آیات یہ ہیں۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ یعنی بات کرنے میں نرمی نہ کرو ورنہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ لالچ کرے گا۔

علاج و معالجہ کے موقع پر اجازت ہے کہ طبیب عورت کے اس مقام کو دیکھ اور چھو سکتا ہے جہاں مرض ہو۔ مثلاً ہڈی ٹوٹ گئی ہو یا پھوڑا نکلا ہو۔ اسی طرح دینی ضروریات کے لئے اس قانون میں نرمی پیدا کی گئی ہے۔

مثلاً حج کے موقع پر عورتوں کو اجازت ہے کہ مردوں کے ساتھ طواف وسعی و وقوف کریں تاہم جہاں تک ہو سکے عورتوں کے مجمع کو مردوں سے دور اور الگ رکھا جائے۔

مساجد اور عیدگاہ کی جماعت میں حاضر ہونے کی اجازت تھی اس کے ساتھ حکم تھا کہ عورتیں بچوں کی صف سے بھی پیچھے رہیں کہ اَخِّرُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَخَّرَهُنَّ اللّٰهُ

یعنی عورتوں کو پیچھے رکھو جب کہ خدا نے ان کو پیچھے رکھا۔ مگر یہ حکم بہ ضرورت تھا اس لئے کہ نماز کے متعلق اصل حکم عورتوں کے واسطے سرور کائنات کا یہ تھا کہ لَصَلٰوةُ الْمَرْاَةِ فِي بَيْتِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِي مَخْدَعِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِي بَيْتِهَا۔ رواہ الطبرانی

یعنی عورت کی نماز کوٹھری میں بہتر بہ نسبت گھر کے صحن کے اور کوٹھری در کوٹھری کے نماز بہتر ہے کوٹھری کی نماز سے۔ اس لئے قرن اول ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ لَوْ رَاٰی النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ الْمَنَعَهُنَّ حَتَّى الْمَسَاجِدِ (رواہ مسلم) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرماتے ان باتوں کو جو عورتوں نے پیدا کی ہیں تو ان کو مسجد میں آنے سے روک دیتے۔

لہذا جوان عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیا گیا۔ بہر حال جو کچھ ہوا ابتداء اسلام میں ہوا عرب میں ہوا قرن اول میں ہوا۔

عورت اگر جوان ہے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے گریباں کو اور ڈھنی سے اچھی طرح ڈھانک لے اور اپنے بناؤ سنگار زیب و زینت کی چیزوں کو ظاہر نہ کرے۔ قرآن پاک میں ہے۔

(۱) وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ ۔ عورتیں اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں۔ اپنی گریبانوں
(۲) وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ کو اوڑھنی سے ڈھانک لیں۔

کس چیز سے۔ اس کی تصریح بھی قرآن پاک نے کر دی ہے کہ جِلْبَاب (بڑی چادر سلی ہوئی یا بے سلی) اپنے اوپر ڈال لے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۔ اے نبی اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر چادر ڈال لیا کریں۔

قرآن کا جِلْبَاب یہی ہے جو سر کر اس زمانہ میں برقعہ ہو گیا ہے۔ اور یہ سلی چادر (برقعہ) کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس کا رواج عہد رسالت میں بھی تھا۔ ابو داؤد میں ہے کہ "ام خلاد" ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نقاب ڈال کر آئی۔ اس کا لڑکا شہید ہو گیا تھا۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ اس کا بیٹا مارا گیا لیکن اسے اپنی نقاب کی پڑی ہوئی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ "اگر مجھ پر بچہ کی محبت آئی ہے تو میری حیا و شرم پر تو مصیبت نہیں آئی ہے"

حدیث میں ایسے آثار بکثرت مل سکتے ہیں جن سے عہد نبوت میں نقاب اور برقعہ کا رواج ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ تو جوان عورتوں کے بیرونی لباس کا اصل حکم تھا۔ عورت اس لباس پر کس حد تک اضافہ کر سکتی ہے۔ اس اضافہ کی اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے جیسا کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ "عورت چھپانے کی چیز ہے"، عورت جس قدر بھی چھپا سکتی ہو اپنے آپ کو چھپائے۔ لیکن ضرورت پر نظر کرتے ہوئے خدائے تعالیٰ نے اس قانون کو نرم کر دیا ہے۔

إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ۔ لیکن سنگھار میں سے جو خود کھل جائے۔

مطلب یہ ہے کہ عورت زیب و زینت کو جہاں تک ممکن ہو چھپائے لیکن اگر زینت کا کوئی حصہ خود بخود کھل جائے تو مضائقہ نہیں "خود بخود کھل جانا" ایسی چیز ہے جس کی بنیاد ان مشاغل کی نوعیت پر ہے جن میں عورت مصروف ہو۔ مثلاً ایک امیر عورت گھر سے صرف اس لئے نکلتی ہے کہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں چلی جائے اس وقت وہ زیادہ سے زیادہ جس چیز کے کھولنے پر مجبور ہے وہ محض آنکھ ہو سکتی ہے تاکہ راستہ دیکھتی جائے۔ اسی طرح ایک مزدور عورت بازار سے سودا اناج یا کنوئیں سے پانی لانے کو گھر سے نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں کو صرف آنکھ کھولنے سے وہ انجام

نہیں دے سکتی لہٰذا بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعود۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور فقہائے حنفیہ نے بیرونی لباس کی حد یہ مقرر کی ہے کہ ان حالتوں میں عورت چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھلا رکھ سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس میں "دونوں پاؤں" کو بھی شریک کرلیا ہے۔ اور قاضی ابو یوسف نے بازو کے نیچے ہاتھ کا جو حصہ ہے اس کے کھولنے کی بھی اجازت دی ہے۔ یہ تمام باتیں فقہ کی عام کتابوں میں موجود ہیں جو مختلف مشاغل کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

لیکن اس حد تک عورتوں کو اجازت کی نوعیت بالکل ایسی ہے جیسا کہ مردوں کے لباس کی کم از کم حد "ناف سے گھٹنوں تک" مقرر کی گئی ہے۔ یعنی ہر حالت میں کم از کم اتنے حصہ جسم کا چھپا رہنا ضروری ہے۔ عجیب بات ہے کہ عورتوں کے اس کم از کم لباس کو (جس کی اجازت مجبوری اور ضرورت کی بناء پر ہے) بعض لوگ شرعی لباس قرار دیتے ہیں اور اس پر اضافہ کو "غیر شروع" کہتے ہیں۔ گویا اس سے زیادہ لباس پہننا عورتوں کو شرعاً ممنوع ہے۔ میں ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر عورتوں کے لئے شرعی لباس کی حد یہی ہے تو کیا مردوں کا اسلامی اور شرعی لباس "ناف سے گھٹنوں تک" صرف ایک اونچی دھوتی یا صرف ایک نیکر ہے۔

مشاغل کے لحاظ سے ظہور کی حد عورتوں کے لئے جو آخری ہو سکتی تھی فقہا نے صرف اس کو متعین کر دیا ہے۔ اور چونکہ لباس کا یہ کم از کم درجہ ہے اس لئے اس کی پہننے والیاں (جو عموماً غیر متطبع طبقہ کی ہوتی ہیں) کم تر درجہ کی عورتیں سمجھی گئی ہیں بلکہ عہد نبوت کے بعد تقویٰ اور پارسائی کی بتدریج کمی کو محسوس کرکے متاخرین فقہا نے اس میں تنگی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

وَتُمْنَعُ الشَّابَّةُ وُجُوباً عَنْ كَشْفِ الْوَجْهِ بَيْنَ الرِّجَالِ۔	جوان عورت لازمی طور پر مردوں کے سامنے چہرہ کھولنے سے روکی جائے۔

یہ تو نوجوان عورتوں کے بیرونی لباس کی حد تھی سن رسیدہ عورتوں کے لباس میں قرآن پاک نے وسعت کر دی ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحاً فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ۔	جو عورتیں (نسوانی فرائض سے) تھک چکی ہیں اور اب نکاح کی امید نہیں رکھتیں تو ان کے لئے مضائقہ نہیں اگر وہ (بیرونی) لباس اتار دیں۔

اس سے برقعہ یا چادر بغیر نکلنے کی اجازت نکلتی ہے مگر ساتھ ہی لباس میں بناؤ سنگھار اور زیب و زینت سے احتراز کی سخت تاکید بھی کی گئی ہے۔ اس حکم بالا کے بعد یہ الفاظ ہیں غَيْرَ

مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ بناؤ سنگھار کرکے اور بن ٹھن کر باہر نکلیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ بوڑھی عورتوں کو بھی خدا کا مشورہ یہ ہے کہ برقعہ یا چادر نہ اُتاریں تو بہتر ہے۔ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ (اور اگر وہ عفت اختیار کریں تو اُن کے لئے بہتر ہے)۔

تیسرا سوال۔ گھر سے آمد و رفت کا ہے۔ اس سوال کا تعلق عورتوں اور مردوں سے ہے۔ گھر میں انسان بے تکلفی کے ساتھ امن اور راحت کی زندگی بسر کرتا ہے جس آزادی سے وہ گھر میں رہ سکتا ہے باہر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے گھر میں آنے والوں پر خاص قسم کے قیود عائد کرنے ضروری ہیں۔

"لباس" کے ذیل میں کہا جا چکا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عورتوں کے لباس کی دو قسمیں ہیں خانگی اور بیرونی۔ خانگی لباس میں چونکہ عورتوں کو وسعت دی گئی ہے اس لئے گھر کا وہ حصہ جہاں عورتیں اپنے اس لباس میں آزادی کے ساتھ رہتی ہوں۔ سوائے محرم مردوں کے اور کسی کو اس میں جانے کی اجازت نہیں۔ قرآن پاک میں صاف طور پر یہ تصریح موجود ہے کہ۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ	اور اپنی زینت نہ ظاہر کریں مگر صرف اپنے شوہروں
اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُولَتِهِنَّ اَوْ	اپنے باپ اور اپنے شوہروں کے باپ بیٹوں
اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُولَتِهِنَّ۔	اور شوہروں کے بیٹوں پر۔

اور قرآن ہی نہیں بلکہ احادیث میں بھی اسکی تفصیل موجود ہے۔ بخاری میں حضرت عقبہ ابن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خبردار عورتوں میں نہ گھسا کرو"

یہ تو گھروں میں آنے کے متعلق تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے گھر سے نکلنے کے لئے بھی عورتوں پر کچھ قیود عائد کئے ہیں یا جس طرح مرد بے روک ٹوک گھر سے باہر جا سکتا ہے اسی طرح عورت کو بھی اجازت ہے۔

جہاں تک اسلامی تصریحات کا تعلق ہے عورت کا تعلق گھر سے بہ نسبت مرد کے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عورت کو "اہل البیت" "گھر والی" کہا جاتا ہے۔ گویا گھر کی مالکہ وہی ہے۔ گھر کے اس خصوصی انتساب کو اس زمانہ میں "قید" اور گھر کو عورت کا "زندان" یا "قفس" کہا جاتا ہے بہرحال عورتوں کے متعلق یہ صاف حدیث طبرانی میں موجود ہے کہ لَيْسَ لِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ فِي الْخُرُوجِ اِلَّا مُضْطَرَّةً (عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے میں کوئی حصہ نہیں ہے بجز اس کے کہ مجبور ہوں) اسی کے طرف دوسری حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اَلْمَرْءَةُ عَوْرَةٌ اِذَا اَخْرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ (عورت چھپانے کی چیز ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اُسے

جھانکتا ہے۔

قرآن پاک میں اس قانون کا جہاں ذکر ہے وہاں بجائے عام عورتوں کے امہات المومنین کو براہ راست مخاطب فرمایا گیا ہے اور اس لئے بعض لوگ اس قرآنی حکم کو صرف امہات المومنین کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جن الفاظ میں خدائے تعالیٰ نے اس حکم کو بیان فرمایا ہے اُن سے اس خصوصیت کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ	گھروں میں ٹھہری رہو اور پہلی جاہلیت کی رواج کے مطابق بن ٹھن کر نہ نکلا کرو۔ نماز پڑھو زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

اس آیت میں چند باتوں کا حکم ہے۔

(۱) گھر میں ٹھیرے رہنا۔ (۲) جاہلیت اولیٰ کے سے بناؤ سنگھار نہ کرنا۔ (۳) نماز قائم کرنا۔ (۴) زکوٰۃ دینا۔ (۵) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا۔

ان میں سے آخری چار باتیں "امہات" کے ساتھ قطعاً مخصوص نہیں کیا زینتِ جاہلیت سے احتراز۔ نماز و زکوٰۃ کی ادا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیا جملہ مسلمان عورتوں پر اس کی تعمیل واجب نہیں۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو ایک ہی سلسلہ کے صرف ایک حکم کو محض "امہات" کے ساتھ مخصوص کر لینے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ حدیثوں سے عورتوں کے گھر سے بے ضرورت نکلنے کی ممانعت عام معلوم ہوتی ہے۔ آخر کس بنیاد پر اس حکم کو ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص کیا جاتا ہے۔ البتہ قرآن ہی سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام ان اعلیٰ اور بلند خیال عورتوں کے لئے دئے جاتے ہیں جو اپنی زندگی کو تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتی ہیں جیسا کہ اس آیت کے ابتدائی الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ ۚ	اے نبی کی بیویو تم معمولی عورتوں کے مانند نہیں ہو اگر تقوے کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔

خواتین عظام!

کیا تقوے کی ضرورت امہات المومنین کو تھی۔ جملہ مسلم خواتین کو نہیں ہاں زینت جاہلیت سے احتراز یعنی جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں بناؤ سنگھار کے ساتھ خواتین میلوں تماشوں میں شریک

ہوتی تھیں اس سے مافعت خاص ازواج مطہرات کی ہے جن کے مطہر ہونے کی سند قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اُن کو وسوسۂ شیطان یا اتہام مخالفین کا اندیشہ معاذ اللہ تھا اور ہم لوگ اس سے پاک ہیں ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہم کو ضرورت احتراز نہیں یا قیام نماز و ادائی زکوٰۃ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت یہ سب حکم ہمارے لئے نہیں بلکہ امہات المومنین کے لئے تھے۔

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اب مسلمان بھی مقدس قرآن کی ویسی تاویلیں کر رہے ہیں جیسا کہ غیر اقوام نے تورات اور انجیل کے پاک حکموں کو بدل ڈالا۔

لیکن جس طرح پردہ کے تمام واقعات میں استثنا ہے اسی طرح اس قانون میں ضرورت و حاجت کے لحاظ سے استثنا کیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے۔

اُذِنَ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِکُنَّ ۔ تم عورتوں کو اجازت دیگئی ہے کہ ضرورتوں کے لئے باہر نکل سکتی ہو۔

اور ضرورت کے وقت مسلمان عورتوں کا یہ طبقہ ہمیشہ باہر نکلتا رہا ہے۔ حج کے لئے تیرہ سو سال سے انہی گھرانوں کی عورتیں ہر سال وادی عرب میں جاتی ہیں۔ جب کبھی ضرورت پیش آئی ہے اُن عورتوں نے جنگ کے موقعوں پر مردوں کے علاج معالجہ اور سپاہیوں کی خدمت انجام دی ہے اور جب ضرورت پیش آئے گی ہمیشہ کریں گی۔ لہٰذا گھر سے نکلنے کے لئے ہر حال میں ہم پر اپنے جسم کو چھپانے کی ضرورت نہ ہبا فرض ہے۔ اب رہا سواری کا مسئلہ تو وہ استطاعت پر موقوف ہے جب مستطیع مرد بھی گھروں سے کسی نہ کسی سواری پر نکلتے ہیں تو عورتوں کو باوجود استطاعت کے محض پردہ کی خاطر میں بغیر سواری نکلنے پر اصرار کرنا ایک عجیب سی بات ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عورتوں کا گھر سے نکلنا چونکہ صرف ضرورت اور مجبوری پر مبنی ہے جس کی تصریح احادیث سے کی گئی ہے۔ اور عورت اپنے تمام اعضا کے لحاظ سے چھپانے کی چیز ہے جیسا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان ہوا۔ سواری کا رواج بھی کوئی نیا رواج نہیں۔ عرب میں اسلام سے پیشتر بھی کپڑے منڈھے ہوئے ہودجوں کا جن کو محمل کہتے ہیں رواج تھا۔ اسلام نے بھی اس رواج کو قائم رکھا احادیث میں کثرت سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ازواج مطہرات اور دوسری عورتیں محملوں میں سفر کرتی تھیں پردہ کا قانون اپنے مختلف درجات کے لحاظ سے اسوقت مسلمانوں میں مروج ہے۔ وہ قرآن، حدیث اور فقہ کے زور سے مختلف طبعات اور حالات کے لحاظ سے اسلامی پردہ کہلاتا ہے اور اس پردہ کو ہمارے جدید روشن خیال بھائی ہر طرح تعلیم و مانع ترقی خیال کرتے ہیں اور اُن کی

یہ آواز ہندوستان کے ہر گوشہ میں گونج رہی ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب عورتوں کا پردہ ہے۔

خواتین! ہماری قوم کے اسباب زوال ایسے نہیں ہیں جن کے مفہوم میں اتنی صریح غلطی کے ہم معترف ہوسکیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری قوم صدیوں قعر جہالت میں گرفتار رہی مذہب جس کی پرستش سے مسلمان سلف عروج کمال کو پہنچے تھے اسے ہم نے پس پشت ڈال دیا ذخیرۂ علوم و فنون تجارت زراعت سب کچھ کھو دیا۔ کیا اب یہ سب گم شدہ نعمتیں ہمارے قومی بھائیوں کو ہمارے حرف نقاب چاک کر دینے سے حاصل ہو جائیں گی جن قومی بہنوں نے پردہ قطعی ترک کر دیا اپنی قومی اور ملی کونسی خدمات انجام دیتی اور مثل خواتین سلف کس کو درس فقہ حدیث دے رہی ہیں کیونکہ ایک سخت مشکل جس نے مسلمانوں کو پردہ کی طرف راغب رکھا ہے قانون حکومت میں عورت کے کامل وقار کا فقدان ہے سوسائٹی و تمدن و معاشرت کا زیادہ تر حصہ اس کے مناسب حال نہیں۔ تھیٹر۔ سینما۔ رقص و سرور تمدن کا جزو ہے۔ بے عصمتی کا ارتکاب کوئی جرم نہیں ہے۔ بے حجابی کے مرکز ہر شہر اور قصبہ میں قائم ہیں افواج حکومت کے لئے ان مراکز کا خاص اہتمام و انتظام ہے اور سول میرج ایکٹ جس کی رو سے ایک مومن اور مشرک یا مشرک اور مومنہ کا ازدواج بہ آسانی ہوسکتا ہے جو مسلمانوں کے لئے قطعی حرام ہے جس کی تازہ مثالیں دہلی۔ پنجاب۔ مدراس میں موجود ہیں۔ خواتین کیا ایک مسلمان کی حمیت مذہبی اس کو روا رکھ سکتی ہے کہ ایسے ملک اور ماحول میں رہ کر اپنی شرافا خواتین کو ان سوسائٹیوں میں شریک کرے جو اسلامی حیا کے خلاف ہیں۔

اسلام نے اس بے حیائی سے عورت کو بچا کر کامل آزادی عطا کی ہے اور ایک مسلمان عورت مواضع زینت کو مستورات کرکے اپنے کاروبار اور ضرورتوں کے لئے نکل سکتی ہے اور ہر قسم کے تمدنی و معاشرتی کاموں میں شریک ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کو یہ اجازت نہیں کہ وہ غیر محرموں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھے۔ صاحب مقدور خواتین کو قطع نظر کرکے غیر مستطیع خواتین اگر نقاب برقعہ کے ساتھ مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے پیادہ بھی جائیں تو اسلامی پردہ کے ہرگز خلاف نہیں جو گروہ جاہل مسلمانوں کا اس طریقہ کے خلاف ہے اور مانع تعلیم و ہنر ہے اس پردے کو اسلام کی توہین اور مردوں کی زیادتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ہر طبقہ خواہ وہ امراء ہوں یا غرباء تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہر طرح مذہباً آزاد ہے اور مسلمان عورتوں کو شرعی پردہ کے ساتھ زیور علم و ہنر سے اپنے کو ایسا مزین کر لینا فرض ہے کہ وہ بوقت ضرورت شرافت و

عصمت کے ساتھ اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کرسکتی ہیں اس کے تسلیم کرنے سے قاصر ہوں کہ پردہ ہارج تعلیم ہے کیونکہ تجربہ اور مشاہدہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ ہم پردہ کے ساتھ دائرہ نسوانیت کے اندر شوہر کی ہر معاونت اور قومی بلکہ ملکی خدمت بھی انجام دے سکتی ہیں۔ اس کی تائید کی مثال میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی ذات بھی موجود ہے۔ پردہ اگر مانع تعلیم ہوتا تو آج کے جلسہ میں ہماری صدر صاحبہ کی ماما ہستی کرسی صدارت کو کیسے مزین کرسکتی اور اس وقت بکثرت پردہ نشین تعلیم یافتہ خواتین کا جو مجمع پیش نظر ہے وہ کیسے میسر ہوتا۔

ضرورت البتہ اس کی ہے کہ ہماری صاحب مقدور بہنیں اُن مسلمان خواتین کو جو بوجہ کم استطاعت ہونے کے برقعہ کے ساتھ تحصیل علم کریں یا وہ مصیبت زدہ خاندان جن کا کوئی کفیل یا ذریعہ معاش نہیں یا وہ ستم رسیدہ قابل رحم ہستیاں جن کے شوہر نان ونفقہ نہیں دیتے اگر پردہ کے ساتھ محنت مشقت کریں تو ان کو ہماری صنف کی سوسائٹی نگاہ تذلیل سے نہ دیکھے بلکہ اپنے مذہبی احکام کے بموجب اپنی مجالسوں میں انکا احترام رکھا جائے کیونکہ ستورات اسلام کا اصلی پردہ سواضع زینت کو مستور رکھنا ہے۔ ڈولی۔ موٹر گاڑی بگھی لازمات سے نہیں ہے۔ اس کی پابندی استطاعت اور حالت کی ضرورت پر مبنی ہے۔

خواتین!

میری اس طول طویل تقریر سے غالباً پردہ کی حقیقت اور احکام کی تصریحات نیز جہالت کی غلط فہمی کی تفصیل آپ کے ذہن نشین ہوگئی ہوگی اور اس تجویز سے کہ پردہ شرعی ہر مسلمان خاتون کے لئے ضروری ہے آپ اتفاق کریں گی۔

خواتین! جن مذہبی آیات اور جن عقلی دلائل سے مذہبی احکام کے تحت میں ضرورت شرعی پردہ کو میں نے پیش کیا ہے اگر پردہ کی اسلامی حقیقت اور اُس کے واقعی شرعی حدود یہ نہیں ہیں تو بہربانی اسٹیج پر میری تردید کیجئے۔ میں دلائل تردید کو جو مذہب کے بھی ماتحت ہوں سننے کے لئے تیار ہوں۔

زہے نصیب جو دنیا بشر کو جنت ہو۔ زہے نصیب جو ہو ساتھ نیک بیوی کا
وہ زن علوم کے شوقی ہو جسکے دامن میں وہ زن پسند ہو جس کو علوم کا گہنا
رخ صبیح پر جس کے ہو غازۂ اخلاص سیاہ آنکھوں میں جس کے ہو شرم کا سرما
اگرچہ لاکھ مخالف ہوا ہو طوفانی چراغ عفت وعصمت کبھی نہ ٹھنڈا

کبھی کسی کی برائی کی آرزو نہ کرے
حسد کے زنگ سے ہو صاف آئینہ دل کا

خدا بڑھائے جو دولت گئے غرور اس کا
خدا بڑھائے جو کلفت کرے وہ شکر خدا

شگفتہ دیکھ کے شوہر کو باغ باغ رہے
ملول دیکھ کے شوہر کو ہو ملال سوا

اگر ہو صاحب اولاد تو یہ لازم ہے
خیال بچوں کی تعلیم کا ہو حد سے سوا

جو درسگاہ کو جائیں تو پہنیں کپڑے صاف
جب آئیں گھر میں تو پائیں غذا بھی پاکیزا

غزل

از

مولوی مولوی محمد صاحب تشنہ حیدرآبادی

اُس کو مجھ پر ترس نہیں ہے
کوئی فریاد رس نہیں ہے

ویرانے کو دیکھ چشم عبرت
گلشن ہے یہ خار و خس نہیں ہے

جس پر ہے نگاہ لطف صیاد
تنگ اُس کے لئے قفس نہیں ہے

ہو قتل پہ مستعد اگر..... تم
کچھ ہم کو بھی پیش و پس نہیں ہے

ہمت کر و پا ہی لو گے اُس کو
کیوں کہتے ہو دست رس نہیں ہے

جب تک ہے تری امید مجھ کو
دل میں مرے کچھ ہوس نہیں ہے

ہے تو سن عمر تیز رفتار
بس میں مرے یہ فرس نہیں ہے

جاتے ہیں خموش سب عدم کو
اس قافلے میں جرس نہیں ہے

کیا حال کہوں ہوس کا تشنہ
سب بس میں ہے پھر بھی بس نہیں ہے

ترجمہ گلدستہ بیجاپور

خواجہ میر احمد علیخاں احمد نے نواب لیسر خاں بہادر دلیر جنگ حاکم بلدۂ شاہنور (بیجاپور دکن) کی فرمائش پر ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۵ء میں گلدستہ بیجاپور کے نام سے فارسی زبان میں "شاہان عادل شاہی" (۹۵۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) کی تاریخ لکھی تھی۔ غالباً گلدستہ بیجاپور طبع ہونے کے باوجود کم یاب ہے، دلیر جنگ کے خلف الصدق نواب ابوالقاسم خان نے ۱۲۷۵ھ میں خود مولف سے اس کا اردو ترجمہ کرایا۔ اس کے چھپنے کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکا اور یہ ایک کم یاب چیز ہے۔ عادل شاہیوں میں علی عادل شاہ ثانی کا زمانہ ہر اعتبار سے قابل فخر سمجھا جاتا ہے۔ اس میں عادل شاہی اردو شعرا کا دور بھی ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ ملا نصرتی اور ہاشمی اسی دور کی یادگار ہیں نصرتی اور ہاشمی کے علاوہ آتشی، مرزا مقیم اور دولت شاہ فارسی کے ساتھ ہندی (دکنی) بھی کہتے تھے، ہاشمی کی ریختی کے ساتھ یوسف زلیخا کا قصہ بھی بعض کتابوں میں پڑھنے کا موقع ملا تھا، لیکن علی عادل شاہ ثانی کے حال میں جہاں ہاشمی کا ذکر آیا ہے وہاں اسکی مثنوی اور نجات نامہ دو تصانیف کا بھی ذکر آگیا ہے۔ جسکا "اردوئے قدیم" اور "دکن میں اردو" جیسی تحقیقانہ تالیفات میں بھی پتہ نہیں چلتا۔ ترجمہ گلدستہ بیجاپور کی ترتیب سلاطین کے عہد وار ہے اور ہر ایک عہد کو مجلس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے بعض تاریخی اختلافات بھی ہیں جن سے ہمیں سر دست کوئی بحث نہیں، اس وقت ہم "ترجمہ گلدستہ بیجاپور" میں سے علی عادل شاہ ثانی کا حال مترجم کی زبان سے نقل کر دیتے ہیں۔ (ع۔ ی)

مجلس ساتویں ذکر میں علی عادل شاہ ثانی بن سلطان محمد عادل شاہ نور اللہ مرقدہٗ کے

ظاہر ہوئے کہ بلقیس زمانی پناہیاں بانی بادشاہ بیگم صاحبہ دختر بادشاہ جم جاہ قطب شاہ زوجہ جنت مکان فردوس آشیان سلطان محمد عادل شاہ نور اللہ مرقدہ علی عادل شاہ کو خورد سالی سے پرورش کرنے سعی وافر مبذول رکھکر جمیع فنون سے آراستہ و پیراستہ کی تھی بعد از رحلت سلطان محمد عادل شاہ کے اعیان و ارکان اور حضوریون کو جمع کر دے کے وقت نیک اور ساعت سعید انتخاب کر تاریخ چھبیسوین ماہ محرم روز سہ شنبہ سنہ ۱۰۶۷ ہجری سنہ ۱۶۵۶ عیسوی میں کہ عمر علی عادل شاہ کی انیس سال کی تھی دار السلطنت بدیاپور میں تخت سلطنت پر جلوس فرمائے شبیہ اس بادشاہ گیتی پناہ کی واسطے ملاحظہ ناظرین کی منقوش ہوئی[1] اور قطعہ تاریخ جلوس علی عادل شاہ ثانی کا یہ ہے:۔

بہر سال جلوس شاہ دکھن — گفت ہاتف سحر بصوت جلی
نیست آخر درین سخن حرفے — جانشین محمد است علی
۱۰۶۷

[1] اصل کتاب میں قلمی تصویر بھی چسپیدہ ہے۔

اور عبدالنبی تاریخ میں اس جلوس کے یہ مصرعہ کہا ؎

نوبت شاہی زدہ بعد محمد علی ۔ اور محمد قلی یہ قطعہ کہا۔

سنت ایزد کہ بر تخت خلافت جلوہ گر آفتابے کز فلک عرش گشت عالم منجلی

درمیان شہریاران افتخار اوراسزد زانکہ شد ہمچون علی ملک محمد راولی

سال تاریخ جلوسش خواستم از عقل کل گفت امیرالمومنین بعد از محمد شد علی

علی عادل شاہ ثانی بادشاہ رنگین مزاج تھا اور اکثر اشعار آبدار و مضامین تازہ بہار طبع رنگین سے اسکی سرزد ہوتے تھے اور شاعران لطیفہ گو کی بزم محک تاثیر میں اس کے قدر تمام تھی اور شعر گویان تازہ خیال اس بادشاہ نکتہ سنج کے دربار فیض بار میں حاضر رہا کرتے تھے چنانچہ میان نصرتی کہ خیالات رنگین و اشعار تازہ مضامین اس کے مقبول خاص و عام ہیں اور شعرائے زمان میں ملک الشعرا سے مشہور ہے اور طبع زاد سے اپنی کتاب گلشن عشق اور علی نامہ نام سے اُس شہریار عالی وقار کے تصنیف کیا ہے جو کوئی نسخہ زبان ہندی میں اس خوبی اور تازہ مضمونی سے نہیں بنا ہوگا۔ دوسرے عمدہ اکابران دہر استاد زمان سید نورالدین خلف استاد العلما حضرت سید محمد علی جو باوجود تحصیلات علوم معقول و منقول کے حقیقت سے اہل سخن کے بھی کما حقہ آگہی رکھتے تھے اور اشعار آبدار بھی گاہ گاہ فرمایا کرتے تھے جو نتائج طبع ہے ان کے تاریخ عادل شاہی ہے زبان فارسی سے تاریخ اس شہریار علی تبار کی لکھے ہیں۔ تیسرے حکیم آتشی کہ فکر بلند اس کی رتبہ سنج طارم اعلیٰ کی تھی۔ چوتھا مرزا متیم کہ معنی طرازی و لفظ پردازی میں عدیل و سہیم نہیں رکھتا تھا۔ پانچوان دولت شاہ جواد رنگ نشین کشور سخنوری کا تھا۔ اور ملا نصرتی شاعر ہندی گو تھا و شاہ نوراللہ و مرزا متیم و مرزا دولت شاہ و حکیم آتشی اکثر فارسی گو تھے اور ہندی شعر بھی کہتے تھے۔ اور سوائے انہون کے بہت شعرا فارسی گو اور ہندی بھی تھے۔ چنانچہ ایک ان میں سے ہاشمی تھا کہ احسن القصص کو زبان ہندی سے شعر پردازی کر کے داد سخن کا دیا ہے۔ اور رسالہ سخات نامہ بھی نتائج طبع سے اس کے ہے۔ اور عبداللطیف و عبدالنبی اکثر قصائد بفصاحت و بلاغت تمام زبان فارسی سے کہے ہیں۔ الغرض اسی شہریار عالی بتار کے عصر میں بیجاپور معمور تھا۔ اور شعرا و فضلا و زہرا و صلحا و اولیا و جمیع اہل فنون بارگاہ سلطنت میں اس کے حاضر تھے۔ اور وزرا و امرا و مقربان سلطنت سے اس کے خان محمد و سید ابوالحسن کمونہ۔ و رندولہ خان و بہلول خان۔ و عبدالمحمد ارسلوے زمان۔ و ملا محمد۔ و افضل خان و محمد یعقوب۔ و عزیز خان۔ و ملک متبا و ملک آقا خسرو۔ و عبداللہ خان و رہبت خان و ناصر محمد۔ و یوسف خان و داؤد خان۔ و ملک جیفی۔ و محمد علی۔ و خاکجی ملک۔ و سیدی الماس۔ و شہ نواز خان۔ و میر نعمت اللہ۔ و فرزند خان۔ و کمال خان

وسدھی جوہر۔ وصلابت خاں۔ ومنجلی شاہ وشاہ جے راجہ۔ ومینا جی بھونسلے۔ وشرزہ راؤ۔ ووسواس راؤ وباجی گھوڑپڑہ اور قضات وعلما سے سید علی محمدؒ۔ وقاضی حبیب اللہ۔ وشاہ نور اللہ۔ و ابراہیم خاں۔ وشاہ ابوالمعالی اور ۱۰۶۷ھ یکہزار سینٹ ہجری مطابق ۱۶۵۶ء سولاسو چھپن عیسوی میں کہ سنہ جلوس اس شہریار کا ہے۔ سروزیر خاں محمد تھا۔ اور اسی سنہ میں علی عادل شاہ ثانی حسینی محل بنا فرمایا۔ اور ۱۰۶۸ھ یکہزار اڑسٹھ ہجری مطابق ۱۶۵۷ء سولہ سو ستاون عیسوی میں خان محمدؒ وزیر کو قتل کروایا تاریخ اس کے قتل کی یہ ہے۔ آہ خان محمدؒ شہید ایضاً بغداد وند۔ اور اسی سنہ میں ایک مسجد بنا کیا۔ اور ۱۰۶۹ھ یکہزار انہتر ہجری مطابق ۱۶۵۸ء سولہ سو اٹھاون عیسوی میں علی عادل شاہ میزبانی کرکے تمام بیجاپور کے لوگوں کو کھانا کھلایا۔ اور اسی سنہ میں عبدالحمد کو وزارت کی خدمت عطا کیا۔ تاریخ اس کی یہ ہے۔ وایں سرفرو بستی بعبدالحق بسزد۔ اور اسی سنہ میں حصار بیجاپور کے برجیں تیار کروایا۔ پھر اسی سنہ مذکور میں ملک الماس کو سر لشکر کیا اور چنیاور کے قلعہ پر قابض ومتصرف ہوا تاریخ اس کی یہ ہے۔ صاحب عالم سلامت۔ وہی چنیاور آیا۔ اور ۱۰۷۰ھ یکہزار ستر ہجری مطابق ۱۶۵۹ء سولہ سو انسٹھ عیسوی میں علی محل تیار کیا تاریخ اس کی یہ ہے۔ علی محل بمینو گشت اور علی عادل شاہ ثانی اسی سنہ مذکور میں سفر گروہ اور مجمو بندر کا کیا اور اسی سنہ میں افضل خاں مارا گیا تاریخ اس کے قتل کی یہ ہے۔ زجان افضل حیف۔ اور ۱۰۷۱ھ یکہزار یکہتر ہجری مطابق ۱۶۶۰ء سولہ سو ساٹھ عیسوی میں علی عادل شاہ ثانی چلکہ اور لوڑگل پر سواری کیا اور اسی سنہ میں جوہر کو خطاب صلابت خانی دے کر سیوا کے مقابلہ پر کہ اس نے قلعہ پرنالے کا دغا سے لیا تھا روانہ کیا۔ جوہر مذکور نے لشکر جرار اور ساز وسامان جنگی لیکر بڑی محنت وجانبازی کیا لیکن اس نے اس قلعہ پر قابض نہوا آخر الامر بادشاہ خود متوجہ اس مہم کا ہوکر قلعہ پرنالہ کا لیا۔ تاریخ اس کے فتح کی یہ ہے۔ آمد قلعہ پنالہ ویکے سوارے عادل شہا اور نصرتی کہا سو تاریخ یہ ہے۔ علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں۔ اور ۱۰۷۲ھ یکہزار بہتر ہجری مطابق ۱۶۶۱ء سولہ سو اکسٹھ عیسوی میں جوہر صلابت خاں علی عادل شاہ ثانی سے بغاوت کیا بادشاہ اس کو تنبیہ پہنچا کر سر اس کا کاٹا۔ تاریخ اس کی یہ ہے۔ بمرداں جوہر از مہابت عادل اور تاریخ جوہر صلابت خاں مارا جانیکی میاں نصرتی کہا سو یہ ہے ؎ باعمی ہوا ہوا ؎ اور ۱۰۷۳ھ یکہزار تہتر ہجری مطابق ۱۶۶۲ء سولہ سو باسٹھ عیسوی میں تیسری تاریخ کو رجب کے علی عادل شاہ ثانی رفیق بخش سواد بنکاپور ویکھیری وبدنور ہوکر تاریخ اُنتیس ماہ جمادالاول ۱۰۷۴ھ یکہزار چوہتر ہجری مطابق ۱۶۶۳ء سولہ سو ترسٹھ عیسوی کو مراجعت فرما کر داخل پایہ تخت

بیجاپور کے ہوا۔ اور وہی سنہ میں شاہ پیٹھ کے آبادی کی بنا ڈالا۔ اور علی عادل شاہ ثانی کو ایک فرزند اور ایک دختر تھی فرزند کا نام سکندر عادل شاہ اور دختر کا نام پادشاہ بی بی تھا اور سنہ ۱۰۸۳ھ یکہزار ترایسی ہجری مطابق سنہ ۱۶۷۲ء سولہ سو بہتر عیسوی میں علی عادل شاہ ثانی عارضۂ سے فالج کے بیمار ہوا۔ حقیقت اس کی یوں ہے کہ بادشاہ ادویات حارا سا کے استعمال فرما کر حرارت سے ادویات کے آب سرد پیا تھا اور وقت اول صبح کے جو چوتھی ربیع الاول کی تھی واسطے استقبال مظفر خاں کے خیدیہ پور تک سواری کر کے راستے میں ہوا زدگی سے گرانی بدن کی ہو کر جلدی تمام مراجعت کیا۔ جب کہ دولت خانہ میں داخل ہوا چھٹے طاس کے وقت پر اسی تاریخ کو مفلوج ہو کر وہ دن و رات بے ہوش اور مطلق بے حرکت رہا دوسرے روز تھوڑا کچھ ہوش میں آیا آدھا بدن بے حس ہوا تھا۔ عبدالمحمد و خواص خاں واسطے دیکھنے بادشاہ کے جا کر پھر اپنے گھروں کو آئے۔ مظفر خاں و مرزا یوسف خاں و علی عجب خاں و دھر ماجی پنت دبیر اتنے لوگ قرب تمام پا کر انیس خلوت سرائے خاص ہوئے تھے اور دروازے تمام بند کر کے آمد و رفت کے لئے دریچے کھلے رکھے تھے۔ اور بادشاہ کا معالجہ کرنے میں مشغول تھے۔ حکیم شمشاد اور دوسرے اطبا بھی معالجہ کرتے تھے۔ بادشاہ تین روز بیہوش مطلق رہا چوتھے روز تھوڑا ہوش میں آیا اگرچہ صحت کلی نہیں ہوئی اور مرض روز بروز افزوں تر تھا ویسی حالت میں بھی حکمرانی کرتا تھا۔ اور عبدالمحمد تین چار بار واسطے دیکھنے بادشاہ کے آتا تھا۔ اور خواص خاں یکروز دو روز کو آمد و رفت رکھتا تھا اور حضوریان و خدام لوگ جب بادشاہ یاد فرماتا تھا حاضر ہوتے تھے اور دیانت راؤ عبدالمحمد کے جانب سے سابق کے دستور موافق حضور میں بادشاہ کے آمد و رفت رکھتا تھا اور عبدالمحمد مستقل تھا کسی کو چون و چرا کا مجال نہ تھا۔ اور بادشاہ کے دم حیات تک کچھ خلل ارکان سلطنت میں راہ نہیں پایا۔ اور دیانت راؤ ظاہر و باطن میں عبدالمحمد سے رابطہ رکھتا تھا اور مرزا یوسف خاں خواص خاں کے جانب تھا۔ اور دھر ماجی پنت عبدالمحمد و دیانت راؤ کا دشمن تھا واسطے سلامتی اپنے مظفر خاں کے استحکام کے لئے سعی بلیغ کرتا تھا۔ اور بادشاہ جانتا تھا کہ خواص خاں اور مظفر خاں یہ دونوں حوصلہ کامرانی و حفظ سلطنت کا نہیں رکھتے تھے اور عبدالمحمد بارہ سال سے کاروبار امور ریاست کا کر کے واقف امور جہانبانی کا ہوا تھا۔ سیواجی بھونسلہ عبدالکریم بہلول خانی اور دوسرے امرا عبدالمحمد کے محکوم تھے۔ بادشاہ کو یہ منظور تھا کہ شہزادہ والا تبار کو سپرد اس کے کر کے معاملات بادشاہی اختیار میں اُس کے دیوے تاکہ خود زندہ ہی اس کو

مستقل کرے لیکن عبدالمحمد یوں تصور کیا تھا کہ سلطنت عادل شاہیہ کی اگر میں مختاری کروں تو عنقریب مارا جاؤں گا۔ اور ماں بھی اس کی مانع ہو کر قسم دی تھی کہ یہ کام اختیار مت کر اس لئے خوف سے جان کی اندیشہ مند تھا۔ ایک روز بادشاہ عبدالمحمد کو فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس مرض سے رہائی ممکن نہیں اور مغل نزدیک ہیں اور سیواجی دشمن قابو طلب ہے خدا جانے کے بعد از میرے کیا صورت ہوئے اور کس طور کا منصوبہ آگے آوے بہتر یہی ہے کہ روبرو میرے شاہزادہ کو سریر خلافت پر اجلاس کرکے سلطنت کی بندوبستی کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے اگر بادشاہی کی حفاظت کرتا گر بعد از میرے کسی کو تجھ سے مجال منازعت کا نہ ہے۔ عبدالمحمد یہ بات قبول نا کرکے عذر کیا دیانت راؤ اور کتنے خیر خواہان سلطنت بہت طور سے خاطر داری اس کی کرکے کہے کہ بادشاہ چاہتا ہے کہ شہزادے کو تیرے سپرد کرکے اپنے روبرو تجھکو مستقل کرے کچھ اندیشہ اپنے خاطر پر نہ لا اور اپنے کو اس کام سے بازمت رکھ کہ معاملہ برہم ہو جاوے گا۔ لیکن اس نے نہ مانا یہ بات خاطر پر بادشاہ کے نہایت گراں ہوئی لیکن اپنے حال میں حیران تھا کچھ چارہ نہیں چلا۔ اور عبدالمحمد کا اصل رویہ وال تھا بہت سے امور ریاست خلاف مصلحت کے کرتا تھا چنانچہ خود بخود اقرار کیا کہ خواص خاں شاہزادہ کو تخت خلافت پر اجلاس کرکے دارالخلافت میں انتظام امور سلطنت میں رہے۔ اور اپنے کو لشکر دیکر قلعہ شاہ درگ و گلبرگہ کی حفاظت پر رکھے۔ اور قلعہ مرج و پرنالہ جو عبدالکریم بہلول خاں کی تحویل تھا مغل کے مقابلہ پر چھوڑے۔ اور مظفر خاں بدنور کی جانب سیواجی کے منہ پر رہے۔ اور سب امرا خواص خاں کے حکم میں رہ کر جو کہ خواص خاں فرماوے بجالاوے۔ خواص خاں اس بات کو غنیمت جان کر قبول کیا اور آپس میں عہد و پیماں قسم کھا کر مضبوط کئے کہ بعد از بادشاہ کے دوسرے روز اپنے عہد کو وفا کرے۔ پھر رفتہ رفتہ مرض بادشاہ کا غالب ہوا اور قوئی جسمانی حرکت سے باز رہا اس وقت ہر کوئی اپنی تدبیر میں مصروف ہوے۔ چنانچہ دیانت راؤ خواص خاں سے موافقت کیا۔ اور دہرہاجی مظفر خاں سے آمیزش کرکے اس کی استحکامی میں سعی وافر کرتا تھا۔ لیکن عبدالمحمد و دیانت راؤ مظفر خاں کو قوت یکرنے نہیں دیتے تھے اور بادشاہ کو کچھ نوع سے سمجھا کر اس کو حضوری سے نکال کر موافق اقرار اس کے بدنور کو روانہ کئے۔ اس عرصے میں بادشاہ کی بیماری پھر عود کی دہرہاجی بادشاہ کو یاد دلا کر مظفر خاں کو یاد واڑہ سے واپس طلب کیا۔ اس نے لشکر اپنا یاد واڑہ میں چھوڑ کر شب اپنے کو حضور میں پہنچا کر بادشاہ کی خدمت عالی میں حاضر ہوا۔ اور خواص خاں جب جب معمول کے سپاہ لوگ ہمراہ اپنے لیکر آنا کرتا تھا۔ اس کو منع کیا کہ سپاہ لوگ ہمراہ نہ لے آوے اور تنہا آمد و رفت

رکھے اس لئے درمیان میں اس کے اور خواص خاں کے ناخوشی پیدا ہوئی۔ مظفر خاں ملک منور کے ہمراہ عبدالمحمد کو کچھ خفیہ کہلا بھیجا عبدالمحمد جواب دیا کہ خواص خاں عہدہ وزارت پر ہے اور باپ اس کا اس خدمت میں جان نثاری کیا ہے اب جو کہ خواص خاں مناسب جانے کرے تم اور ہم اس کے محکوم رہکر جو وہ فرمائے بجالے آویں مرزا یوسف خاں بادشاہ کے شروع بیماری سے دم آخرین تک یک لحظ خدمت سے جدا نہیں ہوا تھا اور ہر ایک نوع سے موافقت کرکے خیرخواہی میں خواص خاں کی تھا اور بادشاہ وفات پانیکے پندرہ روز آگے عالم بے ہوشی میں تھا۔ مرزا یوسف خاں دانائی اور آہستگی سے معاملات ملکی خواص خاں سے رجوع کرکے حکم پر اُس کے عمل کرتا تھا۔ جبکہ بادشاہ رحلت فرمانے کا وقت قریب پہنچا خواص خاں محلات بادشاہی میں آکر مرزا یوسف خاں کی صلاح و تدبیر سے ضبط و نسق دربار اور قلعہ کے اندر کا کیا اور علی عادل شاہ ثانی پانچ طاس کے وقت یکشنبہ کے روز تیرھویں تاریخ کو ماہ شعبان کے سنہ ۱۰۸۳ یکہزار ترپاسی ہجری مطابق سنہ ۱۶۷۲ سولہ سو بہتر عیسوی میں تخت تابوت کو تخت سلطنت پر اختیار کیا۔ قاضی نورالله۔ و شاہ ابراہیم و علی محب خاں و میر نعمت الله اور ملک مسعود اور علماء و فضلا تجہیز و تکفین کرکے شہر میں جو گنبد نیم کلہ کہ اسی کی تعمیر کی ہوئی تھی۔ اس میں مدفون کئے اور عمر اس کی پینتیس سال تھی اور سولہ برس سات مہینے سلطنت کیا تاریخ اس کی رحلت کی یہ ہے۔ قطعہ

بادشاہ دیں پناہ خسرو عادل علی	تخت نشیں جہاں گشت ز تخت جہاں
جان و دل جہاں ہمہ ناز آتش ہجر تن بسوخت	در دہن مردوزن شعلہ صفت شد زباں
سال وفاتش آولیس گفت ز الہام غیب	بادشاہ دیں علی کرد وطن در جناں
	۱۰۸۳

تنقیدیں

دیوان اُردو خواجہ میر درد مرتبہ مولوی عبدالباری صاحب آسی۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں۔

خواجہ میر درد اُردو کے شعرائے قدیم میں اپنی شاعری کی بعض خاص خصوصیات کی وجہ سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا آپ کے کلام کا ایک مجموعہ نظامی پریس بدایون نے مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی اجازت سے شائع کیا تھا۔ یہ دوسرا نسخہ جو نول کشور پریس کی طرف سے شائع ہوا ہے مولوی عبدالباری صاحب آسی لکھنؤ کا مرتبہ ہے۔ اس نسخہ میں مرتب کا بیان ہے کہ ایک قلمی اور ایک اچھے مطبوعہ نسخے سے تصحیح کی گئی ہے اور شروانی صاحب کے مرتبہ نسخے سے بھی جگہ جگہ مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ زیادہ معتبر اور صحیح ہے۔ ابتدا میں آسی صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے جو خواجہ میر درد کی لائف، اُن کے شاگردوں کے ذکر اور اُن کی شاعری پر تنقید کیا بلکہ تقریظ پر مشتمل ہے۔ شاعر کی لائف میں تو کوئی بات ایسی نہیں البتہ تنقید یا تقریظ والے حصہ میں آسی صاحب نے بہت سی ایسی باتیں لکھدی ہیں جو مشکل قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "میر صاحب یا میر حسن وغیرہ کے بیانات سے قطع نظر کرکے جب ایک بصیر اور نقاد میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو بیساختہ اس کی زبان سے یہ کلمات نکل جاتے ہیں کہ خواجہ میر درد کے برابر کوئی شاعر سرزمین ہند میں پیدا نہیں ہوا" ایک جگہ خواجہ میر درد کے ہاں قصائد نہ ہونے پر انہیں قصیدہ گوئی کا مرد میدان یا اس کا اہل نہ سمجھنے کو خطرناک غلطی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی کام کا نہ کرنا اس کے اہل نہ ہونے کی کسی طرح دلیل نہیں ہو سکتی"۔ سب اصناف شاعری میں بڑی اور مشکل چیز غزل ہے..... اس میں کمال ہونا دوسری چیزوں کو بالکل مکمل کر دیتا ہے۔ رباعی ہو یا قصیدہ، مثنوی ہو یا قطعہ، ایک ماہر فن غزل گو ان تمام اصناف میں تھوڑی سی توجہ اور استغراق سے بہت کچھ کر سکتا ہے"۔

ایسی ہی رایوں سے آسی صاحب کی تنقید تنقید نہیں رہی بلکہ سراسر تقریظ اور مبالغہ آمیز محاسن نگاری بن گئی ہے۔ نظامی پریس کے نسخہ کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ شاعر کی حیات اور اُس کے کلام کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے اور محاسن بیان کرنے میں جوش و شیفتگی کو زیادہ کام میں لایا گیا ہے۔ تاہم اصل کلام کے بخوبی ترتیب دینے اور صحت کی کوشش کے لحاظ سے یہ نسخہ بہت ہی قابل قدر ہے اور عام شائقین کلام و متعلمین ادب کیلئے جو نظامی پریس والے نسخہ کی غلطیوں کے شاکی تھے یہ نعم البدل ہے۔ نول کشور پریس کی مطبوعات کی طرح غالباً اس کی قیمت بھی بہت ہی کم ہوگی۔

دی ٹی چنک آف انگلش ان انڈین اسکولز از جناب کے۔ نارائن صاحب بی اے مدرس انگریزی

مدرسہ فوقانیہ میدک۔ قیمت ۱۲ ار۔

ہندوستانی مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم کس اصول پر دینی چاہیئے اور ہندوستانی طلبہ کو جو مشکلات انگریزی زبان کی تحصیل میں پیش آتی ہیں اُن کو دور کرنے کی کیا تدابیر کی جانی چاہئیں، یہ اس انگریزی کتاب کا موضوع ہے۔ مصنف نے جو ایک تجربہ کار مدرس ہیں اور برسوں سے مختلف مدارس میں انگریزی زبان سکھانے کا مشکل کام انجام دیا ہے۔ اور اب بھی دے رہے ہیں، اپنے تجربات تعلیمی کی بنا پر ایسی مفید تدبیریں اور تجویزیں اس کتاب میں بیان کی ہیں جن کے اختیار کرنے سے بہت بڑی حد تک تحصیل زبان انگریزی میں سہولت پیدا ہو سکتی ہے۔ وسطانی اور ثانوی اور فوقانی جماعتوں میں کن طریقوں کی ضرورت ہے ان پر جدا جدا بحث کی ہے۔

عام طور پر مدارس میں انگریزی سکھانے کے جو مروجہ طریقے رائج ہیں اُن کو پیش کر کے مصنف نے ان میں ایسی مفید اصلاحیں تجویز کی ہیں جو بہت سہولت سے طالب علم کو انگریزی پر عبور پیدا کرا سکتی ہیں اور موجودہ صورت میں جو کیفیت برسوں انگریزی پڑھنے کے بعد بھی بمشکل معلوم ہوتی ہے وہ اس کتاب کے مجوزہ طریقوں سے بہت ہی کم مدت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ مدارس میں انگریزی کی تعلیم دینے والے مدرسین اور عام شائقین جنہیں انگریزی کے درس و تدریس سے دلچسپی ہو ضرور اس کو مطالعہ کریں اور اس کے "راست اصول" پر عمل پیرا ہوں۔

دی انگلس اڈریس | از جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب مددگار۔ مدرسہ فوقانیہ میدک۔ حجم (۴۶) صفحات۔

یہ ایک انگریزی نظم ہے جس میں قرآنی تعلیم اور احادیث نبوی پیش کی گئی ہیں یہ نظم با وجود ایک ہندوستانی شاعر کے قلم کی ہونے کے زبان و بیان کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کو انگریزی زبان سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ نہایت سلاست اور صفائی سے اشعار میں اپنا مطلب ظاہر کر سکتے ہیں مسلسل کئی سو شعر ہیں لیکن ربط کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ایک ہندوستانی میں یہ خوبی قابل ستائش ہے۔ کتاب کی قیمت اور پتہ درج نہیں۔ شاید مصنف سے مل سکتی ہے۔

سیر گل | ضخامت تقطیع مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس قیمت ۹ عہ ملنے کا پتہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ یا "کاشانہ" الہ آباد

افسانہ نویسی، مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کا جس قدر قدیم فن ہے، اسی قدر یہ اردو کیلئے جدید۔ عجب قانون فطرت ہے کہ کل جو امور ایک قوم اپنے سے زیادہ شائستہ اقوام سے سیکھتی ہے، آج انہیں کو سبق سکھانے کے قابل ہو جاتی ہے۔ جس زمانے میں مغربی ممالک تمدن کے ابتدائی مدارج میں

تھے، بید پائے کے قصے دنیا کی ساری قوموں کے افسانوں کا ماخذ بنے ہوئے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قصہ گوئی (اور بعد میں قصہ نگاری) کے فن کو ہر قوم دوسری سے اکتساب کرتی ہے۔ بلکہ یہ ہر قوم کا اپنا فطری جذبہ ہے، خارجی چیزیں صرف نمونہ کا وجود رکھتی ہیں۔ عربی ادب ہندی قصوں سے متاثر ہوا، اور پھر خود عربوں نے اپنی نوبت پر بہت سے لازوال افسانوی کارنامے اطراف عالم میں بھیجے دئے۔ ان ہی میں "الف لیلہ" بھی ہے اس وقت مغربی اقوام نے جو تہذیب دنیا کا مطمح نظر بنی ہوئی ہیں، قصوں کو بھی ضروریات زمانہ کے مطابق ترقی دیکر اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ انہیں کے قصوں کا تتبع آج ساری علمی دنیا کر رہی ہے۔ اس تقلید میں درحقیقت اقوام عالم کے مذاق کا ایک نقطہ پر سمٹنے کا احساس نہاں ہے۔

چنانچہ ہم بھی اسی قانون فطرت کے ماتحت عمل کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی قدیم ہندی داستان گوئی ترک کر دی ہے اور مغربی خصوصاً انگریزی قصوں کی تقلید کر رہے ہیں۔ پہلے پہل تو ہم اپنی زبانوں میں اکثر مغربی قصوں کو بجنسہٖ منتقل کرتے رہے لیکن چونکہ یہ ہماری ادبیات کا جزو نہیں بن سکتے تھے، اس لئے ہم نے غیر شعوری طور پر اُن کے اتباع میں اپنے ذاتی اور ملکی و قومی قصے لکھنے شروع کئے۔

"سیر گل" بھی انہیں دو قسموں کے قصوں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ اس میں کل تیرہ قصے ہیں، جن میں سے چھ رہسی قصہ نگار انتوں چیخوف کے ترجمے ہیں، ایک، ایسان کے قصہ کا ترجمہ ہے اور باقی چھ مولوی جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے کے لکھے ہوئے ہیں۔

چیخوف کی قصہ نگاری کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا نہیں ہے کیونکہ یہ مترجمین کا مطمح نظر ہوں تو ہوں، لیکن اردو ادب اور خود ہندی قوم کا مطمح نظر نہیں بن سکتے۔ چیخوف مختصر قصے لکھتا ہے، مختصر قصے اور طویل ناول کا فرق صرف یہ ہے کہ اول الذکر میں صرف ایک واقعہ یا کسی خاص حالت، کیفیت، حیات کے کسی پہلو پر روشنی ڈالنی مقصود ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف طویل تفصیلی ناول کئی مختلف واقعات پر مبنی ہوتے ہیں، جو ایک واحد مقصد کی طرف رہبری کریں۔ چیخوف روزمرہ کے سادے سیدھے واقعات کو اپنے قصوں کا موضوع بناتا ہے اور اُن کو اپنے ذاتی رنگ میں رنگ کر پیش کرتا ہے۔ طرز تحریر میں بھی، وہ شگفتہ اور پر معنی ہے، الفاظ کے استعمال میں ایک تحسین کفایت شعاری کا پابند ہے۔ جس کی وجہ سے کم سے کم الفاظ میں ایک وسیع مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادبیات کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم قدوائی صاحب نے چیخوف کے قصوں کو بے تکلفی سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ اُردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں روسی خیالات اور اسلوب کی انفرادیت کا باقی رہ جانا ناگزیر بلکہ ایک حد تک مناسب ہے۔

مصنف کے طبعزاد قصوں کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغربی قصوں کے فن سے مانوس ہیں اور اسکے رموز سے استفادہ کرنے کی جا بجا کوشش کرتے ہیں۔ تمام طبعزاد قصے مغربی فن مختصر قصہ نگاری کی

مطابقت کرتے ہیں "دو آنسو" والے قصے میں ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان کی ٹھیٹ مشرقی فضا میں رہنے کے بعد جو کس مپرسی کی حالت ہو جاتی ہے، اس کا اچھا نقشہ کھینچا ہے جس کی خطر بھی تعلیم کے ساتھ بدل گئی ہو، لیکن جو مشرقی فضا میں چلنے پھرنے پر مجبور ہو۔ عام انسانوں کے خاص خاص نفسیاتی فرق کو بھی مصنف نے اکثر قصوں میں ملحوظ رکھا ہے "فریبِ خیال" میں ایک ناتجربہ کار کا بعض معاملات میں اپنے حسب خواہش نتائج نکالنے کی عادت کو ابتدا ہی میں ظاہر کیا ہے۔ بعض کوتاہ حوصلہ لوگوں کی ترقی کر لینے پر جو حالت ہو جاتی ہے، اور اپنے قدیم رفیقوں کے ساتھ ان کا جس قسم کا برتاؤ ہو جاتا ہے، اس کا ایک خاکہ "مایوسی" میں کھینچا ہے۔

اکثر ضمنی واقعات سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو اپنے خارجی حالات پر غائر نظر ڈالنے کی مشق ہے۔ اور وہ اُن سے ایسے نتیجے اخذ کر سکتا ہے، جو پڑھنے والوں کی ذہنی جد وجہد کے لئے ایک وسیع فضا مہیا کر دیتے ہیں۔ "زوالِ حسن" میں ایک جگہ مصنف اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے ــــ "دنیا ایک بڑا بازار ہے۔ جہاں سودے کی بکری ہوتی ہے، باہمی رواداری اور خلوص، کہنے کی باتیں ہیں" ــــ وغیرہ (صفحہ ۱۷۴) یہ خیال غور و فکر کا محتاج ہے۔

بعض قصوں میں چند ضمنی امور ایسے بھی ہیں، جن کی طرف مصنف کی توجہ زیادہ منعطف ہونی چاہیئے تھی "نقشِ موہوم" میں مصنف نے مایوس محبت کی تصویر کھینچی ہے۔ اس میں قصے کے دو مختلف عنصر ہو گئے ہیں، ایک قاسم کی داستانِ محبت، دوسرا قاسم کی ایک عزیز کمسن لڑکی تمیز اور خود مصنف (مصنف اس میں ایک شخص قصہ ہے) کا تعلق۔ دو مختلف واقعات کا اشتمال قصے میں نامناسب نہیں۔ لیکن ان میں ایک واقعہ دوسرے کا تابع ہو، اور دوسرا مرکزی واقعہ کے ارتقا کا معاون۔ "نقشِ موہوم" کے دونو واقعات علٰحدہ ہیں۔ ان میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ کسی قسم کا ربط عضوی نہیں۔ نیز قصہ نگار اور تمیز کے تعلقات ایسے ناقابلِ اعتماد ہیں کہ کہیں ان پر جوان الفتی کا دھوکہ ہوتا ہے، اور کہیں معصوم انست کا باوجود تمیز کی شائستگی اور پختہ نمائی کے یہ مسلم ہے کہ اس کی عمر نو دس سال کی تھی پھر مصنف کو اس کے ساتھ ملنے میں ایسا تکلف نہ ہونا چاہیے تھا، جو محض ایک نوجوان جوڑ کے شایان ہے

امید ہے کہ مصنف کی کوششیں جاری رہیں تو اُن کے کارناموں سے اُردو افسانوی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہو سکے گا۔ ہر زبان کو اپنے ابتدائی دورِ نشو نما میں ہمیشہ اور اُس کے بعد بھی کبھی کبھی دوسری زبانوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ ترجمہ کئے ہوئے خیالات سے اُس کے مختلف شعبوں میں

اضافہ ہوتا ہے اور جیسے ہم نے ابھی ابھی کسی مقام پر لکھا ہے، کہ ادبیات میں جب تک "مقامی رنگ" قومی اور ملکی خصوصیات داخل نہ ہو جائیں، وہ ایک اجنبی شئے رہیگی اس لئے جہاں چند قصہ نگار ترجموں کا کام کر رہے ہیں، دوسروں کو چاہئے کہ وہ مغربی قصوں کو اپنانے کا کام انجام دیں

مخزن نکات صفحات ۱۰۵ تقطیع $\frac{۲۴ \times ۳۶}{۱۶}$ قیمت فی جلد عہ سکہ انگریزی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن۔

"مخزن نکات" اردو کے اولین تذکروں میں سے ہے۔ یہ میر اور گردیزی کے تذکروں کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس کے مصنف قیام الدین قائم چاندپوری ہیں۔ جو اردو کے شاعر اور میر اور سودا کے معاصر اور آخرالذکر کے شاگرد بھی تھے۔ یہ تذکرہ اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اس کو فراہم کر کے، مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے معتمد انجمن کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

تذکرہ نویسی اردو اور فارسی ادبیات کا ایک اہم جزو ہے۔ تاریخ اور شاعری کے ساتھ ساتھ تذکرہ نویسی بھی نشو و نما پاتی رہی تذکرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو مشاہیر کے تذکرے۔ دوسرے شعرا کے تذکرے ان میں سے پہلی قسم کے تذکرے تاریخ اور دوسری قسم کے تاریخ ادبیات کے قائم مقام ہیں۔ تذکرہ شعرا کی ابتدا درحقیقت ان بیاضوں سے ہوتی ہے، جو شعرا یا اصحاب ذوق زمانہ قدیم میں اپنی یادداشت کے طور پر لکھکر رکھا کرتے تھے۔ ان ہی میں کبھی کبھی ان شعرا کا حال بھی ہوتا تھا، جن کا کلام انتخاب کیا جاتا۔ بعض وقت تذکرہ نویسوں نے شعرا کے متعلق اپنی رائیں بھی ظاہر کی ہیں۔ گویا اس طرح تذکرہ شعرا کی اہمیت کے دو پہلو ہو جاتے ہیں ایک طرف تو وہ تاریخ ادبیات کے بیشتر مواد کے حامل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، وہ تنقید کی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔

"مخزن نکات" قدیم شعرا کا ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر شمالی ہند کے تذکروں کے برخلاف، اس میں دکھنی ریختہ گویوں کے حالات اور کلام کے اندراج کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ تقریباً ایک سو شاعروں کا حال اس میں درج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام مشرقی ادیبوں خصوصاً تذکرہ نویسوں کا اسراف الفاظ اور اس میں بھی پایا جاتا ہے۔ تاہم بعض مشہور شعرا مثلاً میر تقی میر، سودا، سوز، درد وغیرہ کے متعلق قائم کی رائے قابل توجہ ہے۔ جن میں اکثروں کے ساتھ مصنف کو ذاتی تعلق رہ چکا ہے۔

تذکرہ بعض ایسے واقعات سے بھی پاک نہیں ہے، جو قدیم زمانے میں مسلمات سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب جدید تحقیقات کی رو سے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ مثلاً سعدی شیرازی کو سعدی ہندی کے ساتھ خلط ملط کر کے، اس کا ذکر پہلے اردو شاعر کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ولی کو گجرات کا متوطن سمجھا اور

اس کی شاعری کی ابتدا دہلی میں پہنچنے کے بعد سے شمار کی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے کے مقدمہ سے تذکرہ کے متن اور قائم کی حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ تذکرہ کی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض امور پر جدید معلومات کی رہبری میں تنقید بھی کی گئی ہے جس سے تذکرے کے بعض غلط اندراجات کی تصحیح ہوجاتی ہے۔

یہ کام انجمن ترقی اردو کے مفید کارناموں میں سے ہے۔ اردو زبان کا قدیم مواد فی الوقت زیادہ تر اسی قسم کے تذکروں میں مدفون ہے۔ اس لئے قدیم شعرا سے متعلق جس قدر تذکرے شائع ہوتے جائیں، اس سے اردو لٹریچر میں سہولتیں پیدا ہوتی جائیں گی۔

تذکرۃ النواتین | مرتبہ مولوی عبدالباری صاحب آسی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو قیمت درج نہیں۔

یہ سوسے زاید اُردو فارسی شاعر خواتین کا تذکرہ ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی نے جگہ جگہ سے شاعر عورتوں کے حالات اور نمونہ کلام فراہم کرکے ردیف وار اس تذکرہ کو ترتیب دیا ہے۔ ابتدا میں (۷) صفحات کا مقدمہ یا دیباچہ ہے جس میں مولف نے عورتوں کی شاعری پر دلچسپ بحث کی ہے اور اُن کے محاسن شاعری گنائے ہیں۔

پہلا حصہ جو (۱۸۰) صفحوں پر ختم ہوتا ہے صرف اُردو گو شاعرات کے لئے وقف ہیں۔ باقی میں فارسی گو خواتین کا ذکر ہے۔ جیسا کہ مولف نے بتایا ہے۔ شعر گوئی ایک وہبی فن اور عطیہ قدرت ہے اور ہر قوم اور ہر فرقہ کے آدمی اس کے حامل ہیں۔ چنانچہ اس تذکرہ کے متعدد شاعر۔ خواتین بلحاظ پیشہ طوائف ہیں۔ مولف اُن کے بیان میں مجبور ہے لیکن ایسی عورتوں کے نام کے آگے (ط) کی علامت لگادی ہے۔ اس تذکرہ سے شاعر عورتوں کی نسبت اچھی معلومات ایک جگہ جمع ہوگئی۔ مؤلف کی سعی قابل قدر افزائی ہے۔ فارسی کے نمونہ کلام کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے جس سے کم استطاعت قارئین آسانی سے اشعار کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔

"س"، "ہ"

ہندوستان بھر کا واحد تعلیمی ہفتہ وار

اخبار تعلیم لاہور

یہ بات مسلمہ ہے کہ کسی ملک کی زندگی اور موت کا انحصار محض اس کی تعلیم پر ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک کی تعلیمی حالت نہایت گری ہوئی ہے۔ چنانچہ تعلیم سے بے اعتنائی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ملک بھر میں اخبار ہذا کے اجراء سے پہلے کوئی بھی خالص تعلیمی اخبار نہ تھا پس یہ ہفتہ وار اخبار ۱۹۲۳ء سے محض تعلیمی معاملات پر بحث اور رائے زنی کرنے اشاعت تعلیم کی تجاویز سوچنے۔ سررشتہ تعلیم کے جملہ اہلکاران اور بالخصوص کم مشاہرہ مدرسین کی زبردست وکالت اور ترجمانی کرنے اور ہر قسم کے علمی۔ علمی اور اخلاقی مضامین اور نیز تازہ بتازہ معلومات اور خبروں کے شائع کرنے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اور اس اخبار میں چار صفحات رفیق الاطفال کے نام سے علیحدہ کاغذ پر موٹے خط سے چھوٹے بچوں کے لئے بھی چھاپے جاتے ہیں۔ جو بچوں کے ہاتھوں میں علیحدہ کے علیحدہ دیئے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں رفیق نسواں کے عنوان سے دو صفحے لڑکیوں اور عورتوں کے لئے ہوتے ہیں۔ الغرض یہ اخبار تعلیمی خبروں اور مضامین کی اشاعت کے علاوہ ہر قسم کی دلچسپیوں کا بینظیر مجموعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار نہایت مقبول ہوا ہے۔ اور سرکاری اور غیر سرکاری طور پر بکثرت سکولوں میں بہم پہنچایا گیا ہے چنانچہ اسوقت ہندوستان بھر کے قریباً سب اردو ہفتہ وار اخباروں سے زیادہ چھپتا ہے۔ پس ہر مدرس طالبعلم اور ہر خواہ ملک و قوم کو اس کا خریدار بنکر خود مستفید ہونے کے علاوہ اپنے ملک و قوم کو بھی بام عروج پر پہنچانا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب ہیں اور اپنی سب خوبیوں کے باوجود قیمت سالانہ صرف (بے) ششماہی ۳ اور سہ ماہی عہ روپے لی جاتی ہے۔ نمونہ مفت ارسال ہوتا ہے۔ اس اخبار کو ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم ریاست حیدرآباد دکن نے اپنی چٹھی نمبر ۱۹۹ مورخہ ۱۳ ڈسمبر ۱۹۲۳ء کے ذریعہ تمام مدارس تمتانیہ سلطانیہ اور فوقانیہ کے لئے منظور کیا ہے۔ اور اسے اکثر مہتمم صاحبان تعلیمات اور صدر مدرسین صاحبان سرکاری روپیہ سے اپنے اپنے مدارس کے لئے خرید رہے ہیں۔

المشتہر منیجر اخبار تعلیم۔ لاہور۔ مومنپورہ

زندہ طلسمات

جسکو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے جسکے فیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اُس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ پیلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ متلی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ۔ بچھو کے زہر اور ہر قسم کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائے ایک بار ضرور آزمائیے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے شیشی نمبر (۱) ۸ آنہ نمبر (۲) ۱۲ آنہ نمبر (۳) ۱ روپیہ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ دی پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزاء سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اسکو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے۔ اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے علی الخصوص نقرس و جوڑ مفاصل دمہ۔ دردسر۔ دردسول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرماویں بخوشی تعمیل کیجائیگی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور نسخجات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشہ جیمل اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگذاری حیدرآباد دکن تلفون

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو مرتبہ مولوی محمد نصیر الدین ہاشمی صاحب فاضل جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی دورِ آصف شاہی اور دورِ حاضر میں اُردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اُردو کا تذکرہ سو سے زائد صفحات۔ ۲۴ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۲ کاغذ چکنا بار دوم قیمت کما

بیانِ اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشاء پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۲ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد صرف ۱۲ کما

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابو احسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے فن تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۲ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہلِ قلم کی فلکاریوں پر تنقید کر کے اصولوں کا استعمال دکھایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشاء پردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۱۲ کاغذ چکنا لکھائی عمدہ مجلد سادہ ۲ر

اُردو کے اسالیبِ بیان مصنفہ زور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آجتک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و انداز بیان کا مذکرہ۔ خاص طرزِ تحریر کے اُردو انشاء پردازوں کے اسالیبِ بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ ۲ر

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارناموں پر تبصرہ۔ تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا کے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و سلیقہ پر اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۱۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی سید حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے یس راپورٹ پی ایچ ڈی کی پراثر تعریف علامتی ماخذ اجمالہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

ارباب نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب فاروقی ایم اے۔ فرسٹ ولیم کالج کے اُردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب بشیر حسین اسٹنٹ ڈی ایس آر، آئی، ایس ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مستقل تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے۔ سائز ۲۰×۱۲ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۲ر

جواہر کلیات نظیر مرتبہ جناب مولانا ذہین دسید مختار احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے انتخابی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد اسلام مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شاہ احمد شعار ہاشمی۔ اردو کے قدیم پرانے دکھنیات کا لغت میں ہیں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

حزینہ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت ﷺ کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بد خو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو مکرمہ ناظر داری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لنتھو گرو منیجر مطبع

مجلۂ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی

مجلۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴- قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ) فی پرچہ ۶ پائی

۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (ص) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعاتِ مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کر دیا جائیگا۔ یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان پریس سرکار آصفیہ (۶۵) رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار انگلشیہ (.....)

مجلہ مکتبہ

جلد (۳) بابتہ ماہ شہریور سنہ ۱۳۳۸ فصلی جولائی سنہ ۱۹۲۹ء شمارہ (۴)

تصاویر

(۱) ڈاکٹر سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی

(۲) ابن نشاطی

فہرست

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات	از مدیر	۲
سلطان علاء الدین حسن بہمنی	" جناب محمد احمد صاحب انصاری بی اے، ایل ایل بی	۵
رباعی	" " مودود احمد صاحب تشنہ	۲۳
ترانۂ ناظم (نظم)	" نواب میر محمد علیخاں بہادر ناظم	۲۴
غزل	" افگر حیدرآبادی	۲۵
مرزا غالب کا فارسی کلام	" " مودود احمد صاحب تشنہ	۲۶
خان بہادر (افسانہ)	" ڈاکٹر محمد اعظم صاحب کریوی	۳۳
غزل	" صفی اورنگ آبادی	۳۷
عرب اور ان کے میلے	" ابو الکارم محمد عبد الکریم صاحب نعمانی	۳۸
خواجہ محمود گاواں کے مزار پر فرقت کے دو پھول (نظم)	" محمد حسین صاحب ادیب ایم اے بی ای ڈی	۴۹
ایک نوزائیدہ کی موت	" سید علی صاحب نظام کالج	۵۳
بادۂ دکن (سخن اورنگ آبادی)	" عمر یفغی صاحب	۵۵
جوش انتقام (افسانہ)	" سید شبیر حسن صاحب قیس	۶۴
ابن نشاطی	" ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری ندیم ایم اے پی ایچ ڈی	۶۹
تنقید و تبصرہ	س، م	۷۲

شذرات

پچھلے مہینے کی آخری تاریخوں میں اساتذہ حیدرآباد کی تیسری سالانہ کانفرنس سررشتہ تعلیمات کے فاضل ناظم مولوی خان فضل محمد خان صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوئی یوں تو آج کل کی کانفرنس بازی مرض متعدی کی طرح عام ہوگئی ہے اور ہر ملت اور پیشہ کے لوگ کانفرنسیں منعقد کرتے رہتے ہیں لیکن اس سے قطعی انکار نہیں ہوسکتا کہ اساتذہ کے معزز گروہ کا ایسا سالانہ اجتماع اور باہمی تبادلہ خیالات کا موقع مفید ثمرات مترتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فاضل صدر نے اپنے خطبہ کی بنیاد ادبی نزاکتوں اور فلسفیانہ بلند خیالیوں کی بجائے عمل اور صرف عمل پر رکھ کر اساتذہ کو وہ تجربہ کارانہ نصائح کی ہیں اور ایسی ہدایات عمل دی ہیں کہ اگر عہدہ داران سررشتہ و اساتذہ ان کی طرف خاطر خواہ توجہ کریں تو یقیناً ہمارے سررشتہ تعلیمات کا مستقبل نہایت شاندار ہوجائیگا۔

یہ واقعہ ہے کہ ہمارے مدارس میں ذہنی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے اور عام رجحان یہی ہے کہ جہاں تک بن پڑے اس میں کوتاہی نہ کی جائے۔ یہ بجائے خود کتنا ہی لائق ستائش کیوں نہ ہو لیکن جیسا کہ فاضل صدر نے اپنے خطبے میں بتایا ہے جسمانی تربیت اور کردار سازی کی طرف سے بے توجہی روا رکھتے ہوئے محض ذہن کی نشوونما اور پالش میں ساری قوت صرف کردینا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس فروگذاشت نے ہماری ذہنی تعلیم کی متوقعہ افادیت میں بڑی کمی کردی ہے اور اب تو یہ نقص ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے۔

ہمارے نظام تعلیم کا ایک اور بڑا نقص صنعت و حرفت اور دست کاری کا نصاب تعلیم میں فقدان ہے جو روز افزوں بیروزگاری کے مدنظر فوری اور کافی توجہ کا مستحق ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کانفرنس کے فاضل صدر جو سررشتہ تعلیمات کے تجربہ کار افسر اعلیٰ ہیں اس کے خوفناک عواقب و نتائج سے بخوبی واقف ہوں گے۔ موجودہ ذہنی تعلیم بجائے خود نہایت مفید ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ محض ذہنی تعلیم سے ملک کی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں۔ صرف اس تعلیم کو پاکر توقع نہیں کی جاسکتی کہ آئندہ نسلیں پرامن شہریوں اور خوشحال و شاد کام رعایا کی حیثیت سے زندگی بسر کریں گی اور اپنے ملک کی خوشحالی میں حصہ لے سکیں گی۔

موجودہ ذہنی تعلیم کا لازمی اقتضا ہے اور جب تک ہمارے نظام تعلیم میں تبدیلی نہ ہوگی یہی

ہو گا کہ تعلیم یافتہ سرکاری ملازمتوں کی طرف مائل ہو گئے۔ ہم موجودہ ذہنی تعلیم سے جس کو تعلیم یافتوں کی روز افزوں بے روزگاری اور بے کاری کو دیکھتے ہوئے مجبوراً ناقص کہا جاتا ہے۔ اور جس کی بدولت تعلیم یافتہ سوائے چاکری کے کسی اور مصرف کے بن نہیں سکے۔ کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ آزاد پیشوں اور حرفت و زراعت کے میلانات پیدا کرے گی۔ ہمارا نظام تعلیم کیا شہری مدارس، کیا دیہاتی مدارس اور کیا نسوانی مدارس سب جگہ یکساں ہے۔ تجربات یہ بتا رہے ہیں کہ اس نظام تعلیم کی وجہ سے زراعت پیشہ اور تاجر کی اولاد بھی تعلیم کے ساتھ ہی اپنے آبائی پیشوں سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ اور ملازمت ہی کو بالطبع پسند کر رہی ہے۔

اس خرابی کا اندفاع جیسا کہ فاضل صدر نے اپنے خطبہ میں اشارہ کیا ہے شہری مدارس میں حرفتی تعلیم کے رواج اور نفاذ پر منحصر ہے۔ نیز دیہاتی مدارس میں صرف زراعت یا دیہاتی معلومات کی چند سرسری کتابوں کے بجائے ایسا مخصوص نصاب ہونا چاہیئے جو ان مدارس کے طلبہ میں زراعت سے کسی قسم کی برگشتگی و بیزاری پیدا ہونے نہ دے اور یہ طلبہ اپنا نصاب ختم کرتے ہی ملازمت کو ایک آنکھ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا کئے بغیر پورے ذوق و شوق سے زراعت میں لگ جائیں

اسی طرح زنانہ مدارس میں معاشیات خانہ داری کی جو اس وقت برائے نام سے زیادہ نہیں، وسیع رواج اور فروغ کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر اس کے جس طرح تعلیم یافتہ ملازمت کے لئے در در حیران و پریشان ہیں، تعلیم یافتہ عورتیں بھی اپنے فرائض و وظائف کی ادائی سے متنفر ہو کر ملازمت ہی کی خواہاں ہوں گی۔ اگرچہ ابھی ہمارے ملک میں خواتین میں بے روزگاری نہیں پائی جاتی لیکن دیکھ لیجئے میسور ہی میں جہاں تعلیم نسواں نے کافی ترقی کی ہے اس کی واضح اور بین مثال موجود ہے۔ چند روز پہلے خواتین کے ایک وفد نے دیوان ریاست کے ہاں باریاب ہو کر ان کی کہ انہیں بھی ملازمتیں دی جائیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم ٹرکس کے تجربات اور قریب کی مثال سے فائدہ اٹھا کر اپنے زنانہ نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلی کر دیں کہ مدارس کی لڑکیاں بجائے بہتر کلرکی ملازم بننے کے بہتر اور قابل مائیں بننے لگیں اور ملک کی آئندہ نسلیں ان تعلیم یافتہ ماؤں کی گودوں میں پل کر حقیقی معنوں میں ترقی یافتہ و شائستہ انسان بن سکیں۔

جامعہ عثمانیہ کے جو طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ روانہ کئے گئے ہیں ان کی خاندار کامیابیوں نے ہماری ملکی جامعہ کا مستقبل نہایت خوش آئند بنا دیا ہے اور یہ حقیقت روز بروز زیادہ مدلل طریقہ پر ثابت ہوتی جا رہی ہے کہ اردو نہایت کامیابی کے ساتھ ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے اور ہندوستان

کے تابناک مستقبل کے خواب کی اگر کوئی تعبیر ہو سکتی ہے تو یہی جامعہ عثمانیہ ہے۔ اس مہینے جامعہ کے دو ہونہار سپوتوں کی یورپ میں امتیاز و اعزاز کے ساتھ کامیابی نے اس حقیقت کے اثبات کی ایک اور دلیل پیدا کر دی مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ایم، اے نے انجنیری کا امتحان بی ایس سی جامعہ مانچسٹر سے بدرجہ اعلیٰ پاس کیا اور مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم، اے نے آریائی لسانیات و صوتیات میں جامعہ لندن کے فقید العصر اساتذہ کے زیر تربیت پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ دونوں امتحان اس قدر مشکل ہیں کہ شاذ ہی ہندوستانی طلبہ نے اس اعزاز کے ساتھ انہیں کامیاب کیا ہو۔

ہمارے ان دونوں احباب نے میٹرک سے لے کر ایم، اے تک جامعہ عثمانیہ ہی میں تعلیم پائی اور ان کے ذہنی نشوونما اور شاندار کامیابیوں کا سہرا سراسر جامعہ عثمانیہ کے سر ہے۔

اس نمبر میں ایک تصویر ابن نشاطی قطب شاہی عہد کے مشہور شاعر کی شائع کی جا رہی ہے۔ یہ بالکل کمیاب اور نادر الوجود ہے۔ ہمارے مکرم مولوی زور صاحب نے جن کا اس اشاعت میں ایک مضمون "ابن نشاطی اور پھول بن" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے، برٹش میوزیم کے ایک مخطوطے سے برآمد کر کے خاص مجلۂ مکتبہ کے لئے عنایت کی ہے۔ دوسری تصویر صاحب مضمون کی ہے جو بار بار کے تقاضہ کے بعد عنایت ہوئی ہے۔

تعطیلات سے فائدہ اٹھا کر مولوی زور صاحب جو پہلے جرمنی وغیرہ کی سیاحت کا ارادہ کر چکے تھے، اپنے والد محترم کے یاد کرنے اور بلوانے پر حیدرآباد تشریف لائے ہیں۔ آپ لسانیات میں ڈی لٹ یا دوسری ایس سی کی ڈگری کیلئے ختم تعطیلات پر پھر یورپ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سلطان علاء الدین حسن بہمنی

از

مولوی محمد احمد صاحب انصاری۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی

ذیل کا فاضلانہ مقالہ ہمارے مکرم و دوست انصاری صاحب کا وہ اہم مضمون ہے جو جامعہ عثمانیہ کی بزم تاریخ میں ممتاز مدرسین اور طلبائے تاریخ کے آگے پڑھا گیا اور جو بے حد مقبول ہوا۔ مضمون کافی طویل ہے۔ اس کی پہلی قسط اس نمبر میں پیش کیجاتی ہے آئندہ ماہ میں اس کا دوسرا حصہ شائع کرکے مضمون کو مکمل کردیا جائیگا۔ (مکتبہ)

تمہید "سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کی شخصیت اپنے زمانہ کی پیداوار تھی"۔ وہ اُس زمانہ میں پیدا ہوا جبکہ اوقات اُس کے منتظر تھے اور اُس کی ضرورت دنیا میں محسوس کیجارہی تھی۔ جس ملک کو اور جس زمانہ کو اسکی شخصیت کی حاجت تھی۔ اسی ملک میں اور اسی زمانہ میں اُس نے نہایت سنجیدگی اور سنجیدگی سے اپنے مفوضہ فرض کو ادا کیا اور تاریخ عالم کے اسٹیج پر جو حصہ اس کے سپرد کیا گیا تھا نہایت ہی جرأت اور بیباکی سے اس کو پورا کیا بعض مورخین کا زمانہ حال تک یہ خیال تھا کہ بہمنی سلطنت ایک بلائے ناگہانی کی طرح اچانک عالم وجود میں آگئی اور چوروں کی طرح کچھ دنوں تک دنیا میں لوٹ مار مچا کر چل بسی بعض مورخ لکھتے ہیں کہ بہمنی خاندان کی تاریخ ایک دکھی پھیکی داستان ہے جس کو تاریخ عالم سے کوئی سروکار نہیں۔

لیکن یہ دونوں خیال سراسر غلط ہیں اگر مورخین اپنے بعض تعصبات مذہبی و قومی کو کچھ دیر کے لئے اپنے پیش نظر نہ رکھکر تاریخ کا ان توتوں کی روشنی میں مطالعہ کریں جو انسان کی زندگی اور اس کے افعال و احساسات کو متحرک کرتی ہیں اور اس کے افعال اور زندگی پر حاوی ہیں تو ظاہر ہو جائے گا کہ دنیا کا کوئی واقعہ جو حیات انسانی سے متعلق ہو بذات خود اکیلا نہیں ہوسکتا۔ اس قسم کے جتنے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ اپنے واقعات ماسبق سے بطور نتیجہ کے برآمد ہوتے ہیں اور ان دونوں میں علت و معلول کا تعلق ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک واقعہ کو دنیا کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق نہیں ہے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ کیونکہ تاریخی واقعات سے مراد وہ واقعات ہیں جو انسانی

معاشرہ میں بحیثیت مجموعی ظاہر ہوتے ہیں اور انسان کے باہمی تعلقات سے مترتب ہو کر انسانی معاشرہ کو متاثر کرتے ہیں۔

یہ واقعات انسانی زندگی میں ہر لمحہ پیدا ہوتے اور اُن کے اثرات ایک دوسرے پر پڑتے رہتے ہیں اور پھر یہی موجودہ واقعات اپنے بعد آنے والے واقعات کی علت یا وجہ ہوتے ہیں۔

گو بنی نوع انسان میں رنگ قوم مذہب و زبان وغیرہ کے لحاظ سے ظاہراً بہت فرق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل انسان کا دماغ اور انسان کی نشو و نما اور اُس کی فطرت ہر جگہ اور ہر وقت ایک ہی رہی ہے۔ ظاہری اور مصنوعی اختلافات جس کی وجہ سے ہم خاص حصوں میں بسنے والے لوگوں کو خاص ناموں سے موسوم کرتے ہیں یا خاص خیالات رکھنے کی وجہ سے اُن کو خاص فرقوں یا گروہ میں تقسیم کر دیتے ہیں اُس کی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔

ایک گورے رنگ کا انسان یا عیسائی مذہب کا پیرو ایسا ہی انسان ہے جیسا کہ ایک کالے رنگ کا آدمی یا زرد رنگ رکھنے والا چینی اور بدھ مت کا پیرو انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ اگر انسان کی جسمانی حالت میں کوئی ارتقا ہو تو اس سے گورے، کالے، عیسائی، مسلمان سب متاثر ہوں گے اور اب تک جو کچھ ارتقا اُس کی جسمانی حالت میں ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ موجودہ گروہ انسانی پوری طرح متاثر ہے۔ ممکن ہے کہ زیادہ مہذب اور گورے رنگ والا انسان اپنی حیرت انگیز ایجادوں کل اور برق کے استعمال کی وجہ سے اپنے جسمانی نشو و نما میں نمایاں ترقی کرے اور یہ بھی ممکن ہو کہ اس کے ہاتھ پیر بیکار ہو کر جھڑ پڑیں لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اُس سے کالے رنگ والے متاثر نہ ہوں گے کم از کم موجودہ زمانہ کی رفتار اور اُس کے حالات پر غور کرنے کے بعد ہم یہ نہایت سہولت سے تصور کر سکتے ہیں کہ اگر گورے رنگ والے ہم سے کچھ پیشتر بیکار ہو جائیں گے تو اُن کے بعد پھر ہماری باری ہے۔ اگر برق اور کل کی قوت سے آج یورپ خدائی کر رہا ہے تو ہندوستان یا دکن یا آفریقہ ان چیزوں سے بالکل ناواقف نہیں ہے اور نہ اُن کو نہایت ہی لاپروائی سے دیکھ رہا ہے۔

اسی طرح اُس کی فطرت اور دماغی حالت یکساں واقع ہوئی ہے۔ یعنی اگر کوئی انسان اُس کی قابلیت رکھتا ہے کہ ہوائی جہاز یا لاسلکی پیام رسانی والا سکی مصوری کا موجد بنے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے انسان کا دماغ سرے سے اُس کی قابلیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ہر ایک انسان کا دماغ اتنی ہی قابلیت اور قوت رکھتا

ہے جتنا دوسرے انسان کا۔ اگر کوئی خاص شخص کسی چیز کا موجد ہے اور دوسرا نہیں ہے تو یہ اس کے دماغ کی فطرتی اور پیدائشی قابلیت کا قصور نہیں بلکہ بیرونی اثرات کی وجہ ہے۔ ایک شخص اپنے دماغ کی قوت کو ترقی دیتا ہے اور دوسرا اس کو زائل کر دیتا ہے یا اس کا استعمال نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے انسانوں میں فرق پیدا ہوتا ہے لیکن یہ فرق ظاہری اور مصنوعی ہے اگر بیرونی اثر اور ماحول کی وجہ سے کسی شخص کا دماغ کوئی کام نہیں کرتا تو اس کو انسان کے دماغ کی قابلیت یا ناقابلیت پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی دوسری وجوہات ہیں جن کو ہم طوالت کے خیال اور غیر متعلق ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

جب ہم یہ نظریہ قائم کر چکے کہ انسان کی طبیعت اور اس کی فطرتاً دماغی حالت ایک سی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ترقی اور تنزل ایک سا ہونا چاہئے۔ انسان کی زندگی ایکساں ہی ہے۔ اور جو فرق نظر آتا ہے وہ مصنوعی ہے۔ یہاں جو اصول کام کرتا ہے وہ "وقت اور مقام" کا فرق ہے۔

مثلاً اہل انگلستان نہایت ترقی یافتہ اور بہت مہذب ہیں اور اس کے برخلاف افریقہ کے صحرائی وحشی اور انتہا درجہ کے غیر مہذب ہیں تو یہ فرق اُن کی فطرت کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ انگلستان اور افریقہ کے صحرا میں مقام اور وقت کا جو فرق ہے وہ اس کا باعث ہے۔ یعنے ایک واقعہ ایک خاص وقت میں ایک خاص جگہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کا اثر اس مقام پر اسی وقت ہو جاتا ہے اور پھر وہ دوسرے مقام کو حالات اور دوسرے موجودہ واقعات کو متاثر کرتا ہے۔ اور اس کے لئے مدت کی ضرورت ہے۔ جیسے سمندر کے کسی حصہ میں طوفانی ہوائیں ظاہر ہوتی ہیں تو اس وقت اسی حصہ متاثر ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہاں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بڑی بڑی موجیں اُٹھنے لگتی ہیں۔ پھر وہ ہوائیں وہاں سے گزر کر دوسرے حصہ پر وارد ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ امواج کے تھپیڑے اپنے قریب کے پانی کو متحرک کرتے ہیں اور اسی طرح ایک سلسلۂ علت و معلول کا قائم ہو جاتا ہے۔ مگر پورا سمندر ایک ہی وقت میں طوفانی حالت میں نہیں رہتا بلکہ ہر حصہ کی طوفانی حالت میں وقت اور مقام کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح خاص وجوہات کے تحت انگلستان اگر انتہائی ترقی پر ہے تو افریقہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ عالمگیر واقعات مثل طوفانی ہواؤں کے ہر حصہ دنیا کو متاثر کر رہے ہیں اور کرینگے دوسرے خود وہی واقعات

ایک خاص مقام میں ظاہر ہو جاتے ہیں تو پھر وہ امواج کی طرح آس پاس کے علاقوں پر اپنے اثرات ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے اگر زمانہ گذشتہ میں صدیاں درکار تھیں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں سال اور ماہ کا فرق رہ گیا ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل اس سے زیادہ خوش آئند ہو اور صرف منٹوں اور لمحوں کا فرق رہ جائے لیکن یہ فرق مٹ نہیں سکتا۔ وقت اور مقام کا فرق ایک مسلمہ اصول ہے جو ہمیشہ رہیگا۔

دوسرا اصول خود نظریہ ارتقاء کا ہے جو اسی طرح انسان کے مترتبہ افعال میں متحرک ہے۔ جس طرح اس کے جسم کی نشوونما میں اس کے روحانی اور وجدانی تخیلات میں اور دوسرے طبعی مظاہر و موجودات خارجہ میں ظاہر ہے۔ موجودہ زمانہ میں علم تاریخ نے جو اس نظریہ کے تحت ترقی کی ہے اور جو روشنی تاریخی واقعات کے سمجھنے میں اس کی وجہ سے پڑی ہے وہ حیرتناک ہے۔ اب ہم اسکندر اعظم کی فتح ہندیا رومی سلطنت کا جمہوریہ سے شہنشاہی میں بدل جانے کو کوئی عجیب وغریب واقعات جو کسی درخت خودرو کی طرح پیدا ہو گئے ہوں نہیں سمجھتے اور موجودہ زمانہ کی اعلیٰ ترین ترقی کو کوئی اعجوبۂ روزگار واقعہ نہیں تصور کرتے بلکہ ہم تاریخ میں ایک تسلسل اور تدریجی ترقی اور اس کے ہر واقعہ میں علت و معلول کا تعلق پاتے ہیں ہر واقعہ اس کے پیشتر کے واقعات سے بطور نتیجہ پیدا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس انکشاف سے ہم نہ صرف صحیح تاریخی نتائج نکالنے کے قابل ہو گئے ہیں بلکہ موجودہ طرز روش کو اس کی روشنی میں منظم کرنے کے لائق بن گئے ہیں تاکہ زمانہ مستقبل میں اچھے نتائج برآمد ہوں (اور ہماری غلطیوں سے آنے والی نسلیں پریشان نہ ہونے پائیں)

یہ اصول جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ہر منفرد ہستی سے گزر کر سارے عالم پر محیط ہیں اور اُن عالمگیر واقعات کو جو اُن کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں گھیرے ہوئے ہیں اور اپنا اثر منفرد اقوام پر انسانی معاشرہ کے ہر جزو اور ہر حصہ پر ڈالتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

جغرافیہ اب اگر اسی کے تحت غور کیا جائے تو کوئی شخص ملک دکن کو دنیا سے علیحدہ کسی اور کرہ میں تو نہیں رکھیگا اور جب وہ اسی کرۂ ارضی میں موجود ہے تو پھر وہ اس کے مسلمہ اور عام اصول سے باہر نہیں۔ اس کا بھی اس میں ویسا ہی حصہ

ہے جیسے کسی اور ملک کا۔ ملک دکن واقلیم سمندر کے وسط میں واقع ہوا ہے۔ قدیم سے ہند کو مختلف حصص میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی ہندوستان اور دکن کی تقسیم کو تسلیم کیا ہے چنانچہ زمانہ قدیم میں بھی اس حصہ ملک کو جو وندھیاچل کے شمال میں واقع ہوا ہے اُدترآپتھ کہا جاتا تھا اور اُس پہاڑ کے جنوب میں جو ممالک واقع ہوئے ہیں اُن سب کو بحیثیت مجموعی دکھشنیاپتھ کہتے تھے اُس کی وجہ یہ تھی کہ وندھیاچل کے جنوب کے حصہ ارض سے لوگ اس زمانہ میں بہت کم واقف تھے اور اس کے جغرافیہ اور جغرافی حالت سے بالکل نابلد تھے اسی لئے ایک عام نام انہوں نے اُس کے لئے تجویز کر دیا۔ لیکن مہابھارت کی تدوین کے زمانہ تک دکھشناپتھ سے اسی ملک سے مراد لی گئی ہے جسے ہم دکن کہتے ہیں اور موجودہ مہابھارت میں اس کا ذکر صاف طور سے آگیا ہے۔ "سہادیو نے اپنے جنوبی حملہ کے وقت اس کے بڑے بھائی کے راجہ سویا کی قربانی ادا کرنے سے پہلے بولند اس کو فتح کر لیا اور وہاں سے جنوب کی طرف روانہ ہو کر پانڈیا کے ملک میں وارد ہوا جہاں سے ..... پانڈیا کے خلاف ایک زبردست لڑائی میں فتح حاصل کرنے کے بعد اس نے شمال کے طرف دکھشناپتا (دکن) کا رخ کیا۔

اسی طرح سے رامائن میں بھی ملک کی اس تقسیم کی تائید کی گئی ہے اور ایک جگہ تو وندھیاچل کے جنوب میں تین حصہ بتلائے گئے ہیں ایک پہاڑ سے لے کر دریائے گوداوری تک اور دوسرے گوداوری سے کرشنا تک اور تیسرا کرشنا کے جنوب میں۔ رامائن کی تقسیم موجودہ زمانہ کی تقسیم سے زیادہ قریب ہے کیونکہ زمانہ حال میں ہندوستانی جغرافی تحقیقات اپنے کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اور اب اس میں مزید گنجائش نہیں رہی سائینٹیفک طریقہ پر ایک ایک گوشہ کا معائنہ کر کے تحقیق کے ساتھ اس کا جغرافیہ لکھا جا چکا ہے۔ اقلیم ہند کو چار بڑے مفصلہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی وہ ہمالیہ اور سرسبز میدان جن کو گنگا اور دریائے سندھ اور برہم پوترا اپنے پانی سے شاداب کرتے ہیں اور جنہیں ہندوستان کہا جاتا ہے اس ملک کے جنوب میں کوہ وندھیاچل ہیں جو سطح مرتفع کی شمالی سرحد ہیں یہ حصۂ ملک برخلاف ہندوستان کے پہاڑی ہے اور ۱۵۰۰ سے ۳۰۰۰ فٹ تک اونچا ہے۔ حقیقت میں کوہ نلگیری تک کا حصہ سطح مرتفع کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض اور جغرافی حالات کے لحاظ سے اس

کچھ شمال ہی میں سطح مرتفع کو ختم کرکے تیسرے حصہ کو جنوب بعید کہتے ہیں اور چوتھا حصہ سواحل ہند کہلاتا ہے۔

اس جگہ اس تقسیم کے وجوہات جغرافی بیان کرنا اور انہیں ثابت کرنا تضیع اوقات ہے۔ کیونکہ یہ ایسے بیّن اور مسلّم ہیں کہ اُن سے ہر ایک مدرسہ کا لڑکا واقف ہے۔ صرف بتلانا یہ ہے کہ جس طرح ہندوستان کے سب میدان اپنے عام خصوصیات میں یکساں ہیں۔ لیکن تفصیلی اور ذیلی خصوصیات میں ہر ایک حصہ جدا جدا ہے۔ اسی طرح سطح مرتفع کی بھی جزئی خصوصیات علٰحدہ علٰحدہ ہیں چنانچہ وہ حصہ جو سطح مرتفع وسط ہند کہلاتا ہے وہ سطح مرتفع دکن سے کچھ اپنے بعض جزئیات میں علٰحدہ ہے۔ لہٰذا ہم دکن کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک دکن خاص اور دوسرا دکن اعظم۔ دکن خاص وہ حصہ زمین ہے جو مغربی گھاٹ کے مغربی اتار سے لے کر مشرقی گھاٹ تک اور دریائے گوداوری اور دریائے کرشنا کے درمیان واقع ہے اور دکن اعظم وہ دکن ہے جس میں وہ تمام حصص سطح مرتفع جو دکن خاص میں شامل نہیں داخل ہیں۔

رامائن میں بھی دکن کی تقسیم اسی طرح کی گئی ہے اور اُس کی تاریخ کی نسبت اجمالی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تقسیم چوتھی صدی قبل مسیح میں عام طور پر مانی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پاتان جلی کے زمانہ میں جو قریب ۱۵۰ برس قبل مسیح کے ہے دندھیاچل کے جنوب سے عام طور پر لوگ واقف تھے اس کے بعد میگاستھنیس اور چنا کیا کی تحریرات سے جو قریب قریب ایک دوسرے کے ہمعصر تھے اور اشوک کے زمانہ میں دکھنی جغرافیہ کا ہم کو کافی مواد ملتا ہے۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ خواہ مخواہ قدیم کی تقسیم پر زور دیکر ملک کی تقسیم کو جو میں نے اوپر کی ہے منوانے کی کوشش کروں لیکن میرا مطلب اس سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ممالک کی تقسیم جو ایک عام جغرافی اصول پر کی جاتی ہے اس سے عموماً لوگ ہر وقت واقف رہے ہیں قطع نظر اس سے کہ اُن کی تقسیم میں موجودہ سہولتیں نہ ہونے کی وجہ کوئی تقسیم یا غلطی رہ گئی ہو۔

تاریخ دکن کا تعلق تاریخ عالم کیساتھ

دنیا میں جو عام اصول کام کرتے رہتے ہیں وہ ہر وقت موجود ہیں اور جغرافیہ کا جو اثر ملک کی تاریخ پر پڑتا ہے وہ بھی ظاہر ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ عالمگیر اصول اور عالمگیر واقعات اپنا اثر کسی جگہ کرتے ہیں اور کسی جگہ نہیں کرتے بلکہ اس کے

برخلاف ہم یہ کہینگے کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت پر محیط ہیں اور برابر اپنا اثر کرتے رہتے ہیں چونکہ مختلف حصص دنیا میں ظہور پذیر ہونے میں مقام اور جگہ کا فرق ہوتا ہے اس لئے وہ کہیں آگے کہیں پیچھے اور ہر حصہ اور ہر مقام کے مقامی ضروریات اور ماحول کے موافق اسی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نمودار ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ واقعات کی ظاہری صورت کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو اگر ظاہری لباس نکال کر انہیں دیکھا جائیگا تو سب کی تہ میں ایک ہی چیز نکلیگی اور انہی اساسی یا بنیادی واقعات کو ہم عالمگیر واقعات کہتے ہیں۔

چنانچہ اس حصہ ملک کی تاریخ جس کو مذکورہ بالا جغرافیہ حیثیت سے تعین کرکے دکن کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی تاریخ گو ظاہراً ایک علٰحدہ حیثیت رکھتی ہے اور جو خاص ظاہری واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ اسی سے متعلق ہیں اور ان پر اس کے جغرافیہ کا اثر اسی طرح پڑا جس طرح اور اقوام یا ممالک کی تاریخ پر وہاں کے جغرافیہ کا پڑا ہے۔ لیکن اگر تاریخ عالم میں ہر ملک اور ہر حصہ اور ہر قوم کے تمام واقعات کو جمع کیا جائے اور اُن کو مناسبت کے لحاظ سے تقسیم کرکے غور سے اگر دیکھا جائے۔ تو اصلی حقیقت ظاہر ہو جائے گی یعنی ہر واقعہ میں خواہ وہ کسی ملک یا قوم سے متعلق ہو اور خواہ اُس کی ظاہری صورتیں کتنی ہی جدا ہوں ایک ہی بنیادی اصول نظر آئیگا۔

بہمنی سلطنت کی نسبت جو مختلف مورخین کے خیالات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں وہ اسی اصول کے تحت با معنی معلوم ہوتے ہیں اور ہمارا یہ کہنا کہ علاء الدین حسن گنگو بہمنی اپنے زمانہ کی پیداوار تھا۔ بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ تاریخ عالم کے وہ واقعات جو عالمگیر یا اساسی ہونے کے قابل ہیں انہیں علٰحدہ چن لیں اور پھر مختلف ممالک کی تاریخوں کا مطالعہ کرکے وہاں کے مقامی واقعات کو اُن سے مطابق کرکے نتیجہ برآمد کریں۔ اس کے لئے ہم کو سب سے پہلے تاریخ دکن پر شروع سے ایک سرسری نظر ڈالنی چاہئے تاکہ واقعات کا تسلسل ہمارے دماغ میں جاگزیں ہو جائے۔ اور پھر اس کے بعد بیرونی دنیا کی تاریخ کی مدد سے سلطان علاء الدین بہمنی کے زمانہ پر تبصرہ کرکے اس کی شخصیت اور کارناموں کا اندازہ کیا جائے۔

مختصر تاریخ قدیم

جب انسان اپنی ابتدائی وحشت سے باہر ہو کر اجتماعی زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو سب سے پہلے خاندانی اکائی کا پتہ چلتا ہے اور پھر

اس خاندان سے وہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر قبیلہ اور قبیلہ سے قوم کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور بجائے واحد گھر کے ملک سیاسی یکائی مقرر ہوتا ہے۔ علم سیاسیات کے مقرر کردہ اصول کی روشنی میں ہم جب تاریخ دکن کا صفحہ الٹتے ہیں تو ہم بالکل حال کے زمانہ سے اس کو باقاعدہ اور مسلم طور سے شروع ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس کے پہلے کے حالات ابھی تک تاریکی میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدراس اور میسور میں بہت سے کام کرنے والے میدان میں نکل آئے ہیں مگر افسوس اس کا ہے کہ خاص دکن میں ابھی تک ایسی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔ جامعہ عثمانیہ سے جہاں ملک کو بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں وہاں ملک کو اس ملکی جامعہ سے ملک کی تاریخ کی نسبت سب سے بڑھکر اور سب سے پہلے توجہ کی اُمید کرنی چاہئے۔ اگر تاریخ روما اور یونان کو ہماری جامعہ میں جگہ مل سکتی ہے تو تاریخ دکن کو بدرجہ اولیٰ نہ صرف انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے بلکہ ایم۔ اے اور اس سے بھی گزر کر ریسرچ کلاس کی حد تک اسکی سرپرستی کرنا عین ملک پرستی اور قومی خدمت ہے۔

زمانہ قبل از تاریخ

مہابھارت اور رامائن کی کتابیں تاریخ دکن کے لئے بھی مستند ہیں اور جو کچھ ان مقدس کتابوں کے خزانہ میں دکن کا حصہ ہے گو وہ بہت کم ہے لیکن وہی غنیمت ہے وہ مثل شب چراغ کے ہے جس کی روشنی میں ہم ہاتھ پیر مار سکتے ہیں اور تحقیقی کام کرکے مردہ دفینوں کو نکال سکتے ہیں چونکہ ان کتابوں کا تعلق زیادہ تر شمالی ہند سے ہے اسی لئے دکن کی نسبت ان میں بہت مختصر واقعات درج ہیں جو اصل واقعات متعلقہ سے ذیلی طور پر متعلق ہے ظاہر کیا گیا ہے ان مقدس کتابوں کے علاوہ میگاستھنیس کے سفرنامہ سے ابتدائی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ گو اس کے پہلے اشوک کے کتبے اور دوسرے نوشتہ بھی موجود ہیں جو تاریخی واقعات وضع کرنے میں آج کل بہت مدد دے رہے ہیں۔

آندھر اسلطنت

۲۰۷ ق م میں دکن اشوک کی سلطنت کا ایک صوبہ تھا جو دراصل بالکل مطلق العنان اور آزاد تھا مگر اس کی اطاعت کا دم بھرتا تھا ۱۸۵ ق م میں موریا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور ڈیڑھ سو برس تک مینگا خاندان بڑی شان و شوکت سے تمام ہندوستان پر دریا نربدا کے کناروں تک حکمراں رہا۔

اوائل سنین مسیحی میں اس زبردست سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور دکن کی آندھر اسلطنت تعلیم ہند کی سب سے بڑی سلطنت بنگئی یہ سلطنت دریائے گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے بیچ میں ساحل تک قائم

تھی اس نے بہت جلد اپنی عزت اور قوت بڑھا کر موریا سلطنت کی رقابت شروع کر دی اور اپنی کا دم بھرنے لگی۔ اپنے زمانہ میں آندھرا سلطنت اقلیم ہند کی سب سے زبردست سلطنت تھی۔ میگاستھنیز نے اپنے سفرنامہ میں اس کے حالات بہت جوش کے ساتھ لکھے ہیں اور آندھرا راجاؤں کی قوت اور طاقت کی بہت تعریف کی ہے اُن کی دولت کی نسبت بھی وہ حیرتناک واقعات لکھتا ہے۔ آندھرا سلطنت کے تعلقات یونانی اور رومی تاجروں اور عربی ملاحوں سے بہت گہرے تھے اور اس زمانہ میں دریائی تجارت دکن اور یورپ کے درمیان قائم تھی۔

۲۱۸ء میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے بعد پھر تین صدیوں تک کی تاریخ بھی خاموش ہے۔ لیکن اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ابھیرا خاندان نے ستر برس تک اقتدار حاصل کر لیا تھا جس کے بعد راشٹر کوٹ کا ایک قبیلہ اُس کو مغلوب کر کے ۵۵۰ء تک خود قابض و حکمراں رہا۔

جنوب بعید

دریائے کرشنا کے جنوب میں تین سلطنتیں قائم تھیں۔ چولا۔ چیرا اور پانڈیا یہ سب بہت زبردست و راوڑی حکومتیں تھیں۔ جو بالکلیہ آریائی اثر سے محفوظ تھیں۔ جب آریہ قوم نے اُن کی حکومت کو زیر و زبر کیا تو اُس وقت یہ قوم اپنے تمدن و تہذیب کے لحاظ سے انتہائی عروج پر تھی۔ مگر آریہ اُن کی قومیت اور تہذیب کو نہ بگاڑ سکے اور سوائے اس کے کہ آریہ مذہب انہوں نے قبول کر لیا ہو اور کوئی اثر انکی زبان یا ادب یا تہذیب پر نہ پڑ سکا اور جونہی آریہ غلامی کا جوا ان کے کندھوں پر ہلکا ہوا انہوں نے اسے اُتار پھینکا اور آزادانہ زندگی بسر کرنے لگیں۔ یہ سلطنتیں ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ انہوں نے خصوصاً موریا سلطنت کے خلاف آندھرا قوم کی سرکردگی و سیادت قائم کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان سب میں چولا سلطنت زیادہ زبردست تھی لیکن دوسری صدی عیسوی کے آخری حصہ میں چیرا قوم کو غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد پھر ۵۵۰ء میں جب تاریخی تاریکی کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے تو دکن میں چلوکیا خاندان حکمران نظر آتا ہے اور جنوب بعید میں ایک چوتھی قوت ظاہر ہوتی ہے جو پالوا کے نام سے مشہور رہے۔ یہ لوگ پہلے پہل کاویری اور جنوبی پینار کے درمیانی جنوبی ساحل پر آباد تھے انہوں نے پھر آہستہ آہستہ۔ اپنے حدود سے پاؤں پھیلانے شروع کئے اور پینار کے اُس پار کانچی ورم کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ چند سال بعد انہیں پھر ایک تحریک پیدا ہوئی جس نے اُن کو دریائے کرشنا کے جنوبی ساحل تک پہنچا دیا۔ اس پیشقدمی نے پالوا قوم کو چلوکیا سلطنت کی سرحد تک پہنچا دیا جس کی وجہ سے ایک جنگ عظیم کی ابتدا ہوئی جو زمانہ دراز تک جاری رہی اور باوجود مستعد

لڑائیوں کے کوئی تشفی بخش فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

پہلی چلوکیا سلطنت دکن

چلوکیا خاندان کا بانی جیا سنبھا ایک شمالی قسمت آزما سپاہی تھا۔ اُس کا نام ہمیں ایک کتبہ سے معلوم ہوا ہے وہ راشٹر کوٹ مورد ثی راجاؤں کا قلع قمع کرکے خود بادشاہ بن بیٹھا اُس کے بیٹے پلا کسی اول نے وتاپی پور یعنی موجودہ بادامی کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور سلطنت کی قوت کو بڑھانے میں بڑی کوشش کی اپنی دولت اور طاقت کے زعم میں پلا کسی نے اپنے نام کے ساتھ بہت سے خطابات بڑھا دئے تھے اس کا بیٹا کرتی وامن بہت قابل شخص تھا جس نے شمالی کونکن کو اپنی سلطنت میں داخل کرلیا حال میں بادامی میں ایک کتبہ برآمد ہوا ہے جس کی مدد سے ڈاکٹر بھنڈارکر صلب نے کرتی وامن کی تاریخ جلوس ۵۶۷-۵۶۶ء میں قرار دی ہے چوبیس سال سلطنت کرنے کے بعد اُس نے وفات پائی اُس کے بعد اس کے بھائی منگا لیسا نے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے متوفی راجہ کا بیٹا اور جائز وارث پولا کسی دوم کے ہوتے ہوئے تاج وتخت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر پولا کسی دوم نے جو بڑا نامور سپاہی اور قابل بادشاہ تھا ۶۱۱ء میں انہیں اور اُن کے حامیوں کو شکست دیکر بھگا دیا منگالیا اور اُس کا بیٹا لڑائی میں مارے گئے اور نمکحرامی کی سزا پائی گرہان خانہ جنگیوں نے بدخواہان ملک میں بغاوت و سرکشی کی جرأت پیدا کردی اور ایک گروہ کثیر نے گونداکے ساتھ راشٹر کوٹ میں علم بغاوت بلند کردیا پولا کسی نے باغیوں کی سرکوبی کرکے گوندا کی قوت توڑ ڈالی اور بہت سے باغی گوندا کا ساتھ چھوڑ کر راجہ سے آملے اور اُس کی اطاعت قبول کرلی۔ پولا کسی اصول حکمرانی وسیاسی حکمت عملی سے واقف تھا اُس نے باغیوں کو معاف کرکے اُس کے ساتھ نہایت ہی عمدہ اور شریفانہ برتاؤ کیا جس کی وجہ سے وہی لوگ اُس کے بہترین بہی خواہ ہوگئے دوسرا اہم واقعہ جو ہمارے غراض کے لئے مفید ہے اور جس کو ہمارے نظریوں کے ثبوت میں ہم پیش کرسکتے ہیں وہ شمالی بادشاہ کا حملہ ہے۔ جس کا پولا کسی نے نہایت ہی بہادری اور ہمت کے ساتھ ۶۳۰ء میں مقابلہ کیا اور اُس کے زبردست حملہ کو دفع کرکے نصرف اپنی سلطنت بچالی بلکہ اس کی زبردست قوت اور اقتدار کو وہ صدمہ پہنچایا کہ دوبارہ اس نے دکن کا نام نہ لیا۔

مسئلہ جنوبی

تاریخ ہند میں مسئلہ جنوبی ہمیشہ ایک مکرر آلا اسئلہ رہا ہے اور کبھی اسکا تشفی بخش تصفیہ نہیں ہوا۔ ہمیشہ شمالی حکمرانوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ دکن کو اپنا غلام بنائیں اور اکثر دفعہ انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی چنانچہ موریا سلطنت نے خواہ وہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو دکن کو عرصہ تک اپنے زیر نگیں رکھا جس کے انتقام میں آندھرا خاندان کے راجہ کچھ دنوں تک شمال کے اکثر ممالک

پر قبضہ کرکے حکمرانی کرتے رہے۔ بادشاہ کے حملے نے تیسری دفعہ کے لئے پھر اسی سوال کو تازہ کیا اور زمانہ حال تک بھی اس کشمکش کا نتیجہ اکثر دفعہ دونوں کے لئے مضرت رساں ثابت ہوا ہے چنانچہ اورنگ زیب کی خواہش نے مغلیہ سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکدیا اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک بسیط مضمون کی ضرورت ہے جس کو انشاء اللہ کسی اور وقت پیش کیا جائیگا یہاں اُس کی زیادہ تفصیل میں پڑنا غیر ضروری ہے۔

پلاکسی میں سلطنت کی عظمت

پلاکسی کے زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر اجنٹا کے غار ہیں جس سے تاریخ دکن کی وہ عظیم الشان یادگار اب تک قائم ہے جبکہ پلاکسی سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی اور اُس کے سفیر شاہ ایران کے پاس بھیجے گئے تھے اور اسکے جواب میں ایرانی سفیر دکنی راجہ کے دربار میں تحفہ تحائف لیکر حاضر ہوئے یہ واقعہ ۶۲۵ء کا ہے جبکہ ایران میں خسرو دوم سریر آرائے سلطنت کیانی تھا۔

اس واقعہ سے ملک دکن کی عظمت اور اُس کے تعلقات بیرونی دنیا سے ظاہر ہوتے ہیں اور جو وقعت اور عزت ملک دکن کو اپنے ہمعصر سلطنتوں میں حاصل تھی اُس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ہیون ٹی سانگ کا سفر نامہ

ملک کی عام حالت باشندوں کی خوشحالی اور اُن کی طبیعت کا اندازہ ہیون ٹی سانگ کے سفرنامے کے اس حصہ سے ہوسکتا ہے جو دکن سے متعلق ہے۔ یہ باریک بین و وسیع النظر زائر اسی زمانہ میں دکن آیا اور اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "موہولاچا کا (مہاراشٹر جس سے مراد سلطنت چلوکیا ہے جو خاص دکن میں واقع ہے) اوس کا احاطہ چھ ہزار (لی) ہے۔ زمین زرخیز و شاداب ہے آب و ہوا خوشگوار اور غلہ افراط سے پیدا ہوتا ہے پایۂ تخت کے مغرب میں ایک دریا بہتا ہے"۔ اس کے بعد وہ باشندوں کی طبیعت اور اُن کی خصائل کی نسبت لکھتا ہے "قد کے اونچے پورے مغرور اور خوددار ہیں اور علم دوست۔ اگر کوئی احسان ان پر کیا جائے تو وہ اُس کے شکر گزار رہتے ہیں لیکن جو شخص اُن کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اُن کے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔ اگر کوئی انہیں ذلیل کرے اور اُن کی عزت کے درپے ہو تو وہ اُس کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں مصیبت زدوں کی امداد میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتے اور اپنے دشمن سے انتقام لینے سے پیشتر اُس کو آگاہ کردیتے ہیں جس کے بعد اسلحہ سے تیار ہوکر اس سے نیزہ بازی کرتے ہیں ہزیمت خوردہ فوج کا پیچھا کرتے ہیں مگر جو امان طلب کرے اُس کی جان بخشی کردیتے ہیں۔ اپنے فوجی افسر کو جنگ ہارنے کی وجہ سے جسمانی سزا نہیں دیتے بلکہ اُسے زنانی کپڑے پہناتے ہیں تاکہ وہ اس ذلت کے بعد پھر جینا گوارہ نہ کرے اور خودکشی کرلے۔

حکومت کی جانب سے ایک خاص دستہ سورما سپاہیوں کا مقرر ہے جو بہادری میں اپنا آپ نظیر ہے۔ یہ سپاہی جب شراب پی کر جنگ آزمائی کے لئے نکلتے ہیں تو ان میں کا ہر ایک فرد اپنے کو ہزار کا مدمقابل تصور کرتا ہے۔ اور ہزار آدمیوں کو اپنے سے لڑنے کے لئے طلب کرتا ہے۔ یہ دستہ ہمیشہ جنگ میں دوسری فوج کے آگے ہوتا ہے میدان جنگ کو باجے بجاتے ہوئے جاتے ہیں اور راستہ میں اگر کوئی سپاہی کسی شخص کو مار ڈالے تو اس پر کوئی جرم عائد نہیں کیا جاتا اس فوج کے علاوہ اُن کے پاس سینکڑوں مہیب اور جنگجو ہاتھی ہیں جنہیں جنگ شروع ہوتے ہی ایک قسم کی تیز شراب پلا کر دشمن کی صفیں روندنے کے لئے میدان جنگ میں چھوڑ دیا جاتا ہے"

یہ بیان اپنے مختصر الفاظ میں ایک داستان پنہاں رکھتا ہے اس سے نہ صرف تہذیب و تمدن اور حالت جنگ و ایام امن پر روشنی پڑتی ہے بلکہ ایک مرتع تصویر اس زمانہ کے عام حالت کی ہماری نظروں کے سامنے کھینچ جاتی ہے ہیون ٹی سانگ پلاکسی اور پاوشا کی جنگ مسکر آرائی کے وقت ہندوستان میں موجود تھا اور اس سلسلہ میں رقمطراز ہے کہ "پاوشاہ کا نام پلاکسی ہے اور وہ ذات کا چھتری ہے۔ اپنے بہادر سپاہیوں اور ہاتھیوں پر اُس کو بڑا گھمنڈ ہے اور انہیں کے بھروسہ پر وہ اپنے ہمسایہ اقوام اور راجاؤں کو ذلیل و خوار سمجھکر ہمیشہ اُن کی ہتک کرتا رہتا ہے۔ اُس کے خیالات وسیع ارادے بلند اور رائے صائب ہے۔ دنیا کے دور دراز حصوں تک اس کا شہرہ اور اُس کی مہربانیوں کا چرچا پھیلا ہوا ہے۔ رعایا وفاداری اور جانثاری کے ساتھ اس کی اطاعت کرتی ہے۔ اسی زمانہ میں بادشائی کی تلوار کا لوہا بھی مشرق و مغرب میں مانا جاتا ہے اور ہمسایہ سلطنتیں اس کے خوف سے لرزتی ہیں لیکن پلاکسی ہی کی رعایا اور اقوام ایسی ہے جو اُس کی پرواہ نہیں کرتی اور آج تک انہوں نے بادشائی غلامی کا ننگ گوارہ نہیں کیا۔ متعدد دفعہ ان پر فوج کشی کی گئی اور پنجاب کی افواج ہندوستان کے بہترین افسروں کے تحت تیار کرا کے ہارشا خود میدان کارزار کو گیا لیکن اُس کی ساری کوششیں اور طاقت اُن کی مدافعانہ مخالفت کو نہ توڑ سکیں۔ اسی ایک واقعہ سے اُن کی علو ہمت، غیور طبیعت اور جری و جنگجو خصلت اور آزادمنش عادت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ابتک سارے ممالک ہند کی (جو یا دشا کے زیر نگیں) قوت کے خلاف اپنی اور اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھا۔"

پہلی سلطنت چلوکیا کا خاتمہ

لیکن پلاکسی کی قسمت میں باوجود اس عظیم کامیابی و نیک نامی کے آخری عمر میں ہزیمت اُٹھانی تھی پالواقوم سے چلوکیا سلطنت کو جو رقابت تھی اس نے آخر کار نرسنبھا وامن کے زمانہ میں جو پالو اقوام کا بہترین راجہ تھا ثمر لایا اور جنگ کی صورت اختیار کی جس میں چلوکیا افواج کو شکست ہوئی اور نرسنبھا وامن نے دریائے کرشنا کو عبور کر کے بادامی کو مسخر کر لیا پلاکسی اس جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور اس کا بڑا بیٹا جندرادتیا دکن کی طرف بھاگ گیا۔

راشٹر اکا خاندان

تیرہ برس تک چلوکیا سلطنت تباہ و برباد رہی جس کے بعد دکرما دتیا اول ۵۵۳ء میں بڑی کشمکش کے بعد پھر چلوکیا خاندان کے وقار کو قائم کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کی وفات کے بعد ستر برس تک چلوکیا سلطنت قائم رہی جس کے بعد ۷۵۳ء میں قدیم راشٹر کوٹ کو دو شہزادے یعنی دانتی درگا اور کرشنا راجہ نے اُس کا خاتمہ ہمیشہ کے لئے کر دیا۔ راشٹر کوٹ سب سے قدیم دکنی تھے جنہوں نے چلوکیا سے بیشتر مدت تک سلطنت کی تھی پلاکیسی کے زمانہ میں انہوں نے چلوکیا کے خلاف بغاوت بھی کی تھی لیکن جو خواب اس وقت پلاکیسی کی ذاتی قوت اور مال اندیشی وحکمت عملی کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا وہ آٹھویں صدی میں ممکن ہو گیا۔

یاد ہوگا کہ پلاکیسی دوم کے زمانہ میں جو بغاوت ہوئی تھی اُس کا سرغنہ گووندا تھا جس کو پلاکیسی نے دور اندیشی سے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اس کی جاگیریں بھی بحال کر دیں اور خاندان شاہی سے اس خاندان کے نسبتی تعلقات بھی قائم کئے چنانچہ ایک شہزادی گووندا کے بیٹے سے بیاہی گئی اور اس کا بیٹا اندرا نے جو اپنی ماں کی طرف سے چلوکیا شہزادہ یا راج کنور تھا پھر ایک شہزادی سے شادی کی۔ ان دونوں کا بیٹا دانتی درگا تھا یہ ایک طرف تو قدیم ملکی خاندان شاہی سے تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے راشٹر کوٹ اس کے حلیف و مددگار تھے اور دوسری طرف اُس کو موجودہ خاندان شاہی سے قریبی رشتہ تھا چنانچہ اُس نے جائز وارث تخت و تاج دکن کرتی وامن دوم کے خلاف بغاوت کی اور میدان جنگ میں شاہی فوج کو شکست دے کر راجہ بن بیٹھا۔ ممکن ہے کہ اُس کی وجہ علاوہ دانتی درگا کی ذاتی قابلیت کے اُس کی شخصیت بھی ہو کیونکہ راشٹر کوٹ قوم تو اسی کی ہی تھی اور دوسرے فرقے بھی اگر اس کے موافق نہیں تو زیادہ مخالف بھی نہیں تھے کیونکہ یہ خود اسی خاندان کا ایک شہزادہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ اُس کی حیثیت مشترکہ ملک کے لئے بہت مفید تھی۔

چونکہ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی اس کے بعد اس کا چچا کرشنا راجہ ۷۵۳ء میں تخت نشین ہوا۔ تخت پر متمکن ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے چلوکیا راجاؤں کے خاندان کو ملیامیٹ کر دیا اور اُن کی ساری قوت اور عظمت جو ملک میں تھی برباد کر دی یہ وہی مہتم بالشان راجہ ہے جو دنیا کی حیرتناک یادگار جیسے آج تک لوگ دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں ہمیشہ کے لئے کیلاس کے مندر کی شکل میں ایلورا کے غاروں میں ترشوا کر چھوڑ گیا۔ اس کے ایام حکمرانی ۷۵۳ء تا ۷۷۵ء کے درمیان کسی وقت ہے جس کی تحقیق ابھی پوری طرح نہیں ہوئی ہے۔

کرشنا راجہ کے بعد گووندا دوم تخت نشین ہوا۔ اس کے چھوٹے بھائی دُھرڈوا نے اس کے خلاف بغاوت کی اور بھائی کو ہٹا کر خود تخت پر بیٹھ گیا دھرڈوا نے پالوا سلطنت پر جو تین حصوں میں منقسم ہو گئی تھی اور جس کی حالت بہت کمزور تھی حملہ کر کے اس کے راجہ کو قید کر لیا جس سے سالانہ خراج میں کئی ہاتھی لیتا رہا۔

اس راجہ کے بعد جو مشہور شخص ہے وہ کرشنا سوم دھرڈوا کے بعد سے دسواں راجہ ہے اس نے ۹۴۷ء میں پرومانندی چلوکیا کی مدد کے لئے گنگا سلطنت میں جا کر ٹاک کولم میں راجہ دنتیا چولا کو شکست دی بہت سے چولا راجاؤں کی کوششوں نے چولا سلطنت کے حدود کو راشٹر کوٹ راجدھانی کی سرحد سے ملا دیا تھا۔ پرومانندی کو جو چلوکیا خاندان کا ایک شہزادہ تھا اور گنگا علاقہ پر قابض ہو کر حکمرانی کر رہا تھا۔ اپنے مقبوضہ علاقہ سے نکالنے کے لئے راجہ دنتیا حملہ آور ہوا۔ اس کی امداد کے لئے جا کر کرشنا سوم نے فتح حاصل کی اور تانجور کا محاصرہ کر لیا راجہ کرشنا نے اس فتح سے پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور بہت ممکن تھا کہ کامیاب ہو جاتا۔ اور راجہ دنتیا میدان جنگ ہی میں مارا جاتا۔ مگر اس کے بھائی کندارا دتن نے اپنی بہادری اور حکمت عملی سے چولا سلطنت کو کامل تباہی سے بچا لیا۔

راشٹر کوٹ کا آخری راجہ کاکالا ہے جو کرشنا راجہ کے بھائی کا پڑوتا تھا اُس راجہ کے زمانہ میں ملک مالوہ کے پرمار اخاندان کے دو شہزادے ہارشا اور مونجا نے دکن پر حملہ کیا اور ملکھیر اُن کے دارالسلطنت تک پہنچ گئے۔ گو یہ حملہ موقتی و عارضی تھا لیکن اس کی وجہ سے جو کمزوری حکومت میں پیدا ہو گئی اور جو عام بربادی اور افلاس ملک میں پھیل گیا اُس نے پھر چلوکیا خاندان کی امید بندھائی۔ چنانچہ ۹۷۳ء میں ٹی لپا چلوکیا نے کاکالا کو تخت سے ہٹا دیا اور خود راجہ بنگیا۔ قریب دو سو سال سلطنت کرنے کے بعد راشٹر کوٹ خاندان کا خاتمہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا۔

بعد کے چلوکیا

ٹی لپا نے فوراً کاکالا کی بیٹی سے شادی کر لی جس کی وجہ سے عام لوگوں کے خیالات اُس کے موافق ہو گئے اور رعایا کو پوری طرح اپنا طرفدار بنا سکا۔ دکھنی قوم کی طبیعت قدامت پسند اور بادشاہ پرست واقع ہوئی ہے۔ ان کی نظروں میں اس سے بڑھکر اور کوئی گناہ نہیں کہ حکمراں خاندان کے خلاف کسی کی انگلی اُٹھے۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم میں بہت سے انقلاب ہوئے جن کو ہم نے خود ابھی ابھی اوپر لکھا ہے لیکن ہمیشہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی طریقہ سے حکمراں خاندان سے تعلق پیدا کر کے ایک ظاہری حق قائم کیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کی عصبیت قائم رہے۔ اس میں

شک نہیں کہ اگر کوئی زبردست شخص بزور شمشیر بغیر اس قسم کے حق پر بھروسہ کئے مالک ملک بنجاتا تو قوم مجبوراً اُس کی اطاعت کرلیتی لیکن ہر شخص اس کو اپنے دل میں باغی اور غاصب تصور کرتا اور ایسے شخص کو ہمیشہ بغاوت کا خوف لگا رہتا ایسے بہت کم واقعات ہیں جہاں غاصبین کو اطمینان سے سلطنت کرنے کا موقع ملا ہو اور اُن کی حکومت دیرپا ہوئی ہو۔ چنانچہ آجتک بھی دکھنیوں کی وفاداری اور بادشاہ پرستی اور حکمران خاندان پر جان نثاری زبان خلق ہے۔ ہر روز ہم خود اپنی زندگی میں سینکڑوں واقعات دیکھتے اور سنتے ہیں اور خود اپنے دل میں ہم اس مقدس خیال کی عزت و آبرو کرتے ہیں جو ہمیں اپنے بادشاہ ذیجاہ اور خانوادۂ آصفیہ کی محبت اور وفاداری کی طرف مائل کرتا ہے اور دن و رات اس کے اقبال و دولت کی افزونی و ترقی کے لئے دست بدعا رکھتا ہے اور اُس کے بدخواہوں اور نمکحراموں سے دلی نفرت و عداوت پیدا کرتا ہے۔

الغرض ٹی لپا اس حکمت عملی سے رعایا کو وفادار بنالیا اور اپنی فوج تیار کرنی شروع کردی اس کا پہلا فرض اپنی شمالی سرحد کو مستحکم اور مضبوط قلعوں سے محفوظ کرنا تھا جس کے بعد ہی اُس نے مالوہ پر بدلہ لینے کے لئے حملہ کردیا اس قومی خدمت سے اُس کی رعایا اور بھی خوش ہوئی اور جوق جوق لوگ لڑائی میں شریک ہوتے گئے ایک مدت تک لڑائی ہوتی رہی ۹۹۵ء میں مونجا نے سرحد پر حملہ آور ہونے کی غرض سے دریائے گوداوری کو ابھی عبور ہی کیا تھا کہ دکنیوں نے حملہ کردیا اور اسی حالت میں انہیں شکست دی کہ دریا اُن کے پیچھے اور دشمن اُن کے آگے تھے۔ بیچارے سب کے سب مارے گئے مونجا حراست میں چند روز رکھے جانے کے بعد قتل کردیا گیا۔

۹۹۷ء میں ستیاس رایا ٹی لپا کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس وقت شمالی سرحد مستحکم ہوچکی تھی لیکن اب دوسری طرف سے اس سے بڑھکر خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ جنوب میں چولا قوم پھر قوی ہوگئی اور تمام جنوب بعید کو اپنا محکوم کرلینے کے بعد اس اجھنے مصمم ارادہ کرلیا کہ راجہ دتیا کی پالیسی کی مطابقت کی جائے اور گنگا علاقہ سے پرو ماننڈی کا اخراج کیا جائے ستیاس رائے کے مصالحت ملکی کے خلاف تھا کہ وہ اس درمیانی قوت کو جو دو زبردست طاقتوں کو جدا کئے ہوئے تھی اپنے رقیب کی حلیف بنائے چنانچہ حسب سابق ستیاسی رائے نے پرو ماننڈی کی امداد کے لئے فوجیں روانہ کیں ۱۰۱۸ء میں راجہ راجہ اعظم (راجہ چولا) نے حملہ کیا افواج کو کامل شکست دیکر سارے ملک کو قتل و غارت سے برباد کردیا۔ ہزاروں برہمن عورتیں بچے اور بوڑھے تہ تیغ کردئے گئے اور گنگاوادی سلطنت چولا میں داخل

ہو کر دریائے کرشنا کی شمالی سرحد مقرر ہوئی۔

کرشنا و گوداوری کے دہانوں کے درمیانی حصۂ ساحل پر مشرقی چلوکیا کی سلطنت تھی اُن کا پایۂ تخت وینگی تھا جہاں ویمالادتیا راجہ حکومت کر رہا تھا اس نے اپنی بیٹی کو راجہ سے بیاہ دیکر جبراً اُس کو اپنا باجگذار بنالیا اور جہاندی تک شمالی علاقہ اپنے قبضہ میں لاکر لکادیپ اور مالدیپ کے جزائر کو بھی اپنی سلطنت میں داخل کرلیا۔ اسکے بیٹے راجندرا نے اڑیسہ کو فتح کیا اور وہاں کے راجہ اور اُس کے بھائی کو قید کرلیا اور گنگا تک اپنے سلسلۂ فتوحات کو بڑھاتا چلا گیا۔ چلوکیا خاندان کا چوتھا بادشاہ جیاسنہا ۱۰۱۸ء میں مرا اور اُس کا بیٹا سومیشورا الثانی المتخلص بہ آہاوملا تخت نشین ہوا یہ بہت بہادر اور جنگجو شخص تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ملک کے تینوں طرف چولا سلطنت احاطہ کی ہوئی ہے اور اس کا پلہ بھاری ہے تو فوراً اُس نے اپنا پایۂ تخت کلیانی میں منتقل کرکے چولا راجہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

۱۰۵۲ء میں راجندرا کے ولیعہد راجہ دھیراج کے مقابلہ میں بمقام کپم ایک عظیم الشان معرکہ ہوا جس میں ولیعہد مارا گیا اور گنگا بن و گنگا وادی کے دوصوبہ چولا سلطنت سے چھین لئے گئے۔

چولا اور چلوکیا سلطنتوں میں رقابت کی آگ بھڑکتی رہی اور کچھ ہی دنوں بعد ایک تخت نشینی کے سلسلہ میں پھر جنگ چھڑ گئی۔

کندورا کر نے جو راجہ راجہ اعظم کا نواسہ اور ویمالادتیا چلوکیا کا بیٹا تھا راجندرا اول کی بیٹی امنگا دیوی سے شادی کی تھی اُس کا بیٹا کلوتنگا تھا جو اپنے باپ کے تخت کا دعویدار تھا۔ لیکن چولا بادشاہ راجندرا نے جو اس کا ننہیال اور ماموں تھا سلطنت کی عام اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے کلوتنگا کے چچا وجیادیتیا کو گدی پر بٹھلایا شہزادے نے مایوس ہو کر سومیشورا اول سے امداد و اعانت کی استدعا کی۔ دبے ہوئے جذبات اور رقابتیں پھر تازہ ہوگئیں اور بجواڑہ و کول سنگم کے دو بڑے معرکوں میں دونوں سلطنتیں ٹکرا کر رہ گئیں اور کوئی تصفیہ نہیں ہوا سومیشورا نے ان لڑائیوں کو فیصلہ کن تسلیم نہ کرکے اعلان جنگ بھیجا کہ پھر سنگم کے پاس ہمارا تمہارا مقابلہ ہو لیکن خود بیمار ہو جانے کی وجہ سے لڑ نہ سکا اور شرم کے مارے دریا میں دونوں فوجوں کے روبرو جبکہ چلوکیا افواج کے بالجے جوش اور امنگ سے بجائے جارہے تھے ڈوب مرا۔

سومیشورا اول کے بعد اس کا بڑا بیٹا سومیشورا دوم تخت نشین ہوا لیکن اس کے چھوٹے بھائی وکرادتیا نے جس کی قابلیت کی وجہ سے راجہ کا ارادہ اسی کو ولی عہد نامزد کرنے کا تھا فوراً چولا کیمپ میں جاکر اپنے بھائی کے خلاف مدد طلب کی۔ ویرا راجندرا نے اپنی بیٹی کی شادی وکرادتیا سے کردی اور ساتھ ہی سومیشورا دوم کی سرحد پر چڑھائی کی۔ بدقسمتی سے جنگ کا کوئی تصفیہ نہ ہونے پایا تھا کہ ویرا راجندرا مرگیا اور اس کا بیٹا ادھی راجہ تخت نشین ہوا۔

وکرادتیا اپنے ارادے میں کامیاب ہونے کے لئے ادھی راجہ پر بھروسہ کئے ہوئے تھا لیکن کلوتنگا جو اپنی وراثت کے معاملہ میں راجندرا دوم کے تصفیہ کی وجہ سے بیٹھا تھا اب چولا سلطنت کا دعوی دار بن گیا۔ ادھی راجہ اس کا ماموں زاد بھائی تھا اور وکرادتیا علاوہ اس کا دھیالی رشتہ دار ہونے کے ماموں زاد بہنوی بھی تھا مگر باوجود ان سب رشتہ ناطوں کے اس نے اپنی فوج لے کر چڑھائی کردی اور ادھی راجہ کو تخت سے اتار کر اپنے چچا ویجادیتا چلوکیا کو بھی علیحدہ کردیا اور خود چولا اور مشرقی چلوکیا کا بادشاہ بن بیٹھا۔

بیچارہ وکرادتیا اپنے قسمت پر شاکر ہوکر بھائی سے جا ملا لیکن موقع کا منتظر رہا اور روز بروز اپنی ہر دلعزیزی بڑھاتا گیا۔ سومیشورا دوم اپنی نااہلی اور بیوقوفی کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے گرنے لگا آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ بڑے بڑے صوبہ دار بغاوت پر آمادہ ہوگئے جن میں سیونا چندرا یادو شمالی مغربی صوبہ دار اچوگی ودوم سندار سین بلبرگہ اور اری کیسری ہوئیسالہ اس کے خلاف ہوگئے ۱۰۷۶ء میں کلوتنگا نے چلوکیا سلطنت کے خلاف اعلان جنگ کردیا عین مقابلہ کے وقت سومیشورا دوم کی فوجوں نے بغاوت کرکے وکرادتیا دوم کو راجہ بنالیا۔ چار سال تک لڑائی جاری رہی اور دونوں فریق برابر لڑتے رہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا آخر ۱۰۷۸ء میں صلح ہوگئی۔

۱۱۱۶ء میں چلوکیا صوبہ دار گنگا وردی دیوا ہوئیسالہ نے ایک تصفیہ کن لڑائی میں چولا افواج کو شکست دے کر کاویری کے مشرق میں ہٹادیا۔ اس حصہ میں چولا حکومت اپنی جڑیں مضبوط کررہی تھی۔ اس شکست کا صدمہ کلوتنگا کو بہت ہوا اور وہ ۱۱۱۸ء میں مرگیا اس کے بعد وکرادتیا نہایت ہی عظیم الشان دبدبہ اور شان وشوکت سے سارے ملک پر جس میں ایک ظاہری جھلک اور آن بان پیدا ہوچکی تھی حکومت کرکے ۱۱۲۷ء میں مرگیا وکرادتیا کی موت چلوکیا سلطنت کی تباہی کا باعث نہیں ہوئی بلکہ اس کی بغاوت نے نہ صرف اس کے

چھوٹے بھائی جیاسنہا کو اس کی زندگی میں بغاوت کرنا سکھلایا بلکہ فوج کی بغاوت سے تخت پر بیٹھ کر اس نے بادشاہ شکن بننے کا سبق دیا۔ نمکحرامی اور ناشکری سکھلا کر نہ صرف اپنے خاندان بلکہ ملک پر ظلم کیا۔

چنانچہ اس کا بیٹا سومیشور اسوم ۱۱۳۰ء تک حکومت کرتا رہا لیکن جب تک برسر تخت رہا باپ کی حرکت کی سزا بھگتتا رہا علم و ہنر کی سرپرستی میں یہ راجہ مشہور ہے ظاہرا چلوکیا سلطنت اپنے عروج پر نظر آتی ہے لیکن اندر سے سبھی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ مواد تیار تھا صرف بھاپ دینے کی دیر تھی تہذیب و تمدن میں انتہا درجہ کی ترقی اسی زمانہ کے لحاظ سے ہو سکتی تھی.....

ہو چکی تھی۔ علوم و فنون میں نجوم۔ فلکیات — بلاغت معماری مصوری۔ شاعری آذری اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔

چلوکیا سلطنت کا خاتمہ ۱۱۳۸ء میں جگادیکا مالا تخت نشین ہو کر بارہ سال تک سلطنت کرتا رہا ۱۱۵۰ء میں تیلپا دوم تخت نشین ہوا۔ وکرمادتیا کا مرنا ہی تھا کہ بادشاہ گر صوبہ دار اپنی حیثیت بھول گئے اور ہر ایک بجائے خود اپنا دم بھرنے لگا برائے نام راجہ کی اطاعت تھی در اصل سارے ملک کے مالک حقیقی بھی صوبہ دار ہو چکے تھے ہر ایک موقع کا منتظر تھا دجالانے کاکا یا قوم پرفتح حاصل کر کے اپنا مطلب حاصل کیا اس نے اپنے آپ کو وزیر فوج مقرر کر کے اپنے بادشاہ کو قید کر ڈالا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۱۱۵۶ء تیلپا سندا کے پاس جا کر چھپ گیا۔ وجالا کو اپنی نمکحرامی کا بدلہ اسی وقت مل گیا۔ اس کے وزیر بسوا نے لنگایت مذہب کی بنیاد ڈال کر اپنے آقا کو خوش کیا جس کی وجہ سے وہ بطرف کر دیا گیا۔ بسوا نے فوراً بغاوت کر دی اور ملک میں ایک مذہبی انقلاب پیدا ہو گیا۔ وجالا مارا گیا لیکن اس کے بیٹے سویدیوا نے باپ کا بدلہ لیا بسوا کو شکست دے کر لیبا رتک اس کا پیچھا کیا جہاں اس نے خودکشی کر لی اور چنا بسوا نے اس کے بھتیجے سویدیوا سے صلح کر لی۔

مگر اس انقلاب نے چلوکیا خاندان کے چراغ کو بجھنے سے پہلے ایک دفعہ پھر بھڑکنے کی مہلت دی اور سومیشور اچہارم بوا جزل کی مدد سے جنوبی حصہ ملک پر قابض ہو کر ۱۱۸۹ء تک حکومت کرتا رہا۔ اسی سال پھر ایک انقلاب رونما ہوا جس نے ہمیشہ کے لئے چلوکیا خاندان کا خاتمہ کر دیا سومیشور اسرحد کے باہر کہیں چلا گیا جس کے بعد اس کا پتہ پھر کہیں نہیں لگا۔ یہ انقلاب اور بغاوتیں سب ایک اندرونی تحریک کا پتہ دیتی ہیں جس نے باسٹھ برس کے اندر ایسی عظیم الشان

اور قدیم سلطنت کو جو سات سو برس خاص دکن پر حکومت کرتی رہی آخر کار پرزہ پرزہ کر کے اڑا دیا۔
اب اس کی لاش کو مردار خوار جانوروں کی طرح حریص و طامع دشمن چاروں طرف سے آ کر نوچنے لگے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنی قومی اور موروثی سلطنت کو برباد کرنے میں خود ہی کوشش کی تھی۔ یہ وہ ناعاقبت اندیش صوبہ دار اور امراء تھے جنہوں نے اپنی ذاتی اغراض کے لئے ملک کی عام بہبودی اور فلاح کو پس پشت ڈال کر اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری گو ان خود غرض امراء کو آزادی حاصل ہو گئی لیکن ایک دن بھی ان کی زندگی آرام سے بسر نہ ہوئی آپس کی جنگ و جدال نے تمام ملک میں فتنہ و فساد قتل و غارت مچا دی جس کی وجہ سے ساری تہذیب و تمدن کی اعلیٰ عمارت گر پڑی اور بد تہذیبی ملک میں پھیل گئی چھوٹے چھوٹے جاگیر دار ان صوبوں میں ہر وقت بغاوت پر آمادہ رہے۔ اور ہر ایک اپنی آزادی اور خود مختاری کا دم بھرتا یہی حالت کم و بیش سو سال تک قایم رہی جس کے بعد تاریخ دکن نے ایک نیا ورق الٹا۔ ان حالات کا اندازہ کرنے سے پیشتر ہم کو اپنے ہمسایہ ملک یعنی جنوب بعید کی تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی چاہئے تاکہ واقعات کا تسلسل اور تعلق ذہن نشین رہے اور جو نتائج دور قدیم کے اختتام پر برآمد ہوتے ہیں ان کا اندازہ صحیح کرنے میں غلطی نہ ہونے پائے (باقی)

رُباعی

از

مولوی مودود احمد صاحب تشنہ حیدرآبادی

ہے ایک ہی شکل دوست اور دشمن کی — یہ جنیں تو ہم نے خوب پرکھی برتی
محشر کی وہ دیکھ لینگے آپا دھاپی — دنیا ہی میں ہو رہی ہے نفسی نفسی

ترانۂ ناظم

از نواب میر محمد علی خاں بہادر ناظم حیدرآبادی

خواہم آن چشمے کہ ہر دم جا بجا بینم ترا
بے حجابانہ بروئے انتہا بینم ترا

گر وزد باد بہاری در ہوا بینم ترا
در بیاردا بر اندر قطرہا بینم ترا

جانب گلشن چوں آیم رنگ تو بینم بہ گل
چوں روم در بوستاں در نخلہا بینم ترا

جلوۂ ذاتِ تو یابم یارب اندر ریگ دشت
سیر دریا چوں کنم در موجہا بینم ترا

جلوہ فرما زیر و بالا راست چپ پیش و پس
در زمیں بینم ترا فوق السما بینم ترا

ہمچو ناظم بگذرم من از خودی خویشتن
تا نباشد اے خدا کز خود جدا بینم ترا

غزل

از

حضرت آخگر حیدرآبادی

نالۂ بلبل نے کچھ ایسا اثر دکھلا دیا
گل نے اپنا راز دل وقت سحر دکھلا دیا

وہ کہیں جائیں خود آجائینگے جذبِ شوق میں
پہلی ہی الفت نے اونکو دل کا گھر دکھلا دیا

شوخیِ انکار اون کی امتحاں آمادہ تھی
سینہ اپنا چیر کر دردِ جگر دکھلا دیا

دل تھا بازارِ محبت میں متاعِ بیخودی
کیا ہوا اچھا کہ اوس کو یک نظر دکھلا دیا

شمع محفل غیر کے تھے خود ہی جلکر آگئے
آہِ آتشبار کا ہم نے اثر دکھلا دیا

طول تھا نامہ میرا ایک داستانِ درد و غم
پڑھ کے اوس کو نامہ بر نے مختصر دکھلا دیا

ہوگئی ہنگامہ آرا شوخیِ اندازِ حسن
کس نے آئینہ تجھے اے فتنہ گر دکھلا دیا

بدگمانی تھی کہ کوئی دوسرا تو یاں نہیں
چیر کر سینہ دل اپنا کاٹ کر دکھلا دیا

شیخ کے کہنے پہ آخگر تم نجانا چاہیے
کس طرف تھا راستا اسنے کدھر دکھلا دیا

مرزا غالب کا فارسی کلام

از

مولوی مودود احمد صاحب تشنہ عیدرآبادی

مرزا غالب کی فارسی شاعری جو ان کی اردو شاعری سے کہیں بلند پایہ و اعلیٰ مرتبہ ہے اور جس پر مرزا غالب کو وہ فخر و ناز تھا کہ اپنے حریف مقابل سے فرماتے ہیں ع فارسی بین تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ، بگزر از اردو کہ رنگ من اینست، ابھی تک کس پرسی کی حالت میں ہے حالانکہ اہل علم و ادب میں غالب سے جو شیفتگی ہے اس کا اقتضا یہ تھا اس وقت تک غالب کے فارسی کلام اور بالخصوص فارسی غزلوں کے دو تین ایڈیشن شائع ہو جاتے اور ایک دو شرحیں بھی لکھی جاتیں۔ لیکن بے توجہی کا بڑا سبب خود فارسی زبان سے عام بے توجہی اور فارسی ادبیات کے صحیح ذوق کی زوال پذیری ہے غالب پرست بھی جو ان کے ہر اردو شعر پر خواہ وہ معنی آفرینی سے معمور ہو یا صرف لفظی آب و تاب والا بے معنی اور پھیکا، سر دھنتے ہیں، ان کے فارسی اشعار کی طرف سرے سے متوجہ نہیں، مولوی مودود احمد صاحب تشنہ کی یہ توجہ دہانی خدا کرے سبھی شکور ہو۔ اور ہماری جامعات کے طلبا سنین ادبیات دیکھیں کہ فارسی سی اجنبی زبان میں مرزا غالب غریب چہ سخن ہائے گفتنی دارد۔ (مجلۂ مکتبہ)

یوں تو ہماری قوم کا جمود و خمول ایک کھلا ہوا راز ہے جس کے لئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ جو اسٹیج پر آکے درد انگیز نالے کھینچ کر حاضرین کو تڑپا دینے میں غضب کا کمال رکھتے ہیں۔ اور جن کے دامن عملیت کے موتیوں سے خالی ہیں، اُن کے دلوں کو ٹٹولئے تو لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تفسیر نظر آئیں گے۔ ایسی صورت میں سننے والے خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے اُسی اثر میں ڈوبے ہوئے ہوں گے جو اُن پر ان کی سحر افریں پر سوز تقریر نے کیا ہوگا۔

یہی نہیں کہ عوام یا معمولی شد بد کے لوگ اس جادو سے مسحور ہوئے ہوں۔ بلکہ وہ بھی جو اپنے دائرہ امکان میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اسباب مہیا۔ سرمایہ فراہم۔ اور کافی مہلت بھی نصیب ہے

اگر آپ انہیں دیکھیں گے اور غور دیکھیں گے تو یہی پائیگا۔ نہ کچھ خیال ہے نہ کچھ فکر ایک سوچ اور بے محل سوچ مہوت ہیں جس کے تعلق کی باگ معلم الملکوت کے عقل فساد کے ہاتھ میں ہے۔ لاحول نہ بھیجئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ تلاوت فرمائیے۔

یوں تو زمانے نے بے حد پلٹے کھائے۔ اور بہت سے اہل زمانہ انقلاب کے بھنور میں پڑ کر فنا کے گھاٹ اتر چکے۔ لیکن ایک متلاشی کو اگر وہ ہمت نہ ہارے تو اب بھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ صرف دل پر لینا ہے اور بس مراد حاصل ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کرے کون؟ کیوں کہ کرنے والوں کو کچھ بھی میسر نہیں۔ اور جن کو کرنا چاہیئے تھا ان کے خزانے میں سب کچھ ہے۔

کسی نئے نظریئے کا قایم کرنا۔ یا کسی نئے انکشاف کی تکمیل میں منہمک ہونا کچھ ضرور نہیں۔ محض توجہ کو یکسو کر کے ٹھنڈے دل سے اگر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ کسی نامور مصنف کی طرز فکر کو جس نے خون دل پی پی کر تخیلات عالیہ کے نقوش صفحات کاغذ پر مرتسم کئے تھے۔ اور جو حوادث روزگار سے پراگندہ۔ ابنائے زمانہ کی غفلت سے منتشر ہو گئے ہیں سمیٹ کر یک جا اور مکمل کر لیتا ہے۔

گو بہت سے کتب خانے یا تو برباد ہو گئے۔ یا دیمک اور کیڑوں کے عنایت سے تودۂ خاک بن گئے یا کسی پنساری کی دوکان میں سوئے سلف کی پڑیوں کے کام آ گئے۔ تو بھی ابھی ایسے چند کتب خانے باقی ہیں کہ اگر تھوڑی سی تکلیف گوارا کر لیں اور اوقات فرصت کا کچھ حصہ جو محض برباد ہو رہا ہے اس کام میں لگا دیں تو ایک یادگار مٹنے سے بچ جاتی ہے۔

دہلی پانی پت، لاہور، علی گڈھ، اعظم گڑھ، لکھنؤ، رام پور، لوہارو، (نواب احمد سعید خاں طالب دہلوی کے کتب خانے سے کچھ بھی امید نہ رکھئے) یہ ایسے مقامات ہیں۔ جہاں نہایت آسانی کے ساتھ اپنا منشا پورا ہو سکتا ہے۔ اور نہایت سہولت سے کام بن جاتا ہے۔ اتنا ہونے پر بھی افسوس ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری اب کہاں سے پیدا ہوں گے۔ خدا اُن کو بخشے انہوں نے موقع ملتے ہی غالب کے اردو کلام کو مکمل کر دیا اور رخصت ہو گئے۔ بدقسمتی سے ملک میں اب کوئی ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ہے ہی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو ایک ایسی زبان کے کلیات پر جو فارسی میں ہے۔ اور جو ہندوستان میں تقریباً مر چکی ہے کون توجہ دینے لگا۔

انصاف شرط ہے۔ بُرا نہ مانئے۔ یہ بحث اس لئے نہیں چھیڑی گئی کہ نزاع لفظی پیدا کی جائے کسی کی ذات آماجگاہ ملامت بنائی جائے۔ اگر ہمارے عوض آپ ہی کو یہ خیال آتا تو بے کم و کاست آپ بھی یہی لکھتے جو اس وقت پڑھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یقین جانئے کہ ہم کو غالب کے ساتھ

(بجز اخوت اسلامی) اور رشتہ ہے اور نہ شاگردی کا واسطہ محض خدا پر نظر کر کے چند سطریں لکھ رہے ہیں۔ مگر اُسی کو خبر ہے کہ تا دمِ تحریر دل میں کیا کیا موج زن ہے۔

وہ شعرا جن کے نام اب زبانوں پر نہیں۔ یا اُن کی طرف سے بیپروائی کرنے والے مغفور ہو گئے ہیں۔ ان کو چھوڑ دیجئے۔ لیکن جو مشہور ہیں۔ کلام موجود ہے۔ اور ان کے تلامذہ کا سلسلہ آج بھی قایم ہے۔ انھیں کو لیجئے۔ بتلائیے۔ کہ آپ نے ان کے ساتھ کس قدر اعتنا کی۔ دل پر ہاتھ رکھکر فرمائیے آہ!!! بے فکری کا آخری دور ہے۔ غلامی کی زنجیریں پیر پڑنے کو آگے بڑھ رہی ہیں۔ مولوی سید شاہ محمد ابراہیم صاحب (مغفور) کے دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ایک کتاب کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ گل رعنا۔ سید حسین بھی مجلد ہیں۔ اتفاق اس کو کہتے ہیں کہ مطبع نولکشور کا چھپا ہوا کلیات فارسی بھی ساتھ ہے۔ دیکھتے ہیں تو اُس میں کچھ قصیدے۔ غزلیں۔ قطعات رباعیات سبھی ہیں۔ اور یہ ایسے ہیں کہ جو مطبوعہ کلیات میں درج نہیں ہیں۔ بس پھر کیا تھا بمصداق ع دیوانے کو ایک ہو بہت ہے۔ نقل کر لی اور کلیات میں اُس کے موقع سے چسپاں کر دیا۔ یہی نہیں اور جہاں جہاں سے یہ بکھرے ہوئے موتی ملے مالا پرو دی۔ اب ہماری پاس جس قدر بھی ہے وہ ہماری ذاتی کد و کاوش کا نتیجہ ہے۔ ہماری گردن زیر بار احسان نہیں ہے

اِس وقت جو نسخہ ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ ایک مدت سے چاہتے تھے کہ اس پر مضمون لکھیں اور کوئی وسیع النظر مطبع ملجائے تو یہ امانت اُس کے حوالے کر دیں۔ الحمد للہ کہ اب دن پلٹے۔ مکتبہ ابراہیمیہ نے انجمن نامی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اپنا ایک مطبع بھی جاری کر لیا۔ اور سب سے بڑی خوبی کی بات تو یہ ہے کہ اسی کے اہتمام سے مسلم الثبوت اہل قلم کے زیر ادارت ایک مجلہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے اتفاقاً تھوڑی سی دولت بھی ہاتھ آگئی۔ خیال آیا کہ اپنے دل میں ایک عرصے سے جو پوشیدہ ہے۔ اُسے تجویز کے ذریعے ظاہر کر دیں۔ لہذا موقع کو غنیمت جان کر خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے اپنا فرض ادا تو کر دیا آگے اللہ مالک ہے۔

قبل اس کے کہ قلم کو ہاتھ سے رکھ دیں۔ ہم اُن کتابوں کے نام بھی گنا دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ عود ہندی، اردوئے معلی، یادگار غالب و پنجاہ کے علاوہ موقر رسالہ صلائے عام دہلی سے ہفت بند زمانیہ نقل کر کے شریک کر دئے ہیں۔ کسی دوست نے حضرت غوث علی شاہ صاحب قلندر کا تذکرہ غوثیہ مطالعے کو دیا تھا۔ اس میں شاہ صاحب نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر کر کے چند اشعار نقل کئے تھے۔ مقابلے کے وقت معلوم ہوا کہ کلیات میں نہیں ہیں۔ اس لئے انھیں

بھی درج کر لیا۔ یہ نہیں کہ شوق کے مارے غلط سلط رطب دیابس جو جی میں آیا۔ غالب کا نام ہوتے سے لکھ لیا ہو۔ نہیں۔ بلکہ بہت تحقیق اور پورا اطمینان ہونے کے بعد۔ آپ واقف ہیں کہ یہ زمانہ انٹ وسنٹ لکھنے کا نہیں ہے۔ ایک بات اور ہے۔ وہ یہ کہ۔ ہماری تلاش میں بجز اس مقطعہ کے جو یادگار غالب میں حالی نے درج کیا ہے سہ

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خدا نمرد داشت

مایوس ہو کر اسی مقطعہ کو ہم نے بھی ردیف میں لکھ لیا کہ تکمیل ہو۔ مگر افسوس کہ پوری غزل ہمدست نہ ہوئی۔ جن کے دلوں میں سچا درد ہے۔ اُن پر لازم ہے کہ وہ اس کلیات کی تکمیل کریں اور خود ممنون ہوں۔

غالب! ہاں ہاں! غالب!! ہندوستان کے عوض۔ اگر انگلستان کے کسی شہر میں ہوتا تو۔ آج آپ دیکھتے کہ نہ صرف اس کے مخطوطات ہی تمام وکمال شایع ہو جاتے۔ بلکہ اس کے قلمی مسودات۔ اس کا مکان۔ اور اُس مکان کی ساری چیزیں۔ حتیٰ کہ اُس کی قبر بھی جس میں کہ وہ اس وقت محوِ استراحت ہے۔ قوم کے لئے قومی سرمائے سے محفوظ کر لی جاتیں جن کو ایک سیاح نہایت شوق اور بے حد دلچسپی کے ساتھ مطالعہ و ملاحظہ کیا کرتا۔ چوں کہ یہ بدقسمت ہندوستان میں ہوا۔ اس واسطے میر و سودا وغیرہ کے مزار تو فنا ہو ہی چکے ہیں۔ چند دنوں میں غالب کی لحد کو بھی مٹا ہوا پائیے گا۔

ذیل میں وہ اشعار درج ہیں جن کو ہم نے اپنے ذوق سلیم کی رہنمائی میں منتخب کیا ہے۔

غزل

نقش پر خاتم ز حرفِ بے صدا انگیختہ — شورِ در عالم ز حسنِ بے نشاں انداختہ
چرخ را در قالبِ ابداع در دار یختہ — خاک را بر نطعِ پیدائی ستاں انداختہ
عاشقاں در موقف دار و رسن واداشتہ — غازیاں در معرضِ تیغ و سناں انداختہ
زنگہا در طبعِ اربابِ قیاس آمیختہ — نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیاں انداختہ
آں چناں شمعے براہِ شب روانِ افروختہ — ایں چنیں گنجے بجیبِ بے دلاں انداختہ
یا چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی — مژدہ را از خویش در دریا بکراں انداختہ

آتشے از روئے گل ہائے بہار افروختہ — شعلۂ در جانِ مرغِ صبح خواں انداختہ

وجلهٔ در ساغرِ معنی طرازان ریخته — رشحهٔ در کاسهٔ دریا دکان انداخته
سر به تیغ از دوشِ جانبازان سبک برداشته — بار بر دل های نامردان گران انداخته
جز بدین آب آتشِ از دشت نتوان سرد کرد — کعبه را جوئے بهشت از ناودان انداخته
جز بدین الماس نتوان این چنین دانه شکست — رخنه از اسلام در کیشِ فغان انداخته

لفظ کهن و معنیٔ نو در ورقِ من — گوئی که جهانست و بهارست جهان را

آئینه به پیشِ نظر و جلوه مرادان — دل پر هوس و صاحبِ خلوت کده تنها

ز حق علیه پزیرد چو ماهتاب ز مهر — بخلق بهره رساند چو آفتاب به ما

در راه عشق سینه زمین سائی دیده ایم — آن نافه را لاکوه بکوهاں برابر است
با چاره گر بگوئے که تیمار ریش کش — در دیست در دلم که بدرماں برابر است
نے وعدهٔ نه پرسش رازے نه شکوه — دارم زنامه که بعنواں برابر است
ذاتِ حق است و احد و هستیت عین ذات — بزم جهاں به مجمع اعیاں برابر است

دیدهٔ بر نقطِ سبزه خطِ جاده پدید — آسماں است زمیں کاهکشانے دارد

غزلیات

خامشی ماگشت بد آموز پنهاں را — زیں پیش دگر نه اثرے بود فغاں را
منت کشی تاثیر و فائیم که آخر — این شیوه عیاں ساخت عیار دگراں را
مرغے که برون نامد و با خانه چه نامد — بیهوده دراندام تو جستیم میاں را

ماهائے گرم پرا زیم نمیش از نمایوے — سایه همیچوں رود بالائے رود اجالا

ارگداز یک جہان ہستی صبوحی کردہ ایم — آفتابِ صبحِ محشر ساغرِ سرشارِ ما
چاک را اندر گریبانِ جہات افگندہ ایم — بے جہت بیرون خرام از پردہ پندارِ ما

محو کن نقشِ دوئی از ورقِ سینۂ ما — اے نگاہت الف صیقل آئینۂ ما
مختشم زادۂ اطرافِ بساطِ عدمیم — گوہر از بیضۂ عنقاست بہ گنجینۂ ما
نستِ مستانِ ترا تفرقہ بدر و ہلال — بادہ مہتاب بود در شبِ آدینۂ ما

جوئے از بادہ و جوئے عسل دارد خلد — لبِ لعلِ تو ہم این ست و ہم آنست مرا

سخنِ ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر — نشود گرد نمایان رخِ معنی رنگِ ما

غزل

نقشے ز خود براہ گزاشتہ ایم ما — بر دوست راہِ ذوقِ نظر بستہ ایم ما
با بندۂ خود این ہمہ سختی نمی کنند — خود را بزور بر تو مگر بستہ ایم ما
دل مشکن و دماغ دلِ خود نگاہ دار — کاین خود طلسمِ دود دگر بستہ ایم ما
بر روئے حاسدان در دوزخ کشودہ شک — از بہرِ خویش جنتِ در بستہ ایم ما
سوزِ ترا روان ہمہ در خویشتن گرفت — از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما
گوئی وفا مدار و اثر ہم بما مگر — دین سادگی کہ دل باثر بستہ ایم ما
تا در وداعِ خویش چہ خون در جگر کنیم — از کوئے دوست رختِ سفر بستہ ایم ما
ہر جا ست نالہ ہمتِ ما حق گزار اوست — حرزے بیالِ مرغِ سحر بستہ ایم ما

از خوانِ نطقِ غالبِ شیرین سخن بود
کاین مایہ زلہ ہا ز شکر بستہ ایم ما

در گردِ غربت آئینہ دارِ خود یم ما — یعنے زبے کسانِ دیارِ خود یم ما
دیگر زسازِ بے خودئ ما صدا مجوئے — آوازے از گسستنِ تارِ خود یم ما

از بسکه خاطر هوس گل عزیز بود — خون گشته ایم و باغ و بهار خودیم ما
ما جلوه وقف خویش و دل ما زما پر است — گوئی هجوم حسرت کار خودیم ما
از جوش نظره همچو سرشک آب گشته ایم — اما همان به جیب و کنار خودیم ما
مشت غبار ما است پراگنده سو به سو — یارب به دهر در چه شمار خودیم ما
یا چون تو ئی معامله بر خویش منت است — از شکوهٔ تو شرمسار خودیم ما
روئی سیاه خویش ز خود هم نهفته ایم — شمع خموش کلبهٔ تار خودیم ما
در کار ما است ناله و در هوای او — پروانهٔ چراغ مزار خودیم ما
خاک وجود ما است بخون جگر خمیر — رنگینئ تماشی غبار خودیم ما
هر کس خمیر حوصلهٔ خویش می بود — بر مستئ حریف و خمار خودیم ما
تار نگاه پیرو ما سلک گوهر است — رفتار پائے آبله دار خودیم ما

غالب چو شخص و عکس در آئینهٔ خیال
با خویشتن یکے و دو چار خودیم ما

چه پرسی و چه حیرانی که هنگام تماشایت — نگاه از بیخودی ها دست و پا گم کرد و مژگان شد

رفته بودی و گر از جا به سخن سازئ غیر — منت از بخت که خاموشئ ما یاد آمد
دیده پر ریخته و از قفسم کرد آزاد — رحم در طینت ظالم ستم ایجاد آمد

گزشته کار من از رشک غیر شرمت باد — ببزم وصل تو خود را ندیدنم بنگر
شنیده ام که نه بینی و ا امیدنیم — ندیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر

خان بہادر

از جناب ڈاکٹر اعظم کریوی

سید فصاحت حسین تھے تو انسپکٹر لیکن درجہ اول کی کوتوالی پر تعیناتی ہونے کی وجہ سے آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈیٹ بنا دیے گئے تھے۔ پولیس میں کانسٹبل کی حیثیت سے بھرتی ہوئے لیکن اپنی کارگزاری سے بیس سال کے عرصہ میں اس عہدہ پر پہنچ گئے پڑھے لکھے تو بہت کم تھے لیکن پھر بھی اپنے ماتحتوں پر اپنی علمیت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے۔ جب سے انگریزی میں "یس"، "نو"، لکھنا اور بولنا سیکھ گئے تھے اس وقت سے تو اور بھی اپنی قابلیت کے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وردی پہننے کا آپ کو بہت شوق تھا۔ شاید اس میں ان کی کوئی مصلحت تھی ورنہ سیڈول ہونے کی وجہ سے جب وہ وردی پہن لیتے تو اور بھی برے لگتے کبھی کبھی رشوت بھی لیتے تھے لیکن اس احتیاط سے کہ حکام بالا تک اس کی خبر نہ پہنچنے پائے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں آپ نے نہایت استقلال سے کام لیا تھا جس سے ان کی شہرت میں اور چار چاند لگ گئے حکام کی حضوری میں شاید وہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول گئے تھے کیونکہ روزہ نماز سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا لیکن سرکار کی اتنی خیر خواہی پر بھی بدقسمتی سے ان کو کوئی خطاب نہیں ملا تھا جس کا ان کو دلی قلق تھا جب عدم تعاون کی تحریک مردہ ہو گئی تو کوتوال صاحب کو امید ہوئی کہ اب وہ ضرور کوئی خطاب پا جائیں گے جنوری کا مہینہ جوں جوں قریب آتا جاتا تھا ان کی بیتابی بڑھتی جاتی تھی خطاب ملنے کے لالچ میں افسروں کا تو کیا ذکر وہ ان کے خادموں کو بھی ڈالیاں نذر کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔

(۲)

آج نوروز ہے۔ کوتوال صاحب حکام ضلع کی سلامی سے فراغت پا کر اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر دراز حقہ پی رہے تھے کہ یکایک کوتوالی کے چودھری یعنے دیوان جی کمرہ میں داخل ہوئے بڑے ادب سے "سلوٹ" کیا اور کہا حضور کو "خان بہادر" کا خطاب مبارک ہو۔ اتنا کہہ کر دیوان جی نے سرکاری گزٹ جس میں خطابات کی فہرست شائع ہوئی تھی کوتوال صاحب کے سامنے رکھدیا۔

کوتوال صاحب خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے انہوں نے گزٹ کو بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولے "کہاں لکھا ہے ——— دکھاؤ دکھاؤ، مجھے جلدی دکھاؤ واللہ سرکار نے میرے ساتھ انصاف کیا مگر ٹھیرو۔ خوب یاد آیا میں انگریزی میں اتنا باریک خط نہیں پڑھ سکتا۔ میری عینک اس وقت میرے پاس نہیں ہے خدا جانے میں نے کہاں رکھدی اور تم بھی تو انگریزی نہیں پڑھ سکتے خیر کوئی پرواہ نہیں کسی انگریزی داں داروغہ جی کو فوراً بلاؤ۔"

کوتوال صاحب انتہائے مسرت سے پاگل ہو رہے تھے ان کی بدحواسی پر دیوان جی مسکراتے ہوئے انگریزی داں داروغہ کو بلانے کمرہ سے باہر نکلے لیکن ابھی وہ دس قدم ہی گئے ہوں گے کہ کوتوال صاحب یہ کہتے ہوئے کمرہ سے نکل پڑے "دیوان جی ٹھیرو میں گزٹ پڑھانے کے لئے خود جا رہا ہوں کوتوال صاحب دوڑتے ہوئے دیوان جی سے آگے نکل گئے جس عزت اور ادب سے اس وقت وہ گزٹ کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے شاید اس سے زیادہ وقت سے کوتوال صاحب نے کلام پاک کو بھی نہ اٹھایا ہوگا۔ خدا خدا کر کے انگریزی داں داروغہ جی نے گزٹ پڑھا "خان بہادر" کا خطاب پانے والوں میں سید فصاحت حسین آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا بھی نام لکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے "مبارک باشد" کی صدائیں آنے لگی۔

جب دوستوں سے فرصت ملی تو کوتوال صاحب سیدھے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کے بنگلے پر پہنچے کوتوال صاحب ایک مرتبہ صبح کے وقت صاحب سے شہر کی خیر عافیت کہہ آئے تھے صاحب نے خلاف معمول دوبارہ اپنے بنگلہ پر کوتوال صاحب کو دیکھکر کہا ———

"کوتوال صاحب کیا بات ہے"

کوتوال صاحب نے تن کر "سلوٹ" کیا اور کہا "کیا حضور نے آج کا گزٹ نہیں ملاحظہ فرمایا۔ جس میں سرکار نے مجھے خان بہادری کا خطاب مرحمت فرمایا ہے"

صاحب بہادر۔ "خان بہادر ہو گیا؟ ہم گزٹ نہیں دیکھ سکا ——— بڑا خوشی کا بات ہے"

کوتوال صاحب۔ یہ سب حضور کی مہربانی اور سفارش کا اثر ہے جس کا میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں

صاحب بہادر۔ نو۔ نو۔ ہمارا تھینکس کچھ نہیں۔ آپ گورنمنٹ کو تھینکس دیے سکتا ہے۔ بہت اچھا خطاب ہے۔ ہم سچ بولتا ہے ہم نے تمہارا سفارش بھی سرکار سے نہیں کیا تھا۔

کوتوال صاحب ہمارے تو سرکار حضور ہی ہیں آپ نہ سفارش کرتے تو مجھے خطاب مل ہی نہیں سکتا تھا۔

صاحب بہادر۔ نہیں! نہیں۔ ہم سچ بولتا ہے ہم نے سفارش نہیں کیا تھا۔
گوتوال صاحب نے یقین نہ کیا انہوں نے سوچا حاکم لوگ میں خفیہ باتیں نہیں بتایا کرتے صاحب کو سلام کر کے جب کوتوالی واپس ہوئے اور اپنے گھر میں گئے تو بیگم صاحبہ نے بھی مبارکباد دی۔ کوتوال صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کڑک کر کہا "سنو بیگم مجھے کوئی معمولی خطاب نہیں ملا میری خواہش ہے کہ میں اس خوشی میں ایک دعوت کروں جس میں اپنے تمام حکام و احباب کو بلاؤں۔
بیگم صاحبہ نے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔ اچھے آئے دعوت کرنے والے آپ کے تو دوست احباب سب آئیں لیکن میری سہلیاں کہاں جائیں۔
کوتوال صاحب۔ ارے تو میں نے منع کب کیا ہے اپنی سہلیوں کو شوق سے بلاؤ۔ اب اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کون موقع ہو سکتا ہے۔
بیگم صاحبہ، پھر بولیں۔ "اچھا یہ تو بتلائے اس خطاب کے ساتھ سرکار آپ کو کتنا انعام دیگی"
کوتوال صاحب نے کہا بیش لگی۔ کہیں خطاب میں روپیہ بھی ملتا ہے۔
بیگم صاحبہ۔ "اگر روپیہ نہیں ملتا تو پھر کیا ملتا ہے"
کوتوال صاحب۔ "ایک سرٹیفکٹ اور شاید ایک تمغہ"
بیگم صاحبہ نے جھنجلا کر کہا۔ "تو میں ایک کاغذ کے لئے اتنا ہلڑ مچ ہونے دوں گی۔ خالی خولی خطاب سے کیا ہوتا ہے"
کوتوال صاحب نے مسکرا کر کہا۔ تم ان باتوں کو کیا سمجھو۔ خطاب سے بڑی عزت اور شہرت ہوتی ہے خطاب کے لئے لوگ ہزاروں روپیے برباد کر دیتے ہیں خطاب کا ملنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اب میری عزت سرکار دربار میں بڑھ جائے گی لاٹ صاحب مجھے کرسی دیں گے۔ یہ کہکر کوتوال صاحب نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پیار سے کہا۔ خوشی کرو خوشی۔ اب تم کو تمام دنیا "خان بہادرن" کہے گی اور مجھ کو خان بہادر۔

(۳)

آج کوتوال صاحب کے یہاں حکام ضلع و روساء شہر کی دعوت ہے۔ کوتوالی کے وسیع صحن میں بڑا عالیشان شامیانہ نصب کیا گیا۔ ستونوں پر رنگین ریشمی کپڑا لپٹا گیا اور جھاڑ فانوس سے شامیانہ کو زینت دی گئی۔ صدر دروازہ پر "خوش آمدید" کا سنہری تختہ لٹکایا گیا۔ کوتوال صاحب

خود جلسہ کا انتظام کر رہے تھے ان کے ساتھ ہی خوشی میں ساتھ دینے والے اور مصیبت میں دشمن بن جانے والے کوتوال صاحب کے کچھ خوشامدی اہلکار بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بیچارے بیگاروں سے کام لے رہے تھے۔

ہندوستانی کھانوں کے علاوہ انگریزی کھانوں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ "شمپین" "آئیکشا نمبرا" کے علاوہ اور بھی کئی اقسام کی نفیس ولایتی شراب صاحب لوگوں کے لئے منگوائی گئی تھی غرضیکہ کوتوال صاحب نے اس دعوت کے لئے اپنا روپیہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ شام کے وقت دعوت ہونے والی تھی قریباً دو بجے دن کے وقت ہفتہ واری گزٹ آیا اس کو دیکھکر کوتوال صاحب کو خیال گزرا کہ دیکھوں تو کہیں خطاب کے ساتھ میری ترقی بھی تو نہیں ہوگئی۔ اس خیال کے آتے ہی کوتوال صاحب نے فوراً انگریزی داں داروغہ جی کو بلانے کا حکم دیا۔

گزٹ اردو میں بھی چھپتا ہے لیکن بڑے لوگ اردو کا اخبار پڑھنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں شاید اسی خیال کو مدنظر رکھ کر کوتوال صاحب اردو کا گزٹ نہیں منگواتے تھے لیکن ان کے ماتحت اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ کوتوال صاحب انگریزی نہیں جانتے وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کوتوال صاحب انگریزی بھی جانتے ہیں انگریزی ہی گزٹ منگاتے تھے۔ بہر حال کوئی وجہ بھی ہو کوتوال صاحب اردو کا گزٹ نہیں منگاتے تھے جب داروغہ جی آگئے تو گزٹ کھول کر پڑھنے لگے پہلی صفحہ پر جلی قلم سے لکھا تھا تصحیح

گزشتہ گزٹ میں سید فصاحت حسین صاحب آنریری ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا نام غلطی سے "خان بہادر" کا خطاب پانے والوں کی فہرست میں درج ہوگیا تھا لہذا بذریعہ اس حکم کے اطلاع دی جاتی ہے کہ مناسب تصحیح کر لی جائے۔

کوتوال صاحب پر گویا بجلی گر پڑی وہ یہ خبر سن کر بدحواس ہوگئے ان کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ عیش و عشرت کا جلسہ درہم برہم ہوگیا اس گزٹ نے جس نے کبھی کوتوال صاحب کو آرام کرسی سے اٹھا کر عالم خوشی میں آسمان پر پہنچا دیا تھا آج رنج و غم میں کرسی سے نیچے گرا کر سرنگوں کر دیا۔

غزل

از
حضرت صفی اورنگ آبادی

مشورے کر کر کے لوگوں میں مجھے رسوا کیا
واہ تجھ سے آس کیا تھی اور تو نے کیا کیا

دوسروں سے پوچھ تیرے منہ پہ آنکھیں ہیں نہیں
کس نظر سے ہم نے تجھ کو آج تک دیکھا کیا

عشق کی پہچان اگر یہ ہے کہ ہو دونوں طرف
پھر یہ جو کچھ آج تک ہم نے کیا تو کیا کیا

ہم رہے بھی انکی محفل میں تو بس ایسے رہے
ضبط نے گونگا بنایا صبر نے اندھا کیا

کچھ پشیمانی ہے کچھ حیرت کہیں تو کیا کہیں
آپ اُس کے ہو گئے ہم یا اُسے اپنا کیا

دوست کا جلوہ کہاں یہ بدنصیب آنکھیں کہاں
جو دکھایا میری قسمت نے مجھے دیکھا کیا

اُف رے ضد، اللہ ری ہٹ، یہ طبیعت، یہ مزاج
جو کہا تھا آپ نے آخر اُسے پورا کیا

اک بلا ہے عشق۔ پھر چاہے وہ ہو اولاد کا
دیکھئے تو! حضرت یعقوب کو اندھا کیا

میں بُرا ہوں غم نہیں لیکن مرے اللہ نے
آپ کو اچھا بنایا۔ یہ بہت اچھا کیا

اب تمھاری دوستی کو دونوں ہاتھوں سے سلام
جو ہوا اچھا ہوا۔ جو کچھ کیا، اچھا کیا

اب تو جینے کی دعائیں مانگتا ہوں رات دن
اے صفی اُس کی قسم جس نے مجھے پیدا کیا

عرب اور ان کے میلے

مولوی ابوالمکارم محمد عبدالکریم صاحب نعمانی

تمہید | تمدن کی برکتیں ایک قوم دوسری قوم سے حاصل کیا کرتی ہے اور اس طرح تمدن کا چشمہ فیض ایک ملک سے دوسرے ملک میں ایک قوم سے دوسری قوم میں جاری و ساری ہوتا ہے یہاں تک کہ تاریخ متداول و مشترک رسوم میں سے بعض کی ابتدا اس طرح ٹھیک طور پر نہیں بتا سکتی کہ اس رسم کی بنا سب سے پہلے فلاں قوم نے روئے زمین پر ڈالی

تمدن کی سب سے پہلی برکت میلے بازار یا مجمع ہیں مختلف جگہ کے باشندوں کو جب کبھی مقررہ اوقات میں ایک جگہ جمع ہونے کی ضرورت پیش آتی ہے تو ایسے مجمع، بازار یا میلے کا انعقاد ہوتا جاتا ہے دور دور کے رہنے بسنے والے اپنے متداول مقاصد اور مشترک ضروریات کے پورا کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

یہ مجمعے تمدن کے ابتدائی دور میں مذہبی رسوم کے ادا کرنے یا تجارتی کاروبار چلانے تک محدود تھے ان مجمعوں میں کاریگر کو خریدار اور خریدار کو چیز سہولت سے مل جاتی اسی وجہ سے لوگ باوجود بُعد بعید کے راستہ کے شدائد اٹھا کر نہایت شوق و ذوق سے ایسے مجمعوں میں شریک ہوتے کیونکہ ایسا مقام ہر جگہ نہیں ہوتا جہاں ہر کمال کیلئے جوہر شناس اور ہر جوہر شناس کے لئے گوہر کمال میسر آئے۔

ارتقائے تمدن کے ساتھ ساتھ اس قسم کے مجمعوں کی ہیئت و ضرورت میں بھی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ ان کی ابتدائی ہیئت اور انتہائی حالت میں اس قدر بُعد بڑھا کہ بُعد المشرقین ہو گیا۔ غرض کہ موجودہ سیاسی، مذہبی، علمی معاشی اور دوسرے مجمعوں کا ہیولا یا پیش رو یہی قدیم مجمع ہیں

اس طرح کے بازار کو عرب "سوق" کہتے اور اس سے ایسی جگہ مراد لیتے ہیں جہاں شہری، قصباتی و ملکی آفاقی ہر قسم کے لوگ جمع ہو کر اوقات معینہ میں بیع و شری کریں ایسے بازاروں کا دستور گاؤں اور شہروں میں موجودہ تمدن کے پہلے سے آج تک چلا آتا ہے۔

مختلف ممالک کے مجمع | ترکستان میں دستور ہے کہ ہفتے میں دو دفعہ یا ایک دفعہ ہر شہر میں اور اکثر دیہات میں

مرزا اکبری صفحہ ۱۵۲

بازار لگتے ہیں اس آبادی کے اور اکثر پانچ پانچ چھ چھ کوس آس پاس کے لوگ پچھلی رات سے گھروں سے نکلتے ہیں دن نکلے اس مقام پر آکر جمع ہوتے ہیں۔ عورتیں برقع سروں پر نقابیں منہ پر ابریشم سوت ٹوپیاں رومال پھلکاری ضرورت کی ساری جو کچھ ہو بیچنے کو لاتی ہیں مرد ہر قسم کے پیشہ ور اپنے جنس سے بازار کو گرم کرتے ہیں مرغی اور انڈے سے لیکر گران بہا گھوڑوں تک اور گزی گاڑھے سے لیکر قیمتی قالین تک میوہ جات سے لیکر اقسام غلہ بھس اور گھانس تک تیل گھی مسگری بجاری۔ لہاری کے کام یہاں تک کہ مٹی کے باسن تک سب موجود ہوتے اور دو پہر میں سب بک جاتے ہیں اکثر لین دین مبادلے میں ہوتے ہیں[1]

شہر اشوریہ اور بابل کے مندروں میں سالانہ مقررہ اوقات پر دیوتاؤں کی پرستش کے لئے لوگ جمع ہوتے اسی ضمن میں تاجروں کا بھی مجمع ہو جاتا۔

نواح لندن کے سب سے زیادہ مشہور میلے بارتھولومو گرینج کیمبرول۔ قیرلاپ اور چارلٹن کے تھے آخر ان کے نتائج اور ان سے ہونے والی خرابیوں کو دیکھ کر حکومت نے ۱۸۷۱ء میں ان کے خلاف قانون نافذ کر کے ان میں سے اکثر کی ممانعت کر دی۔

شہر آئرلینڈ میں ڈالی بروک کا میلہ ڈبلن سے تین میل کے مسافت پر اگست کے پہلے منگل کو ہوتا اور ایک ہفتہ بھر قایم رہتا اتوار کے روز جب میلے کا اصلی کاروبار جاری ہوتا ڈبلن کے ہر طبقہ کے لوگ وہاں جاتے سڑک پر ہر قسم کی اعلیٰ و ادنیٰ گاڑیوں کا تانتا بندھ جاتا یہ میلہ خاص طور پر گھوڑوں کی فروخت کے لئے تھا۔

انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے بعض گاؤں میں مزدوروں اور خدمت گاروں کے ملنے کے لئے میلے ہوا کرتے جن میں حاجت مند بکثرت شریک ہوتے بعض مقامات میں وہ گاپ کہلاتے اس[2] طرح کے اکثر بازار روس۔ جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان اور امریکہ میں بھی ہوتے تھے۔

روس کے ایک شہر نوفگرد میں شش ماہی بازار لگتا جہاں کے تماشائیوں کی تعداد ۱۲۰۰۰ تک ہوتی یہاں تمام روس اور مشرقی یورپ کے باشندے جمع ہوتے بازار روس کی خرید و فروخت اشیاء کا اندازہ ایک کروڑ بیس لاکھ روبل سالانہ ہوتا ہے۔

قاہرہ میں ہفتہ واری بازار لگتے جن میں اطراف و جوانب کے لوگ بیع و شری کے لئے

---

[1] دلگداز نمبر (۷) جلد (۲۵)

[2] آداب اللغۃ العربیہ جزو اول صفحہ ۱۷۳ مولفہ جرجی زیدان۔

جمع ہوتے اور یہ سوق ایسیت۔ سوق الثلاثا۔ سوق الاربعا، کہلاتے ان میں بعض ماہوار بعض سالانہ اور بعض پچاس سال میں ایک دفعہ لگتے۔

ہندوستان میں گنگا کنارے سالانہ ہندوؤں کا بازار ہردوار لگتا ہے جس میں تماشائیوں کی تعداد ..... تک پہنچ جاتی اور ہر بارہویں سال یہاں تیرتھ یاترا ہوتی ہے اور اس موسم میں ارادت مندوں کی تعداد ایک بلین تک پہنچ جاتی ہے۔

اس طرح مکہ میں بھی حج کے لئے مسلمانوں کا عظیم الشان مجمع ہر سال ہوا کرتا ہے جس میں دور دور سے کثیر التعداد لوگ جمع ہوتے ہیں۔

ان[1] میلوں کے علاوہ ہندوستان میں عورتوں کے لئے مینا بازار لگا کرتے تھے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ہر مہینے میں معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔

اکبر کے زمانہ میں ایوان شاہی میں ایک مجمع کا اہتمام ہوتا جس میں محل کی بیگمات آتی تھیں۔ امرا اور شرفا بیویوں کو بھی اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں سوداگری اور سوداز یادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا خواجہ سرا قلماقنیاں اردابیگنیاں اسلحہ جنگ سے انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں اس کا نام خوش روز تھا۔

نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے بادشاہ بیگم بہنیں بیٹیاں پاس بیٹھتی تھیں امرا کی بیبیاں آکر سلام کرتیں نذریں دیتیں بچوں کو سامنے حاضر کرتیں ان کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں کبھی بیگم بیاہ کا مذمہ لے لیتیں کبھی بادشاہ لے لیتے اور شادی کا سرانجام اس طرح ہوتا کہ ماں باپ سے بھی نہ ہو سکتا۔

خود حیدرآباد میں اس طرح کے کئی مجمعے ہوا کرتے ہیں۔ ہفتہ واری بازاروں میں زیادہ مشہور جمعرات کا بازار ہے جو تجارتی غرض سے پرانے پل کے قریب لگتا ہے جہاں تڑکے سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اکثر پرانے اور کچھ نئے سامان کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جمعہ کے روز نارسنگی کا بازار موسیٰ کی تجارت کے لئے خاص ہے۔

---

[1] دربار اکبری

سالانہ مجمعوں میں لنگم پلی کا میلہ شہادت کا مجمع اور نال صاحب کا مجمع قابل ذکر ہیں جن میں کثیر التعداد لوگ جمع ہوتے ہیں اس قدر ہجوم اور بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ راستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

ان کے علاوہ کئی عرس میلے مینا بازار ہوتے ہیں جن میں سے کئی موقوف ہو گئے اور بعض اب تک جاری ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر باغ عامہ کی گزشتہ نمایش ہے جس میں تاجروں کی دوکانیں مصنوعات ملکی تھیٹر سینما چائے خانے ہوٹل قائم کرنے کے علاوہ طرح طرح کی دلچسپیاں پیدا کر کے نمایش کو کامیاب بنایا گیا تھا۔ ان سب دکانوں اور چیزوں کو اس سلیقہ سے ترتیب دیا گیا تھا کہ آرایش و زیبایش کا سارا کمال خرچ کر دیا تھا شام کے وقت بجلی کی روشنی سے مقام منور ہو جاتا اور کل مقام ایک بقعہ نور نظر آتا جہاں کثیر التعداد تماشائی اس دوکان سے اس ہوٹل میں اس چائے خانے سے اس سبزہ زار میں خوش خلیاں کرتے پھرتے چاندنی کے دنوں میں بینڈ سامعہ نوازی کرتا تماشائی کشتیوں میں بیٹھ کر تالاب کی سیر کرتے سینما تھیٹر اور قمار خانوں میں ایک جم غفیر ہوتا تجار اور کاریگر اپنی اپنی تجارت اور صنعت میں نئی نئی جدتیں پیدا کر کے عوام کو متوجہ کر لیتے۔ اس مجمع میں امیر غریب سب کو عام اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے داخلہ کیلئے دو آنہ کا ٹکٹ درکار تھا کبھی کبھی آقائے ولی نعمت سلطان العلوم ہز ہائینس نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے قدم ہمت لزوم سے مجمع کی رونق کو چار چاند لگ جاتے۔ نمایش کا آغاز بہ تقریب سالگرہ جہاں پناہ رجب سے ہوتا اور رمضان تک رہتی قیام نمایش کے زمانہ میں ہر جمعہ کو مینا بازار لگتا اعلیٰ ادنیٰ غریب امیر ہر قسم کی عورتوں کو عام اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے مجمع میں دکانوں اور دلچسپیوں کی جگہ بجائے مردوں کے عورتیں دوکانداری اور سوداگری کرتیں اس مجمع میں کوئی بچہ تک داخل نہ ہو سکتا ہر ایک کام عورتوں ہی سے سر انجام پاتا یہاں کا انتظام پورپین عورتوں کے ذمہ ہوتا جو اپنی سفید وردی پہنے ادھر سے ادھر اتراتے انتظامی امور میں سرگرمی دکھاتے پھرتیں۔

موجودہ تمدن کے نتیجہ خیز مجموں میں قابل ذکر دہلی کا مجمع جمعیۃ العلما گذشتہ و پونہ کی زراعتی نمایش اور لندن یونیورسٹی کالج کا جشن صد سالہ کا مجمع ہے جس کا افتتاح ملک معظم اور ملکہ معظمہ نے فرمایا جہاں ماہرین علوم و فنون کا ایک عظیم الشان اجتماع تھا جس میں عالیجناب مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ جامعہ کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔ اسی سلسلہ میں عثمانیہ کالج اورنگ آباد کا یوم کلیہ جس میں علمی سرگرمیوں اور علمی دلچسپیوں کی متعدد چیزیں ہوتی ہیں.....

قابل ذکر ہے۔

عرب کے بازار: بیرونی تجارت کے علاوہ عرب میں متعدد مشہور بازار تھے جہاں خرید و فروخت کی گرم بازاری ہوتی اور اسی کے ساتھ شعر و سخن کا بھی چرچا ہوتا ان بازاروں میں کوئی ماہواری ہوتا کوئی سالانہ۔ تجارت پیشہ لوگ جب ایک بازار سے فارغ ہوتے تو دوسرے میں پہنچتے۔ .....

..... جس طرح الپیا ..... ڈلفائی ..... اور ڈیلاس ..... کے اجتماع یونانیوں کے سیاسی، تمدنی معاشرتی اور مذہبی تعلقات برقرار رکھنے کا اعلیٰ ذریعہ تھے جہاں وہ جمع ہو کر کھیل تفریح کے علاوہ سیاسی مذہبی معاشرتی گتھیوں کو سلجھاتے اسی طرح عرب کے مجمع عکاظ۔ ذوالمجاز۔ مجنۃ۔ دومۃ الجندل، حباشہ وغیرہ عرب کے تمدنی ادبی سیاسی معاشرتی ارتقاء کے اعلیٰ ذرائع اور مسلمہ امتحان گاہ تھے باوجود تمدن دولت کی نمائشوں اور کانفرنسوں کے کسی طرح بھی کم نتیجہ خیز نہ تھے۔

اسواق[1] عرب دس تھے جہاں تجارتی غرض سے سب لوگ جمع ہوتے اور ان کے جان و مال کی حفاظت کی جاتی۔ ربیع الاول کے مہینہ میں سوق دومۃ الجندل ہوتا جہاں رئیس قبیلہ غسان و کلب سے جو غالب ہوتا ہی قرار پاتا۔ جمادی الاول کے مہینہ میں سوق مشقر ہریں لگتا جس میں بنو تمیم ربا المنذرین سادی رئیس ہوتے۔ رجب میں سوق صحار ہوتا جہاں حفاظت کی ضرورت نہ ہوتی پھر سوق ربا ہوتا جہاں جلندی و آل جلندی حکمراں ہوتے سوق عزاز بھاڑ کے سایہ میں لگتا جہاں ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔ رمضان کی پہلی کو سوق عدن لگتا جہاں سے خوشبودار اشیاء خریدی جاتیں رمضان کے نصف ماہ میں سوق صفا لگتا پھر حضرموت میں سوق ریاسہ ہوتا۔ پھر نجد کے ٹیلہ پر ذیقعدہ میں عکاظ کا میلہ ہوتا۔ جہاں کے تنظم قریش تھے اس کے بعد سوق ذی المجاز ہوتا جہاں سے فارغ ہو کر لوگ حج کے لئے مکہ جاتے اس زمانہ میں بعض لوگ لڑائی لوٹ مار کو جائز سمجھتے بعض ناجائز سمجھتے ہی نہیں بلکہ ایسے مخدوش زمانہ میں مظلوم کی نصرت پر آمادہ ہو جاتے پہلی قسم کے لوگ قبیلہ اسد۔ طی۔ بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ اور کچھ لوگ بنی عامر بن صعصعہ سے۔ دوسری قسم کے لوگ بنی عمرو بن تمیم۔ بنی حنظلہ ابن زید مناۃ کچھ لوگ مجمع میں مسلح پہنچتے کہ مظلوموں کی حمایت کریں اس اجتماع کی غرض سے رجب۔ ذیقعدہ۔ ذی الحجہ محرم چار مہینوں میں باہمی جنگ و جدال لوٹ مار کو حرام سمجھتے اور تمام عرب مشہور حرام میں ہتیار نہ لگاتے عکاظ میں عرب پہلے برقع منہ پر ڈال کر آتے کہتے ہیں کہ سب سے پہلا شخص جو برقع نکال کر یہاں آیا

---

[1] تاریخ یعقوبی الجزء الاول

ظریف بن عثم النجیرہ ہے پھر اور عربوں نے بھی اس کی پیروی کی رفتہ رفتہ برقع منہ پر ڈال کر آنا متروک ہو گیا

مشہور بازار انسب[1] سے پہلا بازار غرہ ربیع الاول کو دومۃ الجندل میں ہوتا لوگ یہاں بیع و شری سے فارغ ہو کر حجر کے بازار کو پہنچتے پھر عمان جاتے اس کے بعد حضر موت کا بازار لگتا پھر صنعا ہین کا مجمع ہوتا غرہ ذیقعدہ سے بیس تاریخ تک سب کا آخری اور مشہور مجمع سوق عکاظ کے نام سے لگتا آخر ذیقعدہ میں بازار مجنہ میں پھر آٹھ ذیحجہ تک ذوالمجاز میں جو عرفہ کے قریب ہے مجمع رہتا[2] آٹھ ذیحجہ کو میدان عرفات میں لوگ مناسک حج ادا کر کے اپنے اپنے وطن کو واپس ہوتے۔

بازار عکاظ[3] جاہلیت کے تمام بازاروں میں سب سے زیادہ مشہور عکاظ کا بازار تھا یہ بازار نخلہ اور طائف کے درمیان قرن کے لق ودق میدان میں غرہ ذیقعدہ سے شروع ہوتا بیس روز تک چہل پہل رہتی رنگ رلیاں منائی جاتیں بازار کے دنوں میں حج سے آنے والے قبائل یہیں جمع ہوتے تھے حج کے بعد حج کے لئے مکہ جاتے۔

یہ بازار گویا عرب کا الیمپیا تھا کہیں شعر و سخن کا بازار گرم ہوتا تو کہیں بیع و شری کھیل تماشوں کی وجہ سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی اس مجمع میں وہ فن کار جن کو جذبہ شہرت سال بھر کے سخت انتظار کے بعد یہاں کھینچ لاتا جمع ہو کر اپنے اپنے قدر دانوں اور جوہریوں کے آگے گوہر کمال پیش کر کے داد تحسین حاصل کرتے کہیں مغنی رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کرتے جس میں مہوشان روم مغنیان عرب و عجم اپنی اپنی فن کاری کا علمی ثبوت دیتے کہیں کاہنوں کا ہنگامہ بپا ہوتا جو اپنی غیب دانی اور پیش گوئی کی وجہ سے مرجع خلائق ہوتے یہ غیب دانی کے مدعی جن کا شمار اس زمانہ میں ارباب حل و عقد میں ہوتا مجمع میں کھڑے ہو کر مسجع و مقفی عبارت میں اپنے معتقدین کے نوشتہ تقدیر کو سنا کر ان کے سوالات کا جواب

---

[1] نہایۃ الارب۔

[2] معجم البکری صفحہ ۶۶۰۔

[3] جاہلیت میں عکاظ عرب کے ایک بازار کا نام ہے جہاں عرب کے قبائل ہر سال جمع ہو کر تجارت فخر و مباہات اور شاعری کرتے اصمعی کا بیان ہے کہ عکاظ کھجور کے درخت کا نام ہے اس کے اور طائف کے درمیان ایک رات کا فاصلہ ہے اور مکہ اس سے تین رات کی مسافت پر ہے یہیں عرب کا بازار لگتا اس جگہ کو اشید اکہتے ہیں یہیں الم نجار کے حادثات پیش آئے اور یہاں ایک پتھر تھا جس کا طواف کیا جاتا تھا۔ ازرقی کا بیان ہے کہ عکاظ نخلہ اور طائف کے درمیان ہے معجم البلدان المجلد الثالث۔

اس طرح ادا کرتے کہ نتیجہ ان کے قول کے خلاف نہ ہوتا۔ ان کا کلام فصاحت و بلاغت قافیہ بندی کے علاوہ کئی مطالب و معانی پر حاوی ہوتا۔

کہیں مورتوں اور محبوبوں کی پوجا کی جاتی تو بیچ مصنوعات ارتقائے تمدن حصول تحسین اور سیاست ملک کے نقطۂ نظر سے بھی یہ بازارات نہایت اہم ہوتے اس مجمع میں کوئی مسلح داخل نہ ہوتا اور جو ایسا کرتا قابل سزا سمجھا جاتا سالانہ خراج بھی نہیں وصول کیا جاتا قریش چونکہ حرم کے متولی تھے اس لئے ان کو تمام عربی قبائل پر غلبت و برتری حاصل تھی اور وہ اس مجمع میں منتظم ہوتے ان کی جانب سے منادی کی جاتی کہ لوگو اگر اس میلہ میں کوئی بھوکا یا پیادہ ہو تو اس کا خرچ ہمارے ذمہ ہے۔

ہر ایک شریف و رئیس صرف اپنے اپنے شہر کے میلوں اور بازاروں میں آتے مگر سوق عکاظ میں ہر ایک دیار کے امرا اور روساء شریک ہوتے اگر خود نہ آسکتے تو وفد بھیجتے جس کے قبیلہ کا کوئی شخص قید ہوتا تو اس کے فدیہ کا فیصلہ یہیں ہوتا اسی موسم میں حکام کا تقرر ہوتا کسی کو خون کا بدلہ لینا ہو اور قاتل لاپتا ہو جائے تو یہیں سراغ لگتا اگر کسی کو ایسا کلام کرتا ہو جو تمام عرب میں شہرت پائے تو اسی مقام پر کرتا یہاں عرب اپنے حسب و نسب شجاعت خوں ریزی بہادری کثرت مصائب پر بھی فخر و مباہات کرتے مستند سپاہی فنون جنگ کے کرتب دکھا کر ناظرین سے داد تحسین حاصل کرتے۔

شاعری اس مجمع میں شاعر کا مرتبہ ارفع و اعلیٰ ہوتا یہاں ہر قبیلے کے شاعر اپنے اپنے کمال کو ظاہر کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے جمع ہوتے کوئی مستند علامہ صدر نشین بن کر ان کے کلام کو سنتا جب شاعر کسی ٹیلہ پر کھڑے ہو کر اشعار پڑھتا تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے قصیدہ ختم ہونے تک قطع کلام نہ کرتے شاعر کے ہونٹوں سے الفاظ ادا ہوتے کہ کوٹھوں چڑھ جاتے اس طرح عمدہ عمدہ اشعار زبان زد خاص و عام ہو کر شاعر کو اس کی قابلیت کا سکہ تحسین دلا دیتے۔

یہ مجمع صرف عوام کا ہوتا بلکہ اس میں بڑے شعرا اعلیٰ درجہ کے نقاد اور خطیب بھی موجود رہتے جب کوئی مرصع اور اعلیٰ قصیدہ ان کے تنقیدی پیمانہ پر برابر اترتا تو اس کے لئے "ملقوہ" اشتوہا" کا نعرہ

۱؎ معجم البکری ص ۶۶۰

۲؎ کتاب الاغانی ج ۱۲۔

۳؎ معلقات کی وجہ تسمیہ میں مورخین کا اختلاف ہے منکرین میں سے قدیم شاعر ابو نماس اور بعض مستشرقین ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ جب کوئی قصیدہ پسند آتا تو بادشاہ اس کو حکم کرتا "علقوہا اشتوہا" یعنی وہ لکھ کر خزانے میں محفوظ کیا جائے اور جو اس طرح محفوظ کر لیا جاتا وہی معلقہ سمجھا جاتا مگر یہ کہنے میں آویزاں کرنے کو برا سمجھتے مگر ابن خلدون ابن عبدربی اور ابن رشیق کے قول کے

بلند ہوتا اور وہ اس شاعر کا شاہکار سمجھا جاتا چنانچہ سبعہ معلقات[1] جن پر قبولیت عام کی مہر لگ گئی تھی اسی بنا پر مشہور ہیں جب شاعر شعر کہتا اور خطیب تقریر کرتا تو وہیں ہر شخص کی لیاقت کا امتحان ہو جاتا اور جو جس قابل ہوتا اس قابل مان لیا جاتا یہ بازار گویا اہل عرب کی لیاقت کے امتحان کا مقام تھا جو شاعر اس امتحان گاہ میں کامیاب ہوتا اس کو قبولیت عام کی سند عطا کی جاتی جس سے تمام ملک میں اس کی شہرت ہو جاتی جو یہاں ناکام ہوتا وہ گمنامی کے گڑھے میں گر جاتا سال بھر تک شعرا اس فکر میں رہتے کہ ایسے قصائد تیار کئے جائیں جو یہاں پر پڑھے جائیں اور میدان سخن میں بازی لے جائیں زہیر کے حولیات[2] مشہور ہیں۔ یہاں اگر کسی کی ہجو کی جاتی تو وہ سب لوگوں کی نظروں سے گر جاتا اور کوئی مستند شاعر کسی کی تعریف کرتا تو اس کی چار دانگ عالم میں شہرت ہو جاتی وہ کیسا ہی خیر و خستہ حال کیوں نہ ہو لوگوں میں معزز و باوقار ہو جاتا چنانچہ محلق کلابی کا واقعہ اس کا شاہد حال ہے۔

اعشیٰ کی مدح کا اثر | محلق[3] کا نام عبدالعزیز بن جشم بن شداد بن ربیعہ بن عبداللہ اور کنیت ابوالکلاب ہے اس کو محلق کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک دفعہ گھوڑے نے اس کے رخسارے کو کاٹ کھایا تھا جس سے اس پر ایک حلقہ سا بن گیا اس لئے اس کو محلق کہتے۔ یہ شخص مفلوک الحال تھا اور بدنصیبی سے اسے کئی بیٹیاں بھی تھیں اس نے ایک دفعہ اعشیٰ کو اپنا مہمان بنایا اور ایک اونٹ ذبح کرکے کوہان و جگر کے کباب و شراب سے خوب ضیافت کی محلق نے جواب دیا کہ یہ آٹھ لڑکیاں بھی بدنصیب کی ہیں ان میں سے بہت کم کی شادی ہوئی ہے یہ سنکر اعشیٰ خاموش ہو گیا عکاظ کے میلے میں ایک قصیدہ مدحیہ علی الاعلان اس کی مہمان نوازی کے متعلق سنایا اس مجمع میں تمام اعیان و اشراف جمع تھے یہ گمنام شخص اس قصیدہ کی بدولت کل اعلیٰ و ادنیٰ کی نگاہ میں وقیع ہو گیا اس کا متوکل باوجود خستہ حالی کے معروف ہو گیا کئی جگہ سے پیام آئے اور ہر کسی پر اس کی لڑکیاں بیاہ لی گئیں جس کی وجہ سے وہ عمر بھر عمدہ زندگی گذار سکا۔

---

[1] شمار معلقات کی نسبت راویان اشعار مختلف الرائے ہیں۔ ابوزید قرشی جمہرۃ اشعار العرب کے پاس دو واقعہ ہیں مگر زوزنی نے سات ہی قرار دئے ہیں قصائد نابغہ اور اعشیٰ کو خارج کرکے قصیدہ حارث ابن حلزہ کو داخل کیا ہے اور ابوبکر انباری عبید ابن الابرص کے قصیدہ کو بھی ان پر اضافہ کیا ہے غرض کہ معلقات و ملمقات ملا کر پورے دس ہوتے ہیں جن کے اصحاب حسب ذیل ہیں:۔ امرالقیس نابغہ۔ زہیر۔ عنترہ۔ لبید۔ عمرو بن کلثوم۔ حارث ابن حلزہ۔ عبید ابن الابرص۔ اعشیٰ

[2] زہیر چار مہینے میں قصائد تیار کرتا اور چار مہینہ نظر ثانی کرتا یہ مجموعہ میں تنقید کیلئے چار مہینے پیش کرتا یوں قصیدہ کی تیاری میں ایک سال گزرتا اور اس لئے تیار شدہ قصائد حولیات کہلاتے تھے [3] کتاب الاغانی ۸/۱۸۷ ج ۸۔

جو لوگ خطیب ہوتے وہ تقریر کرتے اور ان کا درجہ مقرر کر دیا جاتا اسی مجمع عکاظ میں جاہلیت کے مشہور خطیب قس ابن ساعدہ کو جو نجران کا اسقف تھا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخ اونٹ پر سوار خطبہ دیتے ہوئے سنا تھا اس جگہ بعض باتونیں مناظرہ بھی ہوتا اس مجمع میں علاوہ اور فائدوں کے زبان[1] کا بھی فائدہ ہوتا بہت سی غلطیاں نکل جاتیں زبان شستہ اور ٹکسالی ہو جاتی چنانچہ قریش عکاظ کے بازار میں تمام قبائل کی گفتگو سنتے اس میں سے جو پسند کرتے اس کو اپنی زبان میں داخل کر لیتے اور اور جو خرابی اپنی زبان میں دیکھتے اس کو نکال دیتے اس طرح ان کی زبان تقیل لغات اور قبیح کر الصوت الفاظ مثلاً شکشکہ[2] کسکسہ عنعنہ۔ تمتمہ۔ وکم۔ وہم عجعجہ۔ استنطار۔ وستشنہ۔ وغیرہ سے پاک و شستہ تھی جو دوسروں میں رائج تھے۔

عکاظ میں یہ مناظرہ | اصمعی[3] کا بیان ہے کہ بازار عکاظ کے میدان شعر و سخن میں جب دور دور از کے شعرا اپنے اپنے کمال کا اظہار کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے جمع ہوتے تو میر مشاعرہ کے جلیل القدر عہدہ پر مشہور و مستند شاعر نابغہ[4] ذبیانی ممتاز ہوتا اس کیلئے ادیم سرخ کا ایک خیمہ نصب کیا جاتا مختلف شعرا اپنا اپنا

---

[1] المزہر ۱۰۹ ج ۱۔

[2] ابدال الشین بالکاف نسبت بنی تمیم اکرتکلش یجعل الہمزہ عینا نسبۃ التمیم عن تفعل فی موضع ان تفعل وکذا

[3] کتاب الشعر والشعراء از ابن قتیبہ

[4] اس کا اصلی نام زیاد بن معاویہ کنیت ابوامامہ یا ابو ثمامہ ہے جو اس کی لڑکیاں تھیں نعمان بن منذر ملک الحیرہ کے باپ دادا اور خود اس کا ندیم خاص اور مداح تھا ہمیشہ اس کے انعامات سے مالا مال رہا کچھ دنوں بادشاہ کی شکر رنجی کا باعث ہو کر دربار غسان میں پہنچ گیا اور عمر ابن الحارث اصغر کی مدح سرائی کی اس کے انتقال کے بعد جب اس کا بھائی تخت نشین ہوا تو یہاں سے رخصت ہو کر معذرت لکھ بھیجی اور ملک الحیرہ کے دربار میں داخل ہو گیا۔

ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ نابغہ ذبیانی اس لئے صدر نشین بنایا جاتا اور افضلیت کا سہرا اس کے سر اس لئے باندھا جاتا کہ اس کا کلام حشو و زوائد سے پاک حسن مطالع اور مقاطع کے لحاظ سے نہایت ارفع و اعلیٰ ہوتا کلام میں کہیں بلا کی سادگی اور بے ساختگی ہوتی۔ روانی زبان و عذوبت بیان سے ہویدا ہوتا کہ اس کے اشعار کیا ہیں شہد و شکر کبھی اشعار اس قدر متین و پر تمکین ہوتے کہ گویا پہاڑوں سے ٹکرا رہے ہیں ابتداً اس کے کلام میں اقوا پایا جاتا تھا مگر بعد میں ترک کر دیا اس کے اکثر و بیشتر اشعار سے تمثل کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو دوسرے شعرا سے مقدم و برتر مانا ہے اس نے مدح حرث کے علاوہ مختلف خود ستائی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اس کا ایک معلقہ اور دو قصیدے جس میں متجردہ کا سراپا بیان کیا ہے شہرہ آفاق ہیں

کلام سناتے جب ہر قبیلہ کا شاعر اپنا اپنا کلام سنا چکتا تو نابغہ ذبیانی بحیثیت صدر نشین ان کے کلام پر اپنی رائے ظاہر کرتا یہاں پر مفردات سے لے کر تراکیب تک کی تحقیق و تنقید ہو جاتی جن کا کلام قریش کے لب و لہجہ سے متجاوز ہوتا وہ ٹکسال باہر سمجھا جاتا اشعار کے معائب و محاسن بتلائے جاتے ایک شاعر کو دوسرے پر ترجیح دی جاتی جس پر ترجیح دی جاتی اس کے کلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی اور جس کو ترجیح دی جاتی اس کے کلام کے محاسن دکھلائے پڑھتے۔

حسانؓ و خنساءؓ کا ادبی مناظرہ | ایک دفعہ کا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ عکاظ کے مجمع میں نابغہ ذبیانی کے سامنے مختلف شعراء اپنا اپنا کلام سنا کر داد تحسین حاصل کر رہے تھے کہ دربار نبوت کا مشہور شاعر حسانؓ بھی آ پہنچا اس وقت جاہلیت کا نامور شاعر اعشیٰ اپنا قصیدہ سنا رہا تھا۔ اس کے اختتام پر عرب کی مشہور شاعرہ خنساءؓ کی باری آئی اس کا کلام سن کر میر مشاعرہ نے کہا کہ اگر تجھ سے پہلے میں اعشیٰ کا کلام نہ سنا ہوتا تو ضرور تجھ کو اشعر الشعراء کا خطاب دیتا اس پر حسانؓ نے بگڑ کر کہا "انا واللہ اشعر منك ومنها" اس پر نابغہ خیال صدر نشین نے کہا کہ تم اپنے منتخب اور قابل فخر شعر سناؤ حسانؓ نے یہ اشعار پڑھے اور کہا میں ان پر جس قدر ناز کروں کم ہے وکفی بہ فخراً و ہو ہذا۔

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحیٰ[1] واسیافنا یقطرن من نجدۃ دما[2]
ولدنا بنی العنقاء وابنی محرق[3] فاکرم بنا خالاً واکرم بنا ابنما

اس کے بعد ان کے اشعار پر خوب جی کھول کر موشگافیاں کیں۔ اعتراضات[4] کی بوچھاڑ سے نابغہ بند کر دیا عالی دماغ صدر نشین اور جب زبان خنساءؓ سے حسانؓ کا پیش پا افتادہ تھا رنگ فق ہو گیا منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں ساری خیمی کرکری ہو گئی حسانؓ بالکل لاجواب ساکت و صامت

---

[1] الاغانی، ۱۸ ج ۸

[2] ہم ایسے فیاض ہیں کہ ہمارے پاس روشن پیالے چاشت کے وقت چمکتے ہیں اور بسبب شجاعت کے ہماری تلواروں سے خون ٹپکتا ہے ہمارے اہل و عیال بنی عنقا اور ملک عمرو ابن ہند سے ہیں اور ماموں کے لحاظ سے بنی شریف ہیں۔

[3] ملک عمرو بن ہند کا لقب ہے جو یتیم کے سوتیلے آدمیوں کو مارنے کی وجہ سے پڑ گیا۔

[4] وہ اعتراضات یہ ہیں:۔ (۱) جفنات و اسیاف جمع قلت کا وزن ہے جس کا اطلاق دس تک ہوتا ہے اس کی بجائے جفان و سیوف ٹھیک تھا۔ (۲) غر سے بہتر بیض ہے (۳) یلمعن بالضحیٰ کی بجائے یبرقن بالدجیٰ میں زیادہ آب و تاب ہے کیونکہ مہمانوں کی آمد اکثر شب میں ہوا کرتی ہے اور اسی وقت مہمانی کی شدید ضرورت ہے۔ (۵) یقطرن سے بڑھ کر یجرین مطلب خیز ہے (۶) بجائے دما کے اگر بدما صحیح ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا (۷) [illegible] پر فخر کرنا ہے۔

رہ گئے میربشاعرہ کی سب پر دھاک بیٹھ گئی۔

المربد یا عکاظ اسلام

سب سے پہلے بصرہ اور کوفہ میں فاتحین اور ان کے اہل و عیال بس گئے پھر جب اسلامی فتوحات مشرق و مغرب کی جانب بڑھتی گئیں اور مسلمانوں کی حکومت راسخ ہوگئی تو عربوں نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ عیش و نشاط کی خاطر بلاد مفتوحہ سے جدید ملکوں میں سفر کیا اور انہوں نے اپنے لئے بادیہ سے قریب قدیم بلاد چن لئے اس طرح کے موافق طبع بلاد بصرہ اور کوفہ تھے کیونکہ وہ جزیرۃ العرب شام و عراق کے حدود پر واقع ہیں۔

عرب یہاں آکر قبایل و بطون پر منقسم ہوگئے یمن کے عرب بلدہ کے ایک طرف اور حجاز کے دوسری طرف آباد ہوگئے جب یہ لوگ ان بلاد میں منتقل ہوگئے تو ان کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات جاہلیہ بھی یہاں جاری و ساری ہوگئے انہوں نے جاہلیت کے بازار عکاظ کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک بازار لگایا جہاں پر فخر و مفاصمہ مناظرہ و مشاعرہ کیا جاتا اس جولانگاہ میں پھر شعر و سخن کی وہی اگلی دلچسپیاں بہم پہنچیں۔ ان میں زیادہ مشہور عربد ہے جو بصرہ میں واقع ہے اور ایک بازار سوق الایل کے نام سے مشہور تھا بعد میں ایک بڑا محلہ ہوگیا جہاں لوگ آباد ہوگئے یہاں شعراء اور لکچراروں کی بھی گرم بازاری رہتی تھی

دولت امویہ کے زمانہ میں عربد عکاظ اسلام تھا جہاں مشاعرہ مفاخرہ و مجالس ادب کا انعقاد ہوتا یہاں ایک دوسرے کی خوب خبر لیتا اس مجمع میں شاعروں کے راوی اور نقاد سخن بھی موجود ہوتے محل شعرا کے مخصوص حلقات ہوتے جن میں سب سے زیادہ مشہور فرزدق و راعی الایل کے ہیں اور اور شرفا بھی مذاکرہ اور مشاعرہ کی خاطر عربد میں جمع ہوتے اور ہر طرف سے شعر و سخن محفل آراستند نشستند و گفتند و برخاستند کا مضمون نظر آتا اشراف کوفہ بھی اسی طرح نواح کوفہ میں جمع ہوتے مگر سوق عربد سوق عکاظ کے مانند اس زمانے کے سوق متداولہ سے سب میں بڑھا چڑھا تھا۔

لہ آداب اللغۃ العربیہ جزاول جرجی زیدان ۔ ۲ الاغانی ۱۸۲ ج ۳ الاغانی ۵۱ ج ۴ الاغانی ۱۶۹ ج ۲۰

خواجہ محمود گاواں کے مزار پر ندر عقیدت کے دو پھول

از

مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم اے، بی ای (دکن)

اے کہ تو اجڑے ہوئے بیدر میں آرامیدہ ہے
ساتھ تیرے عظمت ملک دکن خوابیدہ ہے

تھا گلستان دکن کا مرغ خوش الحان تو
تیرے ہی دم سے تھا قائم اس چمن کا رنگ و بو

بہمنی اجلال کی گویا تھا تو روح رواں
تیری تدبیر و فراست کا تھا قائل اک جہاں

عقدۂ مشکل عطارد جس سے تھا خزر و حل
ناخن حکمت سے تیرے پل میں ہو جاتا تھا حل

مصلحت کا ہی تری ملک میں خیر اندیشہ بند
تیرا انداز حکومت تھا خلائق کو پسند

چھپ نہیں سکتی تھی مستقبل کی بھی تیرے جبیں
بھانپ لیتی تھی اسے تیری نگاہ بیں بیں

تھا فسوں پرور ترے فکر و تدبر کا رباب
جس سے ہوتا تھا سیاسی مشکلوں کا سد باب

تیرے آئین جہاں بانی کا تھا عالم میں شور
آئے صحرا پر چل سکتا تھا ضیغم کا زور

بادۂ حب وطن سے دل ترا سرشار تھا
ملک و ملت کیلئے تو نور کا مینار تھا

تو سیاسی میکدوں ہی میں تھا آتش بجام
رزمگاہوں میں بھی شعلہ بار تھی تیری حسام

دل ترا امن و اماں کی جستجو کا تھا شہید
قوت بازو تری تھی باب نصرت کی کلید

بحر و بر میں جب کیا تو نے لوا اپنا بلند
ہو گیا اقبال و دولت کا ہما صید کمند

اک بپھرتے شیر کا سا تھا ترا جوش و خروش
تیغ کی جھنکار تھی تیرے لئے فردوس گوش

بزم و مجلس میں تری تدبیر و دانش بیمثال
جنگ کے میدان میں تیری شجاعت لازوال

برق خرمن تھی عدو کو تیری تیغ ناصبور
جس کے جوہر کی چمک تھی ننگ شمع کوہ طور

تیری ہمت پر شکوہ بہمنی کا تھا مدار
نقد نصرت سے جگمگاتی تری تھی ہر کنار

برق، شعلہ کا نشیمن تھا تری تلوار میں
زلزلہ برپا تھا جس سے عرصۂ پیکار میں

تیرے دم سے تھی فروزاں مشعلِ علم و ہنر — آبیاری سے تری تھی کشتِ حکمت بارور
تھا گلستانِ سخن میں بھی ترنم ریز تو — ہندی کی تیری بلبل تھی صریرِ آرزو
نغمۂ شیریں تھا تیرا گویا پیغامِ سروش — دل کے ہنگامے سراسر جس سے ہوتے تھے خموش
علمِ تدویرِ فلک میں بھی تجھے تھی دسترس — اوجِ کیواں تھا تخیل کی ترے جولانگاہ
شاہدِ علمِ ریاضی کیوں نہ ہو تا بے نقاب — جس کے جلووں کی تھی محرم تیری فکرِ اطہر
فنِ لب میں بھی تجھے حاصل مہارت تھی بس — نبضِ دودی کو حرارت بخش تھا تیرا نفس
خوشنویسی نے تری مانی کو شرمندہ کیا — لوحِ تحسیں موقلم سے تیرے خامہ نے لیا

علم و فن کے نور سے آئینہ تھا روشن ترا
گوہرِ مکنون سے معمور سے تھا دامن ترا

کن فکاں کے زمزمہ سے آشنا تھا تیرا گوش — نورِ عرفاں سے فضائے صدر تھی آئینہ پوش
لذتِ درد و الم سے بھی تو ہو بہرہ یاب تھا — مرغِ دل گرگشتِ کیر سے شاداب تھا
تیرا مشرب تھا ورائے خانقاہ و کنجِ دیر — شہپرِ مرغِ یقیں تیرا تھا دائم عرش سیر
سینۂ صافی ترا تھا آشنائے سوز و ساز — تشنہ صہبائے ذوق و شوق تھی میناگداز
گنجِ شاہی کو ملا تھا تجھ سے حکمِ "دور باش" — آخری دم تک حجابت تھی تری وجہِ معاش
گرچہ اک عالم تری بخشش کا تھا منت پذیر — صوف تھا مرغوب تجھکو جائے دیبا و حریر
شان تھی دربار میں گرچہ امیرانہ تری — خاکیِ طرزِ رہائش تھی فقیرانہ تری

مثلِ ایوانِ سحر سینہ منور تھا ترا
مشکِ معنی سے مشامِ جاں معطر تھا ترا

ذہنِ تیرا حالِ تدبیر و صف شکن — سینۂ علم و فن کا فخر قلبِ تاباں ضو فگن
اتنے اوصافِ حمیدہ ایک جا ہوتے ہیں کم — تجھ میں ساری خوبیاں تھیں لطفِ خالق کا تھا ہم
زندگی یکسر تھی تیری بذلِ رحمت کا سحاب — گوشۂ دامن کا ہر قطرہ تھا جس کے دُرِ ناب
در ترا تھا مامنِ صاحب دلِ و اہلِ کمال — تیرے الطافِ کرم نے کر دیا سب کو نہال
اہلِ حاجت کیلئے دامن ترا زربار تھا — دردمندوں کو نفس تیرا مسیحا کار تھا
بزم و محفل تھی تری تا آشنائے امتیاز — تھا یہاں ہر وضع کا ہمدوش بے مایہ ایاز
آج تک قائم ہے تری عرش پایہ درسگاہ — منعقل جس کی منیا بارگی ہیں خورشید و ماہ

خون تیرا لالہ کاری کیلئے بیتاب تھا
جس سے گلزار دکن یارو نق و شاداب تھا

تیرے جوہر ہرن گئے آخر کو تیغ آبدار
باڑہ سے جس کی حسد پر ورنے ہو سینہ فگار

شعلۂ جوالہ فتنہ ہوا ایسا بلند
پیکر خاکی کا ترا جس میں جلا شل سپند

قتل نے تیرے دیا دولت کو پیغام زوال
کس قدر عبرت فزا ہے خون ناحق کا مآل

امن و آسایش کے ساماں نذر طوفاں ہوگئے
بہنی تسبیح کے دانے پریشاں ہوگئے

بزم کی رونق گئی گلشن بھی ویرانے ہوئے
جوشش صہبا سے خالی دلکے پیمانے ہوئے

جب سحاب تیرہ گوں میں ماہ کنعاں ہو نہاں
مصر کے بازار میں پھر حسن کی گرمی کہاں

زنگ پیدا ہوگیا آئینۂ ناموس میں
چھپ گئی شمع فروزاں پردۂ فانوس میں

شعلۂ قومی چراغ لالۂ صحرا ہوا
دل حذاق تابش دگرمی سے بے پروا ہوا

کس قدر حسرت فزا ہے تیرے قد کی فضا
بحر خاموشی میں ہے ڈوبی ہوئی موج ہوا

متصل مدفن کے آئینہ صفت تالاب ہے
لہر جس کی سجدہ ریزی کیلئے بیتاب ہے

سلح سیمابی سے اس کی ایک دلکش قصگا
ناچتی ہے ناز سے جس پر شعاع مہر و ماہ

سادگی کی زندگی دنیا میں تونے کی بسر
بے گماں ہوا پانی تربت اسی کا ہے اثر

جز رواق چرخ مرقد پر کوئی گنبد نہیں
نام تیرا خاتم شہرت کا لیکن ہے نگیں

عود و شمع و گل سے گو محروم ہے تیرا مزار
داغ خونیں لے مگر تیرا کفن ہی لالہ زار

شامیانہ نیم کا ہے قبر پر سایہ فگن
چشم انساں سے نہاں قمری ہے جسپر نغمہ زن

جگنوؤں کی تابشوں میں ہے چراغاں کا اثر
اس سکوں پرور فضا میں ہے شبستاں کا اثر

پھول یا کمخواب و ریشم کیوں نہ ہو تربت تری
چادر مہتاب خوب و جب تیری تربت پر تنی ہو

ایسی رفعت پر ہے واقع تیرا خوش منظر مزار
ہے نظر آتا جہاں سے ایک عالم کا نشار

مرغزار و کوہ و شہر و باغ و کشت و رہگذر
سب کے سب ہیں قتل گاہ میں ہم آغوش نظر

محو گردش آسماں میں ہے خجستہ قصر
منزلیں طے کر کے جب آتا ہے وہ بالائے سر

تیری تربت پر ٹھہرتا ہے نظر بھی کتنے
فاتحہ پڑھتا ہے اظہار عقیدت کیلئے

تیرے روشن کارنامے یاد ہیں از بسکے — خاک تیری قبر کی ہے جنت منظر اسے
جام دل لبریز ہو جاتا ہے اس کا رحم سے — اشک کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں اس کی چشم تر
گوشۂ مرقد کا ہر ذرہ سراپا درد ہے
نسیم کی ٹھنڈی ہوا بھی گویا آہ سرد ہے

جسم تیرا ہو گیا گرچہ ہم آغوش فنا — نام و شہرہ تیرا لیکن ہے عدم ناآشنا
تیرے روشن کارناموں سے جل شرمندہ ہے — لوح زرّیں بقا پر نام تیرا کندہ ہے
پیکر خاکی ہے تیرا چشم عالم سے نہاں — زندگی تیری ہے لیکن جاودانی ہم رداں
کارزار زندگی میں آج بھی رہبر ہے تو — راہ گم کردہ سفینوں کیلئے اختر ہے تو
تلخ کام دل میں تلاطم خیز ہے تیرا عمل — خفتہ پا رہوار کو مہمیز ہے تیرا عمل
سالکوں کے واسطے ہی خضر و تیری حیات — ظلمت شب کیلئے ہے نور مہ تیری حیات
محبس سینہ میں نالہ کو رہا کرتا ہے تو — چشم بے مایہ کو طوفاں آشنا کرتا ہے تو
ساز ملت کو ہے سامان نوا تیری حیات
کارواں کے حق میں ہے بانگ درا تیری حیات

موت نے تجھ کو اگرچہ کھدیا زیر زمیں — روح تیری لیکن اپنا سوز کھو سکتی نہیں
نام تیرا آج بھی ہے خلق کے ورد زباں — نقش پا تیرا ہے یکسر رہبر پیر و جواں
اک نمونہ ہے تو یاس و تدبر کیلئے — خضر رہ ہے اہل عرفاں و مبصر کیلئے
بے حسی جب دل کے ہنگاموں کو کرتی ہے خموش — یاد سرگرمی تری دیتی ہے پیغام سروش
سورماؤں کو ترا نقش قدم ہے ہمزباں — رجز خوانی کا اثر ہے نام میں تیرا نہاں
ذکر حق کوشی کا تری ہی عجب ہنگامہ خیز — دل کو کر دیتا ہے جو بالل سے سرگرم ستیز
فیض کا طالب ہے تجھ سے یہ ادیب بینوا — ہے زباں پر اس کی جاری دعا صبح و مسا
عارض خاور میں جب تک رنگ عنابی رہے
تیری عریاں قبر پر شبنم کی شادابی رہے

ایک نوزائیدہ کی موت پر

از

جناب سید علی صاحب نظام کالج حیدرآباد دکن

(چارلس لیمب نے اپنے دوست ٹامس ہڈ کے ایک نوزائیدہ طفل کی موت پر ایک نظم لکھی تھی، جس کا یہ نثری ترجمہ ہے)

میں نے ایک عجیب و غریب شئے کفن میں لپٹی ہوئی دیکھی قدرت کی دستکاری کا ایک نادر کرشمہ تھا، ایک نازک حسین ننھی سی کلی تھی، جس کو کھلنے سے پیشتر کچل ڈالا گیا، ایک نوزائیدہ طفل تھا جو اپنے گہوارہ میں (جو اب تابوت بن گیا تھا) پڑا ہوا میٹھی اور دائمی نیند سو رہا تھا، اس کو یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ اب صفحۂ ہستی سے بالکل مٹ چکا ہے وہ ابھی رحم مادر کے... تاریک زنداں سے نکلا ہی تھا کہ موت کا بے رحم پنجہ اس کو لحد کے مظلم و تاریک ترین غار میں گھسیٹ لے گیا۔

ابھی ایک آنکھ کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں دنیا اس کے لئے بالکل تاریک تھی، اس کو دنیا کی روشنی دیکھنی نصیب نہ ہوئی اس دھرتا پائیدار کا اس کو کوئی تجربہ نہ ہوا خواہ وہ شیریں ہو یا تلخ۔

یہ ایک عجیب معمہ ہے! کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ تیری اس سرسری آمد کا کیا مدعا تھا؟ اور کیا کوئی یہ معلوم کر سکتا ہے کہ تو اس دنیا والوں کیلئے کیا پیغام لایا تھا؟

کیا ہم یہ سمجھیں کہ قدرت نے اپنے موقلم سے ایک اکمل اور نادر تصویر کھینچی تھی اور اس کے بعد ہی (نعوذ باللہ) کوتاہ نظر و سنگین دست بن کے اس کو مٹا دیا؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ قدرت نے اپنی قوت تخلیق کو ضعیف پایا، یا یہ کہ نو مہینوں کی محنت و مشقت کے بعد اس سے جان بخشی کی وہ صفت معدوم ہو گئی جس سے بچے کے اعضا میں توانائی آجاتی؟

لیکن نہیں تیرے مضبوط اعضا سے تو یقین ہوتا تھا کہ تو صحت مند زندگی اور طویل عمر پائے گا وضع قطع کے اعتبار سے تو اپنی ماں کا بالکل ہم شبیہ تھا۔ تیرے اعضا (افسوس کہ جواب گرمیٔ حیات کھو کر سرد ہو گئے ہیں) ایسے خوش نما اور سڈول تھے کہ خود صناع ان کو دوسری حسین اشیاء کے تیار کرنے کے لئے نمونہ بنا لیتا۔

تو پھر کیا اب ہم یہ سمجھیں کہ سنگدل قضا نے یہ تصفیہ کر لیا تھا کہ ماں یا بچہ دونوں میں سے کسی ایک کا ضرور خاتمہ کرنا چاہیئے اور کیا اسی لئے موت کے تیز و تند جھونکے نے تنے پر رحم کھایا لیکن شاخ کو اس سے جدا کر دیا اس میں بڑی مصلحت پنہاں ہے، شوہر کو بیوی کے صدمۂ دائمی مفارقت اور تنہائی کی صعوبتوں سے بچانے کے لئے ایسا کیا گیا ہے قدرت کا یہ طرز عمل نہایت پراسرار ہے دنیا کے اکابر حکما اس معمہ کے حل کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ کیوں نسل انسانی کی معصوم کلی کھلنے سے پیشتر مرجھا جائے اور گس بے مایہ روز و روشن کی پوری بہار دیکھے اور کیوں ایک خطاکار مردہ ضمیر پیر زال صد سالہ عمر پائے جس کے جسم پر کہن سالی سے جھریاں پڑ جاتی ہیں اور جو کبر سنی میں شاخ حیات کا رس سوکھ جانے پر ہیزم خشک یا سنگ و خشت سے بدل جاتی ہے۔

اے عزیز بچے تجھے محروم نہ رہنا چاہیئے۔

ماں کے پرشوق بوسوں سے، اور اس کے ان ٹوٹے ہوئے بولوں سے جن کو وہ مامتا کے جوش سے از خود رفتہ ہو کر بچوں کی طرح بولنے لگتی ہے، نقرئی گھنٹیوں سے، اور بچوں کی پوشاک سے مونگے کی اشیاء سے، جو ان لبوں سے زیادہ سرخ ہیں، جن کو ابھی بے رحم موت نے زرد کر دیا ہے، باجوں سے جو محض بچوں کے بہلانے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں، ان سیٹیوں سے جن کو تو نے کبھی نہیں سنا، گو تو ان چیزوں کا طالب نہیں ہے لیکن تجھے وہ ضرور ملنی چاہئیں جو درد مند اور محبت بھرا دل رکھتے ہیں وہ تجھے یہ چیزیں دیں۔

اے وایہ! دیکھ ان میں سے کوئی شئے چھٹنے نہ پائے، یہ تمام چیزیں اس معصوم کے تابوت میں رکھ دے جو ظالم اور ہٹ دھرم تقدیر کے ہاتھوں مٹ چکا ہے کیوں بادشاہ اور امرا اپنی قبروں پر افتخار و امتیاز کے نشان بلند کریں اور ہم بیگانہ عظمت و شہرت افراد کیوں تجھے ان خوبصورت کھلونوں سے محروم رکھیں جو تیرے ساتھ پڑے رہیں گے۔

ہماری یہ نمائش و نمود بے ضرر و بے عیب ہے۔

باغِ دکن

(۴)

میر غلام مصطفیٰ مصحفی / اورنگ آبادی

قصیدہ در مدح مہاراجہ چندولال دیوان دکن

دیوانِ سخن میں (۵۸) صفحے قصائد کے ہیں، سب سے پہلے حضرت علیؓ کی منقبت والا قصیدہ قرأت قارئین کی نذر ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی "صریرِ سخن" بھی شاعر کی ذاتیات کے سلسلے میں پیش کی گئی، مدحیہ قصائد میں سے ذیل کا قصیدہ پیش ہے قصیدہ کی نسبت اس شعر کی وجہ سے ؎

مرتاضِ راجہ ہائے آفاق جس کو کہیئے یعنے وزیرِ اعظم اسکندرِ زماں کا

میری رائے یہ ہے کہ مہاراجہ چندولال دیوان دکن کی مدح میں کہا گیا ہے۔ اگرچہ سخن کے زمانے میں مورو پنڈت، دھونڈو پنڈت رائے رایاں، راجہ بھوانی شنکر امانت دولت راجہ رام نجبش برادر زادہ چندولال خدمت پیش کاری سے علی الترتیب سرفراز تھے لیکن ان راجگاں میں سے یہ قصیدہ کسی کی بھی مدح کا نہیں معلوم ہوتا۔ لفظ غالب کا تقاضا یہی ہے کہ ہو نہ ہو "راجہ ہائے آفاق" مہاراجہ چندولال ہی ہیں اور اس پر "وزیرِ اعظم اسکندر" بھی مستزاد کا مزا ہے۔ نواب میر اکبر علی خاں اسکندر جاہ، آصف ثالث (ولادت ۱۱۶۲ھ۔ حکومت ۱۲۱۸ھ رحلت ۱۲۴۴ھ) مغفرت منزل نے مہاراجہ چندولال کو ۱۸ صفر ۱۲۲۱ھ میں خدمت پیش کاری سے سرفراز فرمایا تھا لیکن نواب نیر الملک کی مدار المہامی (۱۲۲۴ھ تا ۱۲۴۸ھ) ہی سے ذیل کارِ دیوانی تھے۔

ان قصائد وغیرہ کے ساتھ انتخاب کلام سخن میں "عطرِ دیوانِ سخن" کی سی کوشش کی جارہی ہے (عمر ادنیٰ)

راغب بجز می ہے دل بس کہ آسماں کا معمورِ عیش سے ہے عشرت کدہ جہاں کا
بالیں خمیدہ شبتی بنا ئش ہے جو اتنا اس پیر پر پڑا ہے پر تو مگر جواں کا
ہے وہ پئے تدرفیل و نشاط نشاۃ رکھ دوش پر پٹیرے ہے جو دام کہکشاں کا

ہے بہر انشراح خاطر شگون بخشی — یہ متصل پھڑکنا چشم ستارگاں کا
ہو کیوں نہ فرحت افزا سیر بہار دنیا — رکھتی ہے حکم یہ بھی گل گشت زعفراں کا
آتی ہیں کب بیان میں نیرنگیاں جہاں کی — حقا کہ دیدنی ہے عالم جہانیاں کا
اغلب تو ہے کہ ابتک چشم زمانیوں نے — دیکھا نہ ہو زمانہ اس امن و اس اماں کا
ہے تقویت فزا ارباب ضعف یہاں تک — جوں پیل۔ دل قوی ہے ہر مورناتواں کا
یہ کچھ عجب نہیں ہے وقت مقابلہ گر — لے جائے پنجہ لاغر رستم سے پہلواں کا
ذرات کا جو عالم دیکھا بغور ہم نے — روکش ہے ذرہ ذرہ خورشید خاوراں کا
ہر گل زمیں سے ہے اک حسن تازہ پیدا — رکھتا ہے لطف دیگر ہر باب گلستاں کا
رشک ارم نہ ہو جو وہ بزم کونسی ہے؟ — جس مجمعہ کو دیکھو محسود ہے جناں کا
ایسی ہی فرحت افزا اب کچھ ہوا ہی ہے — کھلنا عجب نہیں ہے دل ہائے غنچہ ساں کا
ابنائے دہر میں ہے یہ اتحاد باہم — اٹھ ہی گیا تفاوت یک لخت درمیاں کا
پہنچا رواج الفت یہاں تک کہ عاشقوں کا — پگھلا ہی جاتے ہے دل کچھ خود بخود بتاں کا
جز مہر دل کیں کو ذرہ نہیں دلوں میں — ہے فیض عہد یہ بھی اک ماہ مہرباں کا
سرتاج راجہ ہائے آفاق جس کو کہئے — یعنے وزیر اعظم اسکندر زماں کا
یہ ہے علوئے منصب اس کا کہ جس کے آگے — کمتر زمانیاں ہے رتبہ کیانیاں کا
دریا دلی گر اس کی کیجے بیاں عجب کیا — خجلت سے آب ہو دل دریائے بیکراں کا
جو داد اس قدر ہے دست سوال اس کا — سائل کو بخش دیوے سرمایہ بحر و کاں کا
ضبط عدالت اس کا ہے اس قدر کہ بالکل — مفقود ہے جہاں سے ہنگامہ تنبدواں کا
اہل زمانہ یکسر ہیں مست خواب شیریں — یہ عہد ہے کہ مہد راحت زمانیاں کا
چھوٹے نہ اسکے چنگ تعذیب سے ستمگر — مظلوم کو نہ لکھدے جبتک کہ خط اماں کا
یہ امن ہے کہ چنگ باز و عقاب میں ہے — کبک و تدرو کے تئیں آرام آشیاں کا
خوف معاوضہ میں گھٹ جائے دل ستم کا — مہتا ہے جو اندک پھٹ جائے جی کرماں کا
اے عقل نکتہ پرور! اہر چند مدح غائب — احسن ہے اور رسم محمود شاعراں کا
لیکن بمدح حاضر پڑھ کوئی شعر ایسا — سنتے ہی منبسط ہو تا دل خدائیگاں کا

اے بحر فیض! الحق حاتم ہے تو زماں کا

حاجت روا کہاں کا مقصد رسا کہاں کا

اے چارہ ساز عالم! ہے لطف عام تیرا
راحت رساں دلوں کا آرام بخش جاں کا

اے ظلِ رحمت حق! ابرِ کرم نے تیرے
برسا دیا جہاں پر مینہ فضل و امتناں کا

جاذب ہے بس کہ تیرا صیت کرم دلوں کا
اللہ ہے فراہم عالم کہاں کہاں کا

فہم رسا کو تیری۔ ہے اس جگہ رسائی
وہم و گماں نہ پہنچے جس جائے بخرداں کا

مشائیوں نے کھینچا خجلت سے تیرے آگے
اشراقیوں نے تیرے زینہ جہاں کا

ہے باعلم تیر تنا گراں و سنگیں
لائق ہے گر ہو لنگر کشتی آسماں کا

خلق عمیم ہے وہ عنبر شمیم تیرا
پہنچے نہ جس کی بو کو مشک ایک کارواں کا

گزرے اگر چمن سے موج نسیم اس کے
مغز و مشام خوش بو۔ ہو جائے بلبلاں کا

ہو آبیار گلشن تیری اگر محبت
پیدا ہو شاخ گل سے گل بوٹے باغباں کا

صیدافگنی پہ آوے جس دم مزاج تیرا
ہو جمع گلہ گلہ صحرا میں وحشیاں کا

یہ بھی عجب نہیں ہے نخچیر گاہ سے ہو
سبزہ کی جائے پیدا گلدام آہواں کا

بھری کے سر سے لیوے جس دم کہ تو دماغ
ہو جائے سست بال پرواز طائراں کا

ہے وہ جو خاص گلگوں مرغوب طبع تیرا
سنداں سم و سبک تک سیر خیل تازیاں کا

حاشا کہ ہم نے ایسا دیکھا نہیں گماں کو
اس ساق و اس کفل کا اس گوش و اس میاں کا

یہ جلد ہے کہ گرد واپس مائدہ کو اس کی
اٹھوال ہے پہنچنا برق سبک عناں کا

اتنا فرس ہے یہ پہنچے وہاں وہاں یہ
راکب کرے ارادہ دل میں جہاں جہاں کا

با ایں ہمہ فراست لایق ہے اس فرس کو
گر ہو فراس کہنے خیل نگاوراں کا

ہے یہ وہ نشہ جولاں پیمانہ چشم جس کی
پی جائے ہے خرام مستانہ دل ستاں کا

ہر ہر قدم سے اس کے مستی کرے تراوش
یہ رنگ و بو میں ہے اس رشح عرق فشاں کا

نقش سم اس کا کم از طل گراں نہیں ہے
ہو نشہ بخش کیوں نہ رند قدح کشاں کا

ہاتھی کے وصف تیرے کیونکر بیان کیجئے
ہے سرسہ رنگ اس کا گویائی بیاں کا

خوش تر ہے اس کو خال روئے زمیں کہوں کیا
امن ہے در سواد دیدہ کہوں زماں کا

ہے دیدہ زیب اس کی ایسی ہی کچھ سیاہی
خوش آئے جس کے آگے سرمہ نہ اصفہاں کا

قدرت ہے وہم کو جو رفعت کے اس کی پہنچے
عظمت کو اس کی پاوے ہے حوصلہ کہاں کا

باایں ہمہ مہابت ہے سربلند اتنا — گزرے ہے آسماں سے سر اس کے فیلباں کا
داد دلاوری دے تو رزم میں وہ دم ہم — ہیبت سے آب زہرہ ہو جائے دشمناں کا
رستم ہو گر مخالف روبرو فرار رکھے — جاں بر نہ ہو نہ چھوڑے تا نام سیستاں کا
رستم کی اور تیری کچھ بھی مناسبت ہے؟ — وہ ایک ترک اوزبک سردار تو سراں کا
تسخیر ہفت کشور آساں ہے تجھ سے ورنہ — مشکل ہے اس کو لینا بے ہفتہ ہفت خواں کا
اے خامہ! کوئی مطلع لکھ وصف تیز میں بھی — تازہ نشین ہوئے دستور قدرداں کا

قبضے میں اپنے لاوے قبضہ تو گر گماں کا
ہر ہر خدنگ تیرا ہو دل نشیں نشاں کا

زخم دل عدو کا منھ کیوں نہ لال ہووے — پیکان تیر تیرا ہے رشک گلبناں کا
نوک سناں سے تیری ڈرتا ہی چھدنے سے — ہے پشت سے شکم چوں پیٹ آسماں کا
کھینچے جو تو کمر سے شمشیر روز میداں — فوج عدو سے برپا ہو شور الاماں کا
رکھتی ہے تیغ تیری کچھ طرفہ ترخم دم — خم ابروئے بتاں کا دم برق جاں ستاں کا
یہ رنگ ہے برش کا اس کی کہ نام لیتے — خون زباں سے ساغر بھر جائے ہے دہاں کا
نزدیک اہل جوہر انسب تجھے ہے اگر ہو — عقدہ کشا لقب اس شمشیر برق ساں کا
تقسیم جوہر فرد اک ضرب پہ ہے اسکی — ہے منحصر ارادہ ہو جس کو امتحاں کا
بس اے سخن! منش ہو طول سخن مبادا — ہو باعث کدورت آئینہ خاطراں کا
اولیٰ ہے اختتام نظم سخن دعا پر — تا چند بار گردن خامہ ہے بیاں کا
روشن کن جہاں ہو تا آفتاب تاباں — سرمہ سواد شب ہو تا چشم اختراں کا
تا عندلیب کو ہو الفت گل و چمن سے — پروانہ گرد رہوے تا شمع و شعلداں کا
محتاج آب نیساں تا ہو صدف بدیا — تا ابر تشنہ ہووے دریائے بیکراں کا
تا قلب کینہ توزاں کیں سے رہے معرا — تا سینہ صاف ہووے آئینہ مہرباں کا
تا عجز پیشگاں کا شیوہ فروتنی ہو — تا سر فرو نہ آوے نخوت سے سرکشاں کا
اس مرتبے کو پہنچے تیرا علوئے منصب — ہو پائے قدر تیرا اور فرق فرقداں کا

ہے وہ جو نونہال باغ امید تیرا
بابرگ بار سایہ گستر رہے جہاں کا

انتخاب اشعار

ہے طرفہ اتفاق کہ حیران کار ہوں
وہ ہے تو میں نہیں ہوں جو میں ہوں تو وہ نہیں

ابہام حسن ظاہر و باطن مجال ہے
لالہ کو حق نے رنگ دیا ہے تو بو نہیں

ہوتے ہوئے میں اس کے رہوں یہ کہاں مجال
شرکت اسے قبول ہو یہ اس کی خو نہیں

وہ زلف سیہ کے فسانے بہت ہیں
شبِ قدر کے سے دو گانے بہت ہیں

پرستش کے لئے کافر طرح کرتے ہیں بت خانے
بنانا خانۂ دل کا رکھے ہے اجر کل سو تو
ق
عبادت کے لئے مومن خدا کا گھر بناتے ہیں
نہ کافر ہی بناتے ہیں نہ دیں پرور بناتے ہیں

نام بھی لیتے ہوئے ڈرتے ہیں ہم اہل سخن
دام میں یار بندا ایسے سخت بے دردوں کے ہے

کبھو ہوتے ہیں دانا اور کبھو نادان ہوتے ہیں
یہ وہ کافر ہیں سب کچھ جان کر انجان ہوتے ہیں

لب کو فرماؤ تو نبات کہیں
ورنہ سر چشمۂ حیات کہیں

یہ بھی کوئی طور ہے سنو تو بھلا
ہم کہیں دن تو آپ رات کہیں

گرچہ تم خود پسند ہو لیکن
بات مانو تو ایک بات کہیں

بات ایسی نہ کیجئے کہ جسے
ق
لوگ سن کر مزے فرات کہیں

تکلف کا ہے کو کرتے ہو اتنا بے تکلف ہے
کرم فرمائیے نا بندہ پرور! ہم تمہارے ہیں

تمہاری آمد آمد کی خبر افشا ہوئی جب سے
تفاول پر تفاول ہے پیاپے استخارے ہیں

اثر افسوں بنانے کا جوانی کی گئی ورنہ
بہت ایسے پری رو ہم نے شیشے میں اتارے ہیں

سر کتے اس طرف جاتے تھکیا ہے کیا ارادہ ہے
کنارہ ہم سے گر منظور ہے ہم تو کنارے ہیں

اسے اس انقلاب دہر کا کیا سب برا ہووے
بہ دل جو دوست تھے اپنے وہی دشمن ہمارے ہیں

ہم تو ہم تم بخود ہو تو کو کچھ ہم تو بے خود ہیں — رخ پر نور ہیں یا مہر ہیں یا ماہ پارے ہیں
نہ ہو با یک دگر اب بھی محبت تو ہو ورنہ — ستارے جو تمہارے ہیں وہی اپنے ستارے ہیں

یہ تو باتیں ہیں کہ ہم جان تمہیں دے دیں گے — دل ہی دیتے نہیں تم اور کیا دو گے ہمیں
تم اگر تن دو ہمیں ہم جان تک حاضر کریں — ہم اگر دل دیں تمہیں فرماؤ کیا دو گے ہمیں؟
خیر ہے اے آنسو ایسا نہ طوفان ہو — تم تو کچھ ایسے ہی بہتے ہو بہا دو گے ہمیں

کب تک بھلا خموش میں اے ہم زباں رہوں — بت بن گیا ہے شوخ تو ایسا کہاں نہ ہوں

اس پست فطرتی پر جو یہ بلندیاں ہیں — یہ خود نمائیاں ہیں یہ خود پسندیاں ہیں
تم گرچہ سب طرح سے پاکیزہ خو ہو لیکن — گندہ دماغیاں ہی صاحب کی گندیاں ہیں

زیادہ ناز نہ کیجے کہ خوش نہیں آتے — جہاں میں اور بھی دلبر ہیں اک تمہیں تو نہیں
سخن سے ایک دن ایک آشنا نے صاف کہا — "خیال آپ کے مطبوع و دل نشیں تو نہیں
بقدر حوصلۂ خلق گفت و گو کریئے — مجھے پسند تمہاری چناں چنیں تو نہیں"

دیکھا نا سخن! تو نے وہ سب جو گئے ہیں — بے خود نظر آتے ہیں یا رات کے جاگے ہیں
سنتے ہی مرا قصہ وہ شوخ لگا کہنے — "سونے دے کہیں ظالم ہم رات کے جاگے ہیں"
اک وہ ستم نے اتنے میں بول اٹھا ہائے — "سنئے تو سہی آگے کچھ لطف تو آگے ہیں"

غم ساتھ ہی آتا ہے بے یار جہاں جاویں — بیٹھیں تو کہاں بیٹھیں جاویں تو کہاں جاویں

بے طرح آج اس کی آنکھیں جھپی ہوئی ہیں — شاید نظر لگی ہے پلکیں کھڑی ہوئی ہیں

حیراں بجائے خود ہیں نظارہ کیا کریں — سو رنگ ان میں آئے ہیں سو روپ بت میں

قیدِ فرنگ گرچہ اسد ہے پہ ایِ سخن
اقسام کے عذاب میں قیدِ حیات ہیں

نوالہوس رہ برہِ عشق ہو یارا ہی نہیں
سر سے جبتک نہ گزر جائے گذارا ہی نہیں

پیش ازیں بندہ نوازی جو کیا کرتے تھے
وہ تواضع ہی نہیں اب وہ مدارا ہی نہیں

لازم ہے آدمی کو کمال و زوال میں
جس حال میں ہو مست رہے اپنے حال میں

جب تک کہ وہ خموش تھے ہم بھی خموش تھے
آپس میں پھر تو چھن ہی گئی قیل و قال میں

در پردہ جب رقیب منانے لگے ہیں
جڑنے لگے لپیٹ کے پھر ہم بھی شال میں

بے گانہ اک جہاں سے جبکے لئے ہوئے
پھر بھی سخن وہ عہد شکن آشنا نہیں

چشم بد سے اُسے گزند نہیں
خال تو ہے اگر سپند نہیں

لطف کیا اس دماغ سوزی سے
پند عاشق کو سودمند نہیں

دوستوں کی خبر نہ پوچھو کچھ
چند موجود ہیں تو چند نہیں

وضع اہل زمانہ کیا کہیئے
حق تو یہ ہے ہمیں پسند نہیں

یہ جو ہے خون کبوتر سے بھری شیشہ میں
مے گلگوں ہے کہ ہے لالہ پری شیشہ میں

ہم نے بے یار پیا ہو تو قسم ہے تم سے
آج تک ہے مے گلفام بھری شیشہ میں

سخن اغلب ہے کوئی سنہ قدم آیا ہے
ہو گئی جو مے گلفام ہری شیشہ میں

دل لبھانے کو دل زار دیا کرتا ہوں
جیت کے وسیلہ ہار دیا کرتا ہوں

دور میں سب کو بمقدار دیا کرتا ہوں
اور کو دو تو انہیں بار دیا کرتا ہوں

عکس کو بھی اس کے صورت اسکی دکھلا دیتے ہیں
آئینہ ہو زردار اوہے تو یہ نذرانے دیں

بے نیازی پالو پھیلاؤ اگر مختار ہے
حرص گر دست طمع پھیلائے پھیلانے دیں

جب وہ آتا ہے تو یہ اپنی نہیں رہتا ہیں
میں جو اپنے میں رہوں تو پھر اسے جانے دیں

عجب کیا ہے سخن گر دیکھکر اس شمن بر کو
برہمن شیخ ہووے شیخ ہمرنگ برہمن ہو

دل بھی دیجے تو میر ایسے ہی ستمگر کو سخن
قتل عاشق سے جسے یک سمو عار نہ ہو

صاں۔ یار خ دلدار۔ یہ نہ ہو وہ ہو
دوائے عاشق بیمار یہ نہ ہو وہ ہو
موافقت ہو یہ دل جس سے ایک کا فی ہے
یہ فرض کیا ہے کہ اب یار یہ نہ ہو وہ ہو
رقیب یا رسخن مست خواب ہیں باہم
اشارہ چاہیے بیدار یہ نہ ہو وہ ہو

تم تو سخن کو ڈھب نا طرح سے ہو
ہم اور ہی کہتے ہیں تم اور سمجھتے ہو
تم کاہے کو سمجھو گے ارے مرے دل کا
مطلب کی جو ہوتی ہے نی الفور سمجھتے ہو

اس شمع وار قد پہ تو کچھ سے شمار دو
عالم کو پھر تو پھونکدے گر یک بلند ہو
جو ہر پہ اور کے بھی لطف جا ہتے رہے
وہ ہی کچھ آدمی ہی جو خود پسند ہو
بندے ہیں ہم تو شعر کی تاخیر کے سخن
حافظ ہو پیر یا کہ کمال خجند ہو

بدنام کیا چاہتا ہے کیا تو کسی کو
کہتا ہے صنم آج ہی جا مجھ سے سخن سن
آوے گا کوئی یہاں سے نکل اور نہیں تو
آفت کوئی آجائے گی کل اور نہیں تو

خوب پہنچا لطف معنی سخن کو مرحبا
تو بھی اپنے دور میں اک دور ہیں ہے کیوں نہ ہو

حق اگر پوچھتے ہو ہم سے جو تم سنتے ہو
یہ کہانی ہے کہ ہم ہم ہیں بتیں تم تو ہو

تم جتنے نہ یاں تھے سابق میں سو نہیں ہو
ہم گرچہ وہ نہیں ہیں تم بھی تو وہ نہیں ہو
کیا بک رہے ہیں ہم اور تم کس خیال میں ہو
کچھ تو کہو کہاں ہو! اے میر جی نہیں ہو!
اکسیر سے نہیں ہو کم حضرت سخن تم
سب کو مفید ہو پر اک آپ کو نہیں ہو

چاہتا ہوں کہ چلوں اُس کے منانے کو — پر ڈروں ہوں کہ وہ آندھی ہی بگڑ جانے کو
بے خبر راہ سے اپنی وہ چلا جاتا تھا — کس تصور میں خدا جانے پری خانہ کو
کیا کیا آپ نے یہ بیٹھے بٹھائے جی کو — اک بلا مول لیا چھیڑ کے دیوانے کو
آپ ہی نے تو مجھے لا کے پشیمان کیا — ورنہ میں کاہے کو راضی تھا ادھر آنے کو؟

کام وہ کر کہ آئندہ تباہی بھی ہو — رو سفیدی جو نہ ہو تو روسیاہی بھی ہو

آزردہ مجھ سے ہو کر غیروں سے مل گیا تو — اب تو ہی منصفی کر میں بیوفا ہوا تو؟
شکوہ نے تیرے مجھ سے بدظن کیا نہ کس کو — سب میں بُرا ہوا میں اور خلق میں بھلا تو
کہنے سے تیرے چھوڑی عادت کی آشنائی — اے دشمن مروت! اب تو خوش ہوا تو
ممکن نہیں کہ تیرا عہدہ برا شمن ہو — جتنا وہ بے زباں ہے اتنا ہی بت بنا تو

وعدہ ہی ہمیشہ کرتے ہو پر آج تلک تم آئے ہو — ہے بات تو یہ تم جھوٹے ہو اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہو
حق تو یہ ہے منھ پر کہنا صاف خفا ہوتی ہے — جی ہی جانے ہے جان اسے تم جتنا جی کو کھاتے ہو

وہ قند مکرر کا خواہاں نہ رطب کا ہو — اے جان شمن! جس کو ایکا تیرے لب کا ہو
عاشق کے بھی مطلب کی کچھ کچھ تو سنے گا ہے — معشوق وہ کیا اے دل اپنے ہی جو ڈھب کا ہو
بن دیکھے یہ صورت ہے دیکھے تو خدا جانے — کیا حال پھر اس چشم حیران طلب کا ہو

نہ تم کعبہ ہی جانے دو نہ سوئے دیر جانے دو — تمھاری گریوں ہی مرضی ہے پیارے خیر جانے دو

نہ سیر باغ نہ سیر بہار کرتے ہو — کہ تم تو گھر ہی میں بیٹھے بہار کرتے ہو

تمھاری خوبیاں آتی ہیں کب تحریر میں ہمدم — میاں جیتے رہو صد سال چندو لال اچھے ہو

"چندو لال"

جوشِ انتقام

(افسانہ)

جناب سید شبیر حسن صاحب فیض حیدرآبادی

خورشید اپنی ضیا پاش شعاعیں ڈالتا ہوا روپوش ہو رہا تھا۔ اور اپنی آخری منور کرنیں اوس مکان پر ڈال رہا تھا، جو آبادی سے دور اسپین کے جپسی گروہ کا مسکن تھا۔ اس گروہ کے لوگ رقص اور نغمہ و دیگر کمالات سے تماشائیوں کا دل مسخر کرتے اور اسی طرح اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ ہر شہر میں گھومتے اور چاقو کے کمالات جس میں مشاق تھے دکھاتے۔

طوفان کا آغاز تھا۔ سیاہ بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آسمان چھا رہے تھے۔ جو آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھے۔ اس معمولی سے گھر میں مجلس عیش و نشاط برپا تھی اُس گروہ کے لوگ ایک حلقہ کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور ایک حسین رقاصہ بیچ میں ناچ رہی تھی۔ اور چاقو کے کرتب دکھا رہی تھی۔ بس کو اس فن میں ملکہ حاصل تھا۔ اس کی عمر ۱۷ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اُس کا سن رسیدہ باپ بھی وہیں کھڑا تھا۔ دفعتاً چند آدمی ایک لاش کو لے کر برآمد ہوئے۔ لاش کو دیکھتے ہی ایک سنسنی پھیل گئی۔ کیونکہ یہ بدنصیب انہیں کے گروہ کا تھا۔ اوس کے باپ نے جو ان سب کا سردار تھا۔ جرأت سے استفسار کیا کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی؟

لاش کے لانے والوں میں سے ایک نے کہا "ایک انگریز شکار کھیلنے آیا تھا۔ اس کی گولی شکار سے خطا ہو کر اس کو آلگی"۔ "میں اس کا بدلہ لونگا"۔ اُس نے غصہ سے چلا کر کہا! اور اسکی تیاری کے لئے اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اُس نے پیڈرو کو تیاری کے لئے حکم دیا۔ تاکہ وہ بھی ہمراہ چلے۔ رقاصہ نے بہتیرا روکا۔ مگر اوس کا باپ نہ رکا۔

پیڈرو کو رقاصہ سے کمینہ محبت تھی وہ چاہتا تھا کہ اس بلبل کو اپنے دامِ الفت میں پھانسے لیکن اس کا باپ اس راستہ میں حائل تھا۔ مگر موہنا کو اس سے نفرت تھی۔ چنانچہ جب وہ اوس کے باپ کے ہمراہ جانے لگا تو اُس نے کہا۔ "موہنا دیکھ میں ایک انگریز کو اجل کے منہ میں ڈالنے جا رہا ہوں۔ میں کیسا بہادر ہوں"۔ وہ ہنسا۔ اور اُس نے چاہا کہ اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے۔ اس موہنا نے ایک جھڑکی دی۔ اور ہٹ گئی۔

ہنری اور پیٹیرو ملکر جا رہے تھے کہ ہنری رکا۔ اس نے اپنی جیبیں دیکھیں اور پیٹیرو سے کہا کہ میرا چاقو بے آؤ میں بھول آیا ہوں۔ پیٹیرو واپس آیا۔ اور چاہا کہ موہنا سے مذاق کرے۔ مگر موہنا نے اوسے ڈھکیل دیا۔ پیٹیرو اپنا سا منھ لیکر اٹھا۔ مکان میں سے چاقو لیا اور چلا گیا۔

(۲)

اس مکان کے قریب ایک نیل پروہ مکان تھا جسمیں آرل ان دنوں شکار کی غرض سے آکر اترا تھا۔

تمام آسمان پر فیر کا غازہ تھا۔ اور رات ہو چکی تھی۔ اس لئے آرل جو کہ خوبرو حسین جوان تھا۔ اکیلا شکار کے لئے نکلا۔ اور ایک جگہ آکر شکار کے انتظار میں بیٹھ گیا جس کے اطراف میں جھاڑیاں تھیں اور وہیں ہنری نے بھی ابھی ایک ہرن شکار کیا تھا۔ قریب ہی ایک لڑکا جس کی عمر ۱۱ سال کی ہوگی۔ جھاڑیوں میں سے شکار کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکا بچپن ہی سے گونگا اور بہرا تھا۔ اس لئے موہنا کو اس کے ساتھ خاص ہمدردی تھی۔ اور اس نے اوسے کئے کمالات سکھائے تھے۔

پیٹیرو نے خیال کیا کہ اس رکاوٹ کو جو موہنا کے حاصل کرنے میں مخل ہو رہی ہے۔ دور کر دیا جائے۔ لہذا اس نے بندوق اٹھائی۔ اور جبکہ بوڑھا ہرن کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کی پیٹھ پیٹیرو کی طرف تھی۔ اوس نے گھوڑا دبایا اور گولی بوڑھے کے سینہ کے پار ہوئی۔ جان نے دیکھ لیا اور وہ مکان کی طرف بھاگا۔ بندوق کی آواز نے آرل کو چونکا دیا وہ اٹھا اور حیرت سے ڈھونڈتے ہوئے آیا۔ جب وہ پیٹیرو کے قریب آیا تو اوس نے لاش دیکھی۔ اور تعجب سے پوچھا "یہ کس طرح مرا" پیٹیرو نے اطمینان سے کہا۔ ابھی ایک گولی چلی تھی۔ جو نہ معلوم کدھر سے آئی جب میں نے اس کی طرف پھر نظر کی تو وہ تڑپ رہا تھا۔

"میں یہاں کا آرل ہوں تم کو سچ سچ بتانا پڑے گا" تم آرل ہو۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں میں لاش کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ پیٹیرو نے کہا۔

آرل مجبور تھا۔ اس لئے وہ اپنے بنگلہ کو واپس گیا۔ اور پیٹیرو لاش لیکر مکان میں داخل ہوا۔ اور اس نے کہا۔ یہی انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنا۔ جو ہمارے دشمن ہیں۔ اور آرل کی گولی نے اس کا کام تمام کیا۔ وہ یہاں سے قریب رہتا ہے۔ اور مصنوعی طور پر رونے لگا۔

موہنا اپنے پیارے باپ کی اس مرگ مفاجات پر دھاڑیں مار کر رونے لگی اس کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ اوس کی نرسی آنکھیں خونین تھیں۔ وہ ایک دم اچھلی اس نے چلا کر

کہا "اس کا انتقام لئے بغیر میرا کھانا پینا حرام ہے۔ میں اس خون کا بدلہ لونگی۔ میں قاتل کو زندہ چبا جاؤنگی"۔ اس کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اس کے سامنے طوفان جنگل تاریکی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ گھوڑے کو اڑاتی ہوئی محل کے قریب پہنچ گئی۔ وہ پشت زین سے زمین پر گری۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ لیکن وہ دروازہ تک پہنچ گئی۔ پانی برس رہا تھا۔ اور اس پر غشی سی طاری ہوگئی۔

ارل کی نظر دروازہ پر پڑی اس نے ایک غمزدہ مسافر کو دیکھا۔ وہ فوراً بھاگا۔ اور موہنا کو اندر لے آیا۔ اوس نے اس کو گرم بلینکٹ اوڑھا دیا۔ موہنا بیہوش تھی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی ویلیا ارل سے ضرور انتقام لونگی۔ ارل جو اس کے حسین دلربا چہرہ کی دید میں مستغرق تھا۔ چونکا۔ وہ اصل حقیقت کو سمجھ گیا۔

موہنا تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آئی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ میں یہاں کہاں۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ یہاں کون رہتا ہے۔ غصہ سے اس کی جبین ناز پر بل پڑے تھے۔ "یہ ارل کا مکان ہے"۔ ارل نے جواب دیا۔ "اور وہ کہاں ہے"۔ اس نے تجسسانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ دور اندیش ارل نے بہانا کرنا مناسب خیال کیا۔ اور کہا۔ میں ارل کا مصاحب ہوں۔ اور ارل باہر گئے ہوئے ہیں۔

"تو کب آئے گا"

"کل صبح تک"

(۳۱)

ارل کافی حسین تھا۔ اس کے خوبصورت بدن پر سوٹ خوب کھل رہا تھا۔ اس کے چہرہ میں ایک خاص کشش تھی۔ اس کی صورت موہنا کے دل میں کھب چکی تھی۔ اور ارل کو اس سے انس ہوگیا تھا۔ موہنا کا حسن یک بیک دیکھا نہ جاتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھیں گول وسیع چہرہ اس کی زلف عنبریں۔ اس کا حسن نادیدنی اور۔۔۔ مرمریں سینہ ہر شخص پر ایک جادو کا اثر رکھتے تھے۔ وہ مجسم حسن کی دیوی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ ارل سیڑھیوں پر رباب لئے ہوئے محو نغمہ سرائی تھا۔ اور موہنا اس کے قریب کھڑی سن رہی تھی۔ آخر موہنا نے رباب لیا اور ایک مسحور کن گیت سے ارل کو پورے طور پر اپنا دیوانہ بنا لیا۔ یہ دونوں اسی طرح مست تھے کہ ملازم نے ایک ضروری بات کہنے کے

لئے آرل کو بلایا۔ اور وہ اُسے دوسرے کمرہ میں لے گیا۔

موہنا انتقام کی دیوانی بن کر آئی تھی۔ مگر آہ وہ اب محبت کی دیوانی ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون نہیں بلکہ محبت جھلک رہی تھی۔ اُس کے دل میں بجائے بدلہ کے محبت کی دنیا بسی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ مجبور تھی۔ وہ گملوں کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا۔ انتقام! انتقام۔ لیکن وہ آرل کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسی سوچ میں مستغرق تھی کہ پیٹرو جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ کر یہ سب واقعہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کے قریب آیا۔ اور ایک تصنع آمیز تبسم کے بعد کہا "کیوں انتقام لے لیا؟"

آرل ابھی تک نہیں آیا۔ موہنا نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔

"ہیں آرل ..... آرل کے گھونسے نے اس کا قطع کلام کیا۔ اور پیٹرو زمین پر گر گیا۔ آرل نے دو تین گھونسے اور رسید کئے۔ اور پیٹرو جان بچا کر بھاگا۔ یہ جھوٹا ہے جوش محبت سے دونوں بغلگیر ہوئے۔

(۴)

موہنا اپنے کیمپ میں پہونچی اور اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا آرل ابھی تک نہیں واپس آیا۔ جو اپنے باپ کا انتقام لیتی۔ پیٹرو نے کہا۔ آرل کی دیوانی تو آن جان بن رہی ہے آرل وہی تھا۔ اس طرح تو ہم کو دھوکہ دینا چاہتی ہے۔

آرل وہی تھا۔ موہنا نے سخت استعجاب سے پوچھا۔ اور اس کے ساتھ ہی جوش انتقام کا طوفان ایک مرتبہ اور امنڈ آیا۔ اُس نے کہا۔ تم سب ساتھ چلو۔ آج محل میں ناچ ہونے والا ہے۔ میں کرتب دکھا کر اُس کا انتقام لوں گی۔ اُس کا چہرہ پھر تمتما اُٹھا۔ اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سب کے ہمراہ روانہ ہوئی۔

(۵)

محل میں مجلس عیش و نشاط برپا تھی۔ کہ اتنے میں وہ گروہ پہونچا۔ موہنا نے آرل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ہم سب اسپین کا کرتب دکھانے کے لئے آئے ہیں۔ ہم اپنے کمالات سے سب کا دل خوش کریں گے۔ آرل اصل حقیقت کو بھانپ گیا۔ تمام لوگ اسپینی ناچ اور کرتب کے مشتاق تھے۔ اس لئے آرل اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔

موہنا نے پہلے تو ناچ دکھلایا۔ اور خوب اچھی طرح مسخر کر لیا۔ اس کے بعد دونوں ہاتھوں میں چاقو لئے۔ اور کہا۔ یہ موت کا ناچ ہے۔ اور ناچنے لگی۔ جب کبھی اس دوران میں اس کی نظر آرل سے ملتی۔ ایک بجلی سے کوند جاتی۔ اور اس کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں اسے اس کی محبت یاد آجاتی جو آرل کو چاقو بھونکنے سے باز رکھ رہی تھی۔ وہ آرل کے قریب آگئی۔ اس کے ہاتھ آرل کے اوپر تھے۔ آرل ساکت تھا لیکن موہنا محبت کے ہاتھوں بزدل ہو گئی تھی۔ دونوں کی آنکھیں لڑ رہی تھیں۔ موہنا کے ہاتھ جس سے تھرتھرانے لگے۔ اس کا تمام جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ وہ برابر اس کے چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑے۔ اور وہ اسے لپٹ گئی۔

پیٹرو نے سب سے کہا۔ میں نے نہ کہا تھا کہ یہ دھوکہ دے گی۔ اور اس نے اپنے لوگوں کو بلایا جو گھاٹ میں تھے..... اور سب کو گرفتار کر کے موہنا اور آرل پر فیر کا حکم دیا۔ عین اس وقت جان رسی تڑا کر (جس کو پیٹرو نے باندھ دیا تھا) بھاگتا ہوا پہونچا۔ وہ فیر کرنے والوں کے سامنے آیا۔ اور اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس نے اشارہ سے موہنا کے سامنے آرل کی معصومیت کا اظہار کیا۔ اور پیٹرو کے جرم کا۔

پیٹرو جان پر اکر بھاگا۔ اور ایک گاڑی پر بیٹھ گیا۔ لیکن آرل پیچھے آکر چڑھ چکا تھا۔ اور گاڑی میں دونوں میں خوب لڑائی ہو رہی تھی۔

موہنا گھوڑا دوڑاتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ اور اس کے پیچھے اس کے آدمی بھی تھے۔

پیٹرو کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس نے موقع پا کر آرل کو بھونکنا چاہا۔ اور آرل بے بس ہو گیا۔ اور اگر موہنا کو اپنے چاقو پر کرتب میں قابو نہ ہوتا تو آرل مر گیا ہوتا۔

موہنا نے کھینچ کے چاقو مارا۔ جو پیٹرو کے گلے میں لگا۔ اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اور آرل موہنا کے پیچھے کود کر بیٹھ گیا۔

چنانچہ گاڑی ایک گہرے گڑھے میں گر پڑی۔

آرل نے موہنا کو اٹھا لیا۔ اور وہ ایک پرسکون و پرلطف زندگی بسر کرنے لگے۔

(ماخوذ)

مطبوعات جامعہ ملیہ دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جہاں مسلمانان ہند کے احیاء و بقاء کے لئے بہت سے کام اپنے ذمہ لئے ہیں وہاں اس کا ایک اہم کام اردو زبان میں اعلیٰ لٹریچر بہم پہنچانا بھی ہے۔ چنانچہ ابتداہی سے اس نے اپنے ہاں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قائم کیا تھا جو اب اردو اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے۔ اردو اکاڈمی مختلف علوم وفنون پر چند نہایت مفید کتابیں شائع کر چکی ہے۔ جن کی فہرست ہم آئندہ صفحات میں درج کرتے ہیں نیز ان کتابوں کی بھی ایک فہرست درج کر رہے ہیں جو مکتبہ جامعہ نے مفید سمجھ کر خود شائع کی ہیں۔ قدردانان علم سے ہمیں امید ہے کہ ان مطبوعات کی قدر افزائی فرمائینگے۔

سلسلۂ اردو اکاڈمی

تاریخ الامت مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمۂ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے۔ ابتک چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ جو حسب ذیل ہے:-

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول ﷺ ۴ھ
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ ۸ھ
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ ۱۴ھ
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول ۸ھ
(۵) حصہ پنجم خلافت عباسیہ جلد دوم ۸ھ
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر ۸ھ

تاریخ الدولتین اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتح پوری نے اردو کا جامعہ پہنایا ہے

قیمت ۴ھ

مبادی سوشیالوجی یہ علم العیشت پر ایک لینن کی مشہور و معروف تصنیف ہے جس کا ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر حسین خانصاحب نے نہایت سلیس اردو میں کیا ہے یہ کتاب فن کے مبتدیوں کے لئے مفید ہے قیمت ۴ھ

تاریخ ہند قدیم قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر لیکن نہایت جامع خاکہ شعبۂ تصنیف نے کے ایم پانیکر صاحب ایم۔ اے (آکسن) سے انگریزی میں لکھا کر اردو میں ترجمہ کرایا قیمت ۴ھ

ذکریٰ تفسیر پارہ عم بمصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر جامعہ سلسلۂ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارۂ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں استاسلام کے لئے پیش کی ہے۔ قیمت ۱۲ھ

عبرت تفسیر سورۂ یوسف سلسلۂ تفاسیر کی ایک اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتائج کو بہت موثر طریق پر پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۴ھ

برہان سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پرزور اور دلکش طرز تحریر میں ۔ عہ

قواعد عربی (حصہ اول) کتاب الصرف اُردو میں عربی صرف کی مستند کتاب جسے ہندوستان کے مشہور عربی ادیب مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی استاد عربیات جامعہ نے نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ قیمت عہ

تاریخ فلسفہ اسلام از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ۔ج۔ دی بوئر کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ۔ تاریخ فلسفہ اسلام پر اُردو میں پہلی قابل قدر کتاب ہے۔ قیمت عہ

عربوں کا تمدن ڈاکٹر خورشید پروفیسر میونک یونیورسٹی کی مشہور مصنف تصنیف (KULTURBERARBEITER) کا ترجمہ از سید نذیر نیازی صاحب بی اے (آکسن) مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بھی بڑھادی ہے جو تاریخ اسلام پر یورپ بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت عہ

دیوان غالب

طبع ثانی

مطبوعہ برلن (جرمنی)

ہندوستان کے نابغۂ تازہ شاعر و ادیب مرزا غالب کا کلام جو شان رکھتا ہے اور جس قدر و منزلت کا وہ مستحق ہے ہم نے اسی حسن و خوبی اور لطافت و نفاست کے ساتھ مرزا کے کلام کا مجموعہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے۔ خوبصورت ملائم جلد، اس پر سنہرے و نقرئی نقش و نگار طلائی اوراق اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی اور کمال کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

ہمارے اس دیوان کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کا ایک ایڈیشن ختم ہوگیا اور دوسری بار طبع کرانا پڑا دیوان مکمل ہے جس میں مرزا مرحوم کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات قصاید اور رباعیات ہیں۔ جلد مطلا نہایت عمدہ سائز ۴۔۵ قیمت صرف ۵ عہ

دیوان شیدا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم

فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

دنیا مسیح الملک کو طبیب، قومی راہنما عالم، ادیب اور حافظ کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن اس کا علم شاید خواص کے علاوہ کسی کو نہو کہ حکیم اجمل خانصاحب مرحوم فارسی اور اردو کے ایک اعلیٰ پایہ اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام استادانہ ہے اور رفعت خیالات اور سادگی اظہار کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ اس دیوان کا ایک لفظ حکیم صاحب مرحوم کی ہمہ گیری نکتہ رسی اور قادر الکلامی کا شاہد ہے کتبہ جامع نے اس دیوان کو جرمنی میں طبع کرایا ہے۔ پاکٹ سائز جلد نہایت منقش نہایت خوبصورت، اوراق مطلا، رنگ سرخ نیلا۔ بہت قابل دید چیز ہے۔ قیمت صرف عہ

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پٹینٹ شدہ ہے جس ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اسکا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ پیچش۔ مستی۔ کھانسی۔ دمہ۔ بواسیر۔ خارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہر اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمایئے ایک بار ضرور آزمایئے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے شیشی نمبر (۱) عہ نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۴ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ دی پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا ہو "زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد علیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار وقت مقام معاوف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کیجائیگی۔

نوٹ:۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر

جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

ہندوستان کی طباعت میں عظیم الشان انقلاب اور یورپ کو مات

مرقعِ چغتائی (یعنے) دیوانِ غالب مصوّر

جس کی پہلی اشاعت کے ۲۱۰ نسخے بحساب فی نسخہ ۱۱۲ کلدار فروخت ہوچکے

یہ شاندار مرقع اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیحضرت حضور نظام خلداللہ ملکہٗ کے نام نامی و اسم گرامی سے باجازت منسوب ہے

مختصر تفصیل

تعارف نامہ از ڈاکٹر سر محمد اقبال — دیباچہ از نقاد مصوری ڈاکٹر کنز (مدراس)

(۱) مکمل متن دیوان غالب نہایت عمدہ طریق سے۔ (۲) مقدمہ سخنہائے گفتنی از مصور (چغتائی) (۳) انتخاب کلام

(۲۱) تصاویر جو چار رنگوں میں بذریعہ بلاک یورپ کے ایک ماہر فن کارخانہ سے تیار کرائی گئی ہیں۔

(۲) تصاویر حضرت چغتائی کی بہترین صناعی کا اعلیٰ نمونہ آؤٹ لائین بلاک کے ذریعہ تیار کرائی گئی ہیں

(۲) تصاویر جناب چغتائی کے پنسلی خاکوں سے بنوائی گئی ہیں۔

(۹) تصاویر عام رنگوں اور باقی ہلکے رنگوں میں تیار ہوئی ہیں۔

کتاب کی جلد نقلی مراکو کے چمڑے سے تیار کرائی گئی ہے جس پر طلائی بیل بوٹے اور کتاب کا نام کندہ ہے جو اپنی نوعیت کا غالباً پہلا نفاست سے چھپی ہے

قیمت ان تمام خوبیوں کے باوجود صرف ۱۰ روپیہ سکہ عثمانیہ رکھی گئی ہے۔

مکتبہ ابراہیمیہ نے ممالک محروسہ سرکار عالی میں فروخت کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے

مکتبہ ابراہیمیہ مدراس (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

نوٹ:- مکتبہ کے شوکیس میں کتاب کو ہر وقت ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو مولفہ مولوی محمد عبدالحق ہاشمی صاحب منشی فاضل جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا۔ تاریخ۔ قطب شاہی عادل شاہی و آصف جاہی دور ان میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ۔ صفحہ نمبر ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بارہ دوم قیمت کتابی کلاتھ ضخامت

چمنستانِ اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساد

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید غلام الدین قادری نور ایسے فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ نور صاحب۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے ہر اصول کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ مجلد ساد

اُردو کے اسالیب بیان مصنفہ نور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساد

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ نور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۳۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲

دنیا کے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات یہ اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی ڈاکٹر اے ٹیس رابرٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا مختصر اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴

ارباب نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر کا علمی تاریخی تعارف ۳۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عام

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ۱۰ آئیں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مفصلہ تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے۔ سائز ۲۷×۴۰/۱۶ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

جواہر کلیات نظیر منتخبہ جناب مولانا ذہین وحید فخار احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے آئیں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکھنیات کا لغت ہیں ہیں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے اسپ حالات ضخامت ۴۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵

خزینہ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے ہر خوشہر کو نیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱

ملنے کا پتہ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمہ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافک پریس مطبع

مجلۂ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ خریداری اطلاع دی جائے۔

۴- قیمت سالانہ (للہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہاں) فی پرچہ ۶

۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعاتِ مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحتِ بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کر دیا جائیگا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس عنایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیلِ زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار آصفیہ (۶۵)

مجلۂ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار انگلشیہ (۰۰۰۰۰۰)

جلد (۳) بابتہ ماہ مہر و آبان سنہ ۱۳۳۸ف مطابق اگست و ستمبر سنہ ۱۹۲۹ء شمارہ (۵ و ۶)

(اضافہ)

(۱) نواب نظام علیخان بہادر آصفجاہ ثانی والی دکن۔ (۲) نواب مسعود جنگ بہادر نائب امیر جامعہ نظامیہ

فہرست

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
شذرات۔	از مدیر	
سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی۔	جناب محمد احمد صاحب انصاری بی۔ اے ایل ایل۔ بی۔	۵
غزل۔	" عشق رامپوری۔	۲۰
بھوت (افسانہ)۔	" یم اسلم صاحب	۲۱
اقبال (اپنی رباعیات کی روشنی میں)۔	" عزیز احمد صاحب	۲۷
غزل۔	" سید قادر حسین صاحب قادر	۳۴
امام سیوطی اور تاریخ۔	" مولوی فاضل حافظ نثار احمد صاحب	۳۵
رباعی۔	" قتیل حیدرآبادی	۴۷
خاندان چوہان کا آخری راجہ (ڈرامہ)	" شیخ نور الحسن صاحب عثمانی	۴۸
اعتماد۔ (افسانہ)	" غلام رسول صاحب (سٹی کالج)	۵۶
میر کی ایک اور تصنیف	" سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے (آکسفورڈ یونیورسٹی)	۶۹
غزل۔	" صفی اورنگ آبادی۔	۷۶
فن تقریر	" غلام الدین صاحب عثمانی (عثمانیہ کالج)	۷۸
دکھیا سہاگن۔ (نظم)	" ابوالفتح فخر حیدرآبادی	۸۳
بادۂ دکن (سخن)	" عمر یافعی صاحب۔	
تنقید و تبصرہ	" ص م۔	

شذرات

اس دفعہ ہم نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ کسی شکل میں رسالہ وقت پر نکالدیا جائے۔ لیکن افسوس ہے مطبع کی دقتوں نے ہمیں اس دفعہ بھی اپنے وعدہ کو پورا نہ کرنے دیا۔ مہر کا رسالہ مکمل ہوتے ہوتے آبان کا وسط آگیا اس مجبوری سے اپنی عادت کے خلاف ہم دو رسالے ایک ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس تاخیر اور فرق عادت کو معاف فرمائینگے۔

اس مہینے کے بعد ہمیں توقع ہے کہ ہم یہ تو وعدہ نہیں کرسکتے کہ کسی معین تاریخ تک رسالہ آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریگا ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں رسالہ شائع کرسکیں گے۔

آبان کے رسالے پر "مکتبہ" کی تیسری جلد ختم ہورہی ہے اس وقت تک اس میں شک نہیں کہ رسالہ نے علمی حلقوں میں خاص جگہ حاصل کرلی ہے، لیکن ہم اس پر قانع نہیں ہیں۔ اپنے پچھلے تجربہ سے ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے رسالے کے مخاطب اعلیٰ علمی طبقوں کے ساتھ متوسط طبقے بھی ہوتے جائیں اعلیٰ طبقوں تک تو اردو کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی جاتی ہے۔ لیکن متوسط طبقوں میں رہکر اُن کے احساسات کو اپیل کرکے اُن کے مذاق سے سیار کو آہستہ آہستہ اونچا کرنا زیادہ مفید اور وسیع خدمت ملک کی ہوسکتی ہے۔ خصوصاً مدیر کو اس کا اعتراف ہے کہ سرکاری خدمت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ خود اپنے ذاتی علمی مشاغل اور متعدد کتابوں کی تکمیل میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس مقصد کی طرف کماحقہ توجہ مبذول نہ ہوسکی پچھلے سال کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اُردو مخطوطات کی فہرست مفصل اور جدید ترین اصول پر مرتب کرنے میں میرا بیشتر وقت صرف ہوا۔ کتب خانوں کی تلاش کرنے اور قلمی کتابوں کے مطالعہ اور اُن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بہت آزما کام سے رسالے کے کام میں تاخیر ہوتی رہی تاہم خدا کا شکر ہے کہ یہ فہرست اب مکمل ہوچکی ہے اور جامعہ کی طرف سے شائع ہورہی ہے۔

میری ان مصروفیتوں کی وجہ سے جو مجلہ کے کام میں حارج ہورہی ہیں، میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی سید محمد صاحب ایم اے مدرسہ دکارسٹی کالج کو بھی مستقل طور پر ادارت میں شریک کرلوں۔ کیونکہ سید صاحب مولوی عمر یافعی صاحب کی طرح ادارت کے کام میں ابتدا سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ میرا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ سید صاحب اور یافعی صاحب ادارت میں التزاماً شریک ہکر مجلہ کے مقاصد کو باحسن الوجوہ کامیاب بنا سکینگے۔ اور اُس کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے، مفید تر پیروں سے میرے لئے سہولتیں پیدا کردینگے۔ یہ امر میرے لئے مسرت اور اطمینان اور مکتبہ کے لئے خوش قسمتی کا باعث ہے کہ سید صاحب

... اصرار پر اپنی علمی مصروفیتوں کے باوجود اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ چنانچہ وہ نہایت [illegible]
اس نئے انتظام کے ساتھ رسالے کے موجودہ سائز کو بدلے بغیر اس میں بدل یا جارہا ہے مضامین بھی متنوع اور دلچسپی خاص طور سے ملحوظ رہیگی۔ علمی اور تحقیقی مضامین کے ساتھ عام فہم، مفید اور دلچسپ مضامین بھی اس کے لازمی اجزا ہونگے

اب تک طباعت کی دشواریوں کی وجہ سے رسالہ کی ہر نئی جلد کو غیر معمولی اشاعت کی صورت میں شائع کرنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ مشین پریس میں کام شروع ہو جانے سے آئندہ اس کا سوقع مل سکیگا فی الحال ماہ آذر ۱۳۳۹ف (اکتوبر) کا رسالہ فوراً ضخیم اور خاص اہتمام کے ساتھ شائع ہوگا۔ اسکی ترتیب شروع ہو چکی ہے۔ آذر کے آخر تک یہ خریداروں کے پاس پہنچ جائیگا۔ اس لئے جن حضرات نے اب تک چندہ ادا نہیں فرمایا ہے۔ یاد دہانی طلب نہیں کی ہے براہ کرم فوراً دفتر پر چندہ روانہ فرمادیں۔ آذر کی اشاعت صرف انہیں حضرات کے پاس بغیر کسی مزید قیمت کے روانہ کی جائے گی جو خریدار ہیں۔ چونکہ یہ نئی جلد کا پہلا نمبر زیادہ تعداد میں نہیں چھپ رہا ہے اور نیز جن حضرات کو اس کی اطلاع ہو چکی ہے اُن کی فرمائشیں وصول ہو رہی ہیں ممکن ہے کہ ان خریداروں کو جنہوں نے اب تک چندہ نہیں دیا ہے اس کے حاصل کرنے میں دقت ہو۔ اس لئے اس کا پہلے ہی انتظام کر لیا جائے تو مناسب ہے

ان تمام امور کی خاطر خواہ تکمیل کے لئے ظاہر ہے کہ غیر معمولی اخراجات کا بار رسالہ پر پڑیگا اس سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ حضرات جن کو مکتبہ کے مقاصد سے دلچسپی ہے، اور وہ بزرگوار جو رسالہ کے خریدار ہیں مہربانی کر کے کم سے کم ایک ایک خریدار جدید فراہم کر دیں اس کی توضیح کی یہاں ضرورت نہیں کہ کسی رسالے کی کامیابی کا دارومدار کہاں تک اس جماعت کی ہمدردی پر ہے جس کے درمیان کوئی رسالہ جنم لیتا رہے۔ بہرحال ان دقتوں کو قارئین کرام پر ظاہر کر دینے کے بعد ہم اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا دفتری سال پچھلے شہریور کے مہینے میں ختم ہو گیا۔ پہلے اراکین انتظامی جو تین سال تک بڑی دلچسپی سے کام کرتے رہے اُن کی کارگزاری بھی اس کے ساتھ ختم ہو گئی۔ آئندہ سال کے لئے اراکین مجلس انتظامی کا انتخاب ہوا یہ صرف ایک سال کے لئے ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) صدر - جناب نواب بہادر خاں صاحب خلف نواب نصیب یار جنگ بہادر

(۲) نائب صدر - مسٹر پروہت۔

(۳) معتمد - مولوی مرزا مظفر بیگ صاحب (مدامی)

رکن - مولوی غلام رسول صاحب۔

عبدالقادر سروری

(۶) رکن - مولوی سید محمد صاحب - ام - اے -
(۷) " - " عمر باقی صاحب -
(۸) " - " نذیر حسین شریف صاحب -
(۹) " - " احمد عبداللہ صاحب السدوسی - بی - اے

توقع ہے کہ جدید کمیٹی کا عہد عمل پہلے سے زیادہ درخشاں ثابت ہوگا -

بڑے مسرت کی بات ہے کہ ہندوستان بھی کچھ دنوں سے فلم سازی کی صنعت میں حصہ لے رہا ہے اور چند تماشا کاروں کے نام بھی عزت سے لئے جانے لگے ہیں یہی وہ صنعت ہے جو تجارتی پہلو سے ہٹکر بھی مغربی تمدن اور تہذیب کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لے رہی ہے - اس کا دیکھنا اور دکھانا دونو مفید ہیں - ان ہندوستانی فلم کمپنیوں سے امید بندھتی ہے کہ یہ ہندی تہذیب اور تمدن کو اصلی خدوخال میں دنیا کے بہ طریق شائستہ روشناس کرانے کی کوشش کرینگے - ہم قنوطی نہیں ہیں بعض مخالف واقعات کو دیکھکر بھی اس مفید صنعت کو ہندوستانیوں کے ہاتھ میں "بخاری اور کاروزیہ" سمجھیں -

کچھ روز ہوئے کہ مدن کمپنی کی بنائی ہوئی فلم "انارکلی" حیدرآباد میں بھی دکھلائی گئی مغل سلاطین کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں، "مغلائی" فضا میں متحرک نظر آتی تھیں - لیکن اس کے علاوہ کوشش کے باوجود بھی کوئی پہلو ہمیں ایسا نظر نہ آیا جو یاد رکھنے کے قابل ہو - اگر تماشا کاروں کا مقصد صرف لہو ولعب تھا تو بہتر ہوتا کہ وہ اس محترم بادشاہ کے ماحول کو نشانہ ستم نہ بناتے - اس کو اس وقت کے لئے اٹھا رکھتے جبکہ ہم میں اپنے بزرگوں کے احترام کا احساس اور حسن کاری کے امتیاز کا جذبہ پیدا ہو جاتا - شہزادہ سلیم سے تو بحث نہیں - اس کی بھی ابتدائے عشق تھی لیکن شہنشاہ اکبر اور علامہ ابوالفضل کے "بھائد" نہ ہونے میں شبہ ہو لیکن تعال (اکثر) ہوتے میں کیا شک ہے - اکبر کے سر میں انگریزی وضع کے بال، ابوالفضل کی مضحکہ خیز رقاصانہ آرائشیں تھے کا انجام بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے - "انارکلی" کے انجام کی بنیاد معلوم نہیں کہ کونسے حسن کارانہ اصول پر قائم کی گئی تھی کہ سلیم جیسے "عاشق مزاج" پر اپنی محبوبہ کا مقبرہ دیکھ کر بھی اثر نہ ہوا - سچ ہے "یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا"

سنا ہے کہ لاہور کے بعض سمجھ دار لوگوں نے بھی اس فلم میں کھیل کھیلا - خدا کرے کہ غلط ہو - اس فلم سے کچھ برا ہی حال "شیراز" کے فلم کا تھا - جو کچھ روز پہلے حیدرآباد میں دکھایا جا رہا تھا - لیکن حکومت بمبئی کے فیصلہ کے نفاذ سے معینہ مدت کے اندر بند کر دیا گیا -

ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر علوم اسلامیہ شعبہ مشرقیات راٹل بنگیرین یونیورسٹی (ہنگری) وسوامی بھارتی کے شعبہ مشرقیات میں ابھی ابھی نظام اسلامک چیر کے لئے منتخب ہوئے ہیں۔ اس سال ۱۹۳۰ء (۱۹۳۰ء) کے انتظام عمل کا جو خاکہ تیار کیا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ابتدائی نصاب۔ عربی ادبیات العالیہ (چھ سے چودھویں صدی عیسوی تک) کے انتخابات کے علاوہ تاریخ لسانیات اور ادب کی تعلیم۔

(۲) تاریخ اسلام۔ از منہ جاہلیت سے لیکر بعثت اور نزول قرآن مجید سے پہلے تک عربی تاریخ۔ اسلامی سلطنت عباسی خلفا، اسلام کی اشاعت اکناف عالم میں، ترکوں اور ہندوستان میں اسلام کی آمد وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ۔ تاریخی ماخذ اور ماخذوں کی جانچ کے تقابلی طریقہ کی تعلیم۔

(۳) ریسرچ اور تاریخی طرز تحقیق کی تعلیم اور اس کی وضاحت تاریخ اسلام ہند پر اس کے عملی تطابق سے دی جائیگی۔

(۱) تاریخ اسلام پر باضابطہ اور مسلسل لکچر ہوں گے۔ ہر لکچر کے بعد ایک جماعت منعقد ہوگی، جس میں اس لکچر کے ماخذوں کا تحقیقی مطالعہ کیا جائیگا جو لکچر کے موضوع تھے۔

(ب) ادبی اور لسانیاتی تصنیفات کے مطالعہ اور تفہیم کے لئے علٰحدہ جماعتیں دی جائینگی۔

(۴) فارسی اور ترکی نصاب۔ فارسی اور ترکی نصاب اور اس کے ماخذوں کے مطالعہ کیلئے درسوں کے ساتھ اعلیٰ جماعتیں ترتیب دی جائینگی۔

(۵) اسلامی کتب خانہ۔ اسلامیات سے متعلق مستند کتابوں کا کافی ذخیرہ تنقیدی اصول پر فراہم کیا جارہا ہے تاکہ طلبہ اور تحقیق کرنے والوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

فیس اور رہائش کے انتظام کے متعلق "کرماساشیوا" ۲۱۰، کارنوالس اسٹریٹ (کلکتہ) سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

جاپانی حسن کار سدھانشو چودھری، رانا دا چرن وکیل، وہرندرا دب برمن اور للت موہن سین سرکاری وظیفہ پر یورپ جانیکے لئے منتخب کئے گئے ہیں، یہ لوگ وہاں ہندی حسن کاری سے جدید انڈیا ہوز" کی آرائش اور زیبائش کا کام انجام دینگے۔ انگلستان پہنچتے ہی یہ پہلے ایک سال تک رائل کالج (ساؤتھ کنگسٹن) میں آرائش کی تعلیم حاصل کرینگے۔ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے یہ اطالیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک کا سفر بھی اختیار کرینگے۔ ہندی حسن کاری کی قدر شناسی کی یہ ابتدا ہے۔

ہماری فیاض حکومت نے بھی گذشتہ سال ملک کے ایک نوجوان حسن کار مسٹر امیر حسن کو وظیفہ دیکر اطالیہ میں نقاشی اور متاثل فنون کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ روانہ کیا ہے۔ یہ پروجیا کی ریگیا یونیورسٹی میں قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد دکن کے یہ سب سے پہلے طالب علم ہیں جو اس فن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی واپسی ملک میں حسن کاری کے ذوق کی اشاعت کا سبب ہو سکے گی

کچھ عرصہ ہوا کہ میونچ یونیورسٹی نے مابعد طبیعیاتی تعلیم کے لئے تین ہندوستانی طالب علموں کو وظیفہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ جس کے لئے ہندوستان کے مختلف صوبوں سے درخواستیں بھی طلب کی گئی تھیں۔ "ڈی ویوتاق اکاڈمی" کے پریذیڈنٹ نے ہندوستانیوں کی اطلاع کی غرض سے یہ تحریر "گرنیڈ یاسوسائٹی" کے اعزازی معتمد کے پاس روانہ کی ہے کہ اعلان کے جواب میں تقریباً تمام ہندوستانی جامعات کے متعلمین کی (۸۴) درخواستیں پیش ہوئیں۔ ہر درخواست گذار کی علمی قابلیت ممتاز تھی۔ اس لئے وظیفہ کی کمیٹی کے اراکین کو انتخاب میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ آخر کار ان تین خوش نصیب طلبہ کو یہ وظیفے عطا کئے گئے۔

۱۔ ڈاکٹر گرندر ناتھ مکھوپادیہ (کلکتہ یونیورسٹی) کو آرٹس میں ریسرچ کے لئے۔
۲۔ مسٹر کالی پاراباسو (ڈھاکہ یونیورسٹی) کو طبیعیات اور کیمیا کا وظیفہ حیاتیاتی کیمیا کے لئے۔
۳۔ مسٹر ترنگیا چرن سین (نیشنل کالج آف انجینرنگ بنگال) کو انجینرنگ کا وظیفہ عطا ہوا۔

ان جرمن علم دوست اصحاب نے جس قدر اعتراف ہندوستانیوں کی غیر معمولی قابلیتوں کا کیا ہے اس سے زیادہ قدر خود ہندوستانی ان کے دوستانہ جذبات کی کرتے ہیں۔

اس دفعہ کی تصویروں میں ایک نواب نظام علی خاں بہادر (نظام الملک آصفجاہ ثانی والی دکن) کی ہے۔ جن کا عہد حکومت بعض ناقابل فراموش علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے یادگار ہے۔

دوسری تصویر نواب مسعود جنگ بہادر سابق ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن کی ہے۔ آپ ریاست کے اس عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر اپنے دادا آنریبل سرسید احمد خان کی تعلیمی یادگار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے عہدہ وائس چانسلری پر فائز ہو کر تشریف لے جا رہے ہیں۔ اپنے اکثر پیشرو نواب وقار الملک نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ کی طرح آپ نے حیدرآباد کی خدمات سے سبکدوشی کے بعد علی گڑھ کالج کی علمی اور قومی خدمات کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔

POST GRADUATE

سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی

از

مولوی محمد احمد صاحب انصاری بی۔اے ایل ایل بی (عثمانیہ)

(بسلسلہ گذشتہ)

جنوب بعید کی چولا سلطنت

جس زمانہ میں چلوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوا (یعنی بارھویں صدی کے آخری حصہ میں) چولا سلطنت اپنے عروج پر تھی اور ایک سرسری نظر ڈالنے والا شخص کبھی اس کا خیال بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آئندہ نصف صدی میں یہ بھی اپنے پڑوسی کی طرح ہمیشہ کے لئے دنیا پر ایک درخشاں یادگار چھوڑ کر چلی جائیگی مگر باریک بین نظریں اس کی ظاہری شان و شوکت عروج اور اقبال کے باوجود اس کے زوال کے آثار و اسباب اسی وقت سے دیکھتی ہیں چنانچہ ۱۱۸۸ء میں پانڈیا سلطنت میں وراثت کا ایک جھگڑا برپا ہوا جس کی وجہ سے جزیرہ سراندیپ کے راجہ نے اپنے مشہور معروف سپہ سالار لنکا پورونڈ ناتا کی سرکردگی میں ایک بڑی بھاری فوج جنوبی ہند میں بھیجی۔ چولا سلطنت نے فریق مخالف کی طرفداری میں فوجیں روانہ کیں۔ بہت دنوں تک لڑائی ہوتی رہی۔ اس کے تفصیلی واقعات بڑے دلچسپ ہیں لیکن یہاں ان کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس جنگ کے متعلق جو بات یاد رکھنے کے قابل ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس جنگ میں شرکت کا اثر سلطنت چولا پر بہت برا پڑا جو صدمہ اس کی وجہ سے سلطنت کو پہنچا اس سے وہ کبھی سنبھل نہ سکی۔

مشہور راجگان چولا میں آخر شخص کلوتنگا سوم ہے جو ۱۱۷۸ء سے ۱۲۱۶ء تک حکمراں رہا پھر اس کے بعد کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جس کا ذکر کیا جاسکے۔ یہ شخص بڑا مدبر اور بہادر سپاہی تھا اس نے اپنی پوری کوشش سے سلطنت کے وقار کو قائم رکھا اور ہر طریقہ سے چولا سلطنت کو مضبوط اور دیرپا بنیادوں پر کھڑا کرنا اس کی عین خواہش تھی۔ گو اسے بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی لیکن جو قوتیں اس کے خلاف کام کر رہی تھیں وہ بھی آہستہ آہستہ اپنی جڑیں مضبوط کرتی جارہی تھیں پانڈیا ملک جو بے انتہا خون بہانے اور زر کثیر کے صرف کرنے کے بعد فتح کرکے زبردستی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔ بے چینی سے اپنی قید کے دن گزار رہا تھا۔

متعدد باجگزار ریاستیں تھیں جن کی تفصیل کلوتنگا کے بعض کتبات میں دیگئی ہے یہ ریاستیں اس وقت تک آپس میں متحد تھیں دو کتبوں سے ایک قسم کے عہدناموں کا پتہ نکلتا ہے جس میں ان ریاستوں کا ایک دوسرے سے تعلق اور مرکزی حکومت سے اتحاد ظاہر ہوتا ہے۔

راجہ راج سوم جو کلوتنگا کے بعد راجہ ہوا اس کے زمانہ کی حالت ایسی ہی تھی جیسے طوفان کے پیشتر خاموشی اس میں شک نہیں کہ کلوتنگا کی حکمرانی بہت کامیاب رہی لیکن زمانہ کے آثار مقامی حکومتوں کی روز افزوں ترقی قوت اور مرکزی یا شہنشاہی حکومت سے رفتہ رفتہ اختیارات کا سلب ہوتے جانا شاہی طاقتوں کا عروج جو چلو کیا شہنشاہیت کے ڈھانچے کی تقسیم سے اپنے گھر آراستہ کر رہی تھیں یہ سب چولا شہنشاہیت کے خاتمہ کے نقیب تھے۔ ظاہراً چولا سلطنت ایک بزرگ اور عظیم الشان ہیت رکھتی تھی لیکن اندرونی حالت روز افزوں بدتری کی طرف راجح تھی۔

دراصل سوائے پائے تخت اور وہ علاقے جو اس کے اطراف تھے اور سری رنگم۔ تانجور اور گنگا کونڈا سولا پورم کے صوبے علاوہ کوئی حصہ ملک شہنشاہ کے ماتحت براہ راست باقی نہیں رہا تھا۔ شمال میں پالو کا ایک خاندان جنوبی ارکاٹ پر قبضہ کئے ہوئے تھا۔ ٹونڈا منڈلم شمال میں اوپر کی طرف ہٹکر دوسرے پالو خاندان کے زیر نگیں تھا ان سب سے بڑھکر خطرہ پانڈیا حکومت سے تھا جو کیڑے کی طرح شہنشاہیت کو اندر ہی اندر چاٹ رہی تھی اس حالت میں چولا سلطنت کی حالت قابل رحم تھی۔ ہر ایک ہی خواہی کا دم بھرتا تھا اور معاملات کے سمجھانے کی غرض سے دخل دیکر کوئی نہ کوئی حصہ سلطنت کو غصب کر لیتا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں پہلی ہوسیالہ مداخلت شامل ہے جو دراصل مبنی بر خیر خواہی تھی۔

ہوسیالہ مداخلت

ہوسیالہ سلطنت پہلے چلوکیا کا ایک صوبہ تھی اس کا بانی بھی دیولا تھا۔ ویرا بلال نے اپنے زمانہ میں اس کے حدود دریا کرشنا تک وسیع کر لئے اور جب ویرا نرسما تخت نشین ہوا تو اس نے کچھ تو عزیز داری کے لحاظ سے اور کچھ ذاتی اغراض کی بنا پر چولا سلطنت کے معاملات میں مداخلت کی۔ راجہ راج چولا کے زمانہ میں راجہ سندر پانڈیا سلطنت کا حکمراں تھا وہ سلطنت کی زبون حالت کا اندازہ کر کے انتقام کے درپے ہوا۔ تانجور اور یوکو جلا کر خاک کر ڈالا۔ ہوسیالہ نے شہنشاہ کی طرفداری میں فوجیں روانہ کیں لیکن کانچی میں بلنا ہو گئی جس کی وجہ سے ویرا نرسما کو اپنی فوجیں واپس بلا لینی پڑیں موقع پا کر سندر نے راجہ کو ملک بدر کر کے خود شہنشاہ چولا بن گیا۔ کاڈوا نے راجہ راج کو قید کر لیا اور کچھ حصہ ملک جو اس کے قبضہ میں رہ گیا تھا اس سے چھین لیا۔ ویرا نرسما خود تو نہ جا سکا لیکن اس کے دو تجربہ کار سپہ سالار مع افواج کثیر روانہ کیا انہوں نے پانڈیا کو شکست دیکر کچھ دنوں کے لئے سلطنت کو بچا لیا۔ مگر اس کی وجہ سے دشمنوں میں اور آگ بھڑک گئی انہوں نے فوراً آپس میں اتحاد عمل کے معاہدہ کئے کویرل چنگا اور پانڈیا راجہ میں ہوسیالہ اور چولا کے خلاف معاہدہ عمل میں آیا۔ دراصل یہ مداخلت ہی چولا سلطنت کے لئے پیام اجل تھی ۱۰۶۳ء میں نرسما کے بعد سومیشور تخت نشین ہوا اور ۱۰۶۴ء میں دوسری مداخلت عمل میں آئی۔

چولا سلطنت کا خاتمہ

اس کی وجہ راجہ راج اور اس کے بھائی راجندر کا بغض و حسد تھی سلطان دونوں کے دو پارٹیاں تھیں جنہیں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ سومیشور نے راجندر کو شکست دے کر اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اسی کو راجہ بنا دیا اور خود سری رنگم میں اپنا جنوبی پائے تخت مقرر کر کے استقامت حاصل کر لی۔

چولا سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور ملک کی تقسیم شروع ہوئی چنانچہ ہوسیالہ بر کے نام راجہ کو قائم رکھکر پانڈیا کے خلاف چدمبر کے جنوب سے رامناد ضلع کے اندرونی حصہ تک خود دبا بیٹھے۔

جنوبی ارکاٹ مطلق العنان کوپرا نچنگا کے قبضہ میں تھا جو دراصل مخالفین سلطنت کا حلیف اور ہمیشہ فتنہ و فساد اور رخنہ اندازی کا باعث تھا۔ تیلیر بڑا حصہ شمالی ارکاٹ اور چنگلپٹ کا تھا یہ سب ائے نام سلطنت میں داخل تھے اور ہوسیالہ کی قوت کی وجہ سے خاموش تھے شمال کی طرف سے کاکاٹیا کے حملے برابر سلطنت کو کمزور کئے جا رہے تھے۔ تلوا میں جو دا خاندان کے تلنگے سلطنت کے ایک صوبے کے مالک بن گئے تھے۔

سنہ ۱۲۹۱ء میں دکن کی عام حالت

کاکاٹیا کا راجہ گنپتی تھا۔ اس نے سلطنت پر حملہ کیا اور شکست کھا کر اپنے ملک میں سے ہٹ جانے پر مجبور کیا گیا۔ گنپتی کے بعد اس کی بیٹی رودرمبا ۱۲۶۱ء تا ۱۲۹۱ء تک حکمراں رہی مگر رودرمبا کو اپنے ہی ملک کی حفاظت آپ کرنی تھی چنانچہ انہیں وجوہات کی بنا پر اس نے ۱۲۹۲ء میں تخت سے کنارہ کشی اختیار کی اور پرتاب رودرا کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اسی سال مسلمانوں نے تلنگانہ پر حملہ کیا ۱۳۰۸ء تک رودرا حکمراں رہا جس کے بعد وہ پھر سلطنت کا ایک باجگذار صوبہ ہو گیا۔

چولا سلطنت کی قوت ہوسیالہ کی مدد پر مبنی تھی لیکن اب ہوسیالہ خود اپنی بے وقت طاقت سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے اور چالیس ہی سال میں ان میں خود پھوٹ پڑ گئی۔ سومیشور کے بعد سلطنت کے دو حصے ہو گئے شمال میں ویرا نرسما اور جنوب میں ویرا رامناتھن نے سلطنت کو تقسیم کر لیا ۱۲۹۳ء میں ویرا رامناتھن کا بیٹا ویرا سومناتھا اپنے باپ کا جنوب میں جانشین ہوا اور اسی زمانہ میں شمالی ہوسیالہ نرسما کے بیٹے ویرا بلال سوم کے دیر نگیس آیا تھن بھی بعد از وقت پیدا ہوا تھا اس کی قابلیت نے کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچایا کچھ دنوں تک ان تھک محنت اور زبردست کوشش نے سلطنت کو سنبھلنے سے پہلے کچھ روشن کر دیا لیکن ۱۲۹۲ء میں مسلمانوں کی آمد نے ان سب بدتمیزیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ہوشیار باش کی صدا سے میدان جنوب بعید کو چونکا دیا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ وکرما دتیہ کے معین و مددگار صوبہ دار سلطنت چلو کیا کے زوال کی وجہ خود ہی ہو گئے ہیں سومیشور یادو صوبہ دار دیوگری کے نام اطاعت و وفاداری کا دم بھرتا تھا لیکن دراصل اس نے اپنے بیٹے کے لئے ایک موروثی سلطنت قائم کرنے کی چھوڑی۔ یہ مادیو نے ۱۱۸۷ء میں اتساپاس و لحاظ بھی اٹھا دیا اور وجیالا کی بغاوت کے ساتھ اس نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

سومیشور چہارم نے جب سلطنت کو پھر از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی تھی بیلما یادو نے جو اس وقت صوبہ دار تھا بادشاہ کی مخالفت کی اور جب ویرا بلال نے یوا جنرل کو کامل شکست دی تو ۱۱۹۱ء میں شہر دیوگری میں اس نے کامل خود مختاری کا اعلان کر دیا اور تخت پر بیٹھکر تاج شاہی اپنے سر پر رکھکر خود کو بادشاہ کے القاب سے ملقب کیا اور جتنا ملک کرشنا کے شمال میں تھا سب پر قبضہ کر لیا۔

یادو ہوئیسالہ کا رقیب اور برابر کا دعویدار خاندان تھا دونوں ایک ہی سلطنت کے صوبہ تھے دونوں نے نمکحرامی کی وجہ سے سلطنت کو برباد کرکے اس کے حصہ بخرے کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا اور دونوں نے اسی کی بدولت فائدہ اٹھایا تھا اس لئے ہوئیسالہ کی برمستی ہوئی قوت یادو خاموشی سے نہیں دیکھ سکتے تھے انہیں خود اس کا خوف تھا کہیں یہ زور پکڑ لیں تو انہیں ہضم کر جائیں۔ آپس میں کشیدگی برمستی گئی ۱۹۲۷ء میں تصادم ہوا یادو کو ہزیمت اٹھانی پڑی مگر اس سے کوئی تصفیہ نہیں ہوا۔ یہ سلطنتیں سب برابر کی تھیں اب ان پر کوئی باقاعدہ بالادست جو سب کو اپنی اپنی حد تک رکھکر ایک اتحاد عمل پر مجبور کرتا باقی نہ رہا تھا۔ سو سال تک یہ اسی طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے جیتر پال کے بیٹے سنگھانا نے یادو خاندان کو بہت عروج بخشا۔ گجرات و مالوہ اور شمالی کونکن فتح کرنے کے بعد جنوبی مرہٹواری کو اپنے علاقہ میں داخل کرکے ۱۲۷۴ء تک حکومت کرتا رہا۔

اس کے بعد اس کا پوتا کرشنا دیو ۱۲۶۰ء تک دیوگیری میں حکمراں رہا اور مالوہ وغیرہ میں بہت سے کارہائے نمایاں اپنی یادگار چھوڑے ۱۲۶۰ء میں اس کا بھائی مہادیو تخت نشین ہوا جس نے شمالی کونکن کو اپنی سلطنت میں داخل کر لیا ۱۲۷۱ء میں مشہور امدیو مہادیو کا بھتیجا اور کرشنا کا بدقسمت بیٹا دیوگیری کے تخت پر بیٹھا۔ اس کا ابتدائی زمانہ بہت کامیاب رہا وہ اپنے زمانہ کا جنوب میں سب سے بڑا راجہ تھا اس نے میسور اور مالوہ پر حملے کئے اور کامیاب رہا۔ تیس برس تک اس نے سلطنت کی لیکن جو عام اور عالمگیر قوتیں خود اس کو ایک مطلق العنان راجہ بنانے میں حمدرد ہو چکی تھیں انہی کا دوسرا کام اس کو اکھاڑ کر پھینکنا تھا چنانچہ ۱۲۹۴ء میں دیوگیری مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی۔

تیرھویں صدی کے آخری ربع کی حالت ہمارے سامنے اوپر کی سطروں میں رکھی ہوئی ہے جس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے جنوب میں کیا حالت تھی اور کونسا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور کیا قوتیں وہاں کام کر رہی تھیں اور کیا صورتیں وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔ ہم نے شروع سے تیرہ سو سال کی تاریخ پر ایک سرسری اور بہت ہی تیز نظر ڈالی ہے لیکن جو کچھ بھی ہمارے پیش نظر ہے اس سے ایک عام حالات کا تصوری نقشہ ہمارے ذہن نشین ہو جاتا ہے جس پر غور کرنے سے ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا ایک خاص قسم کے واقعات سے ہوتی ہے اور یہی واقعات ترقی کرتے ہوئے ایک مسلسل حالت میں نظر آتے ہیں اور گیارھویں و بارھویں صدی سے دوسرے واقعات بطور نتیجہ آہستہ آہستہ موجودہ واقعات میں سے نکلنے لگتے ہیں جن کی رفتار بالکل غیر محسوس ہوتی ہے حتیٰ کہ تیرھویں صدی میں وہ اپنی پوری قوت حاصل کر لیتے ہیں اور اپنا اثر کام میں لانا شروع کر دیتے ہیں۔

تیرھویں صدی کے آخر میں ذرا تامل سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پرانے واقعات نے بالکل جگہ خالی کر دی ہے اور نئے انتظام کی تیاری ہے چنانچہ چودھویں صدی کے پہلی ہی ربع میں وہ بالکل محیط ہو جاتا ہے اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

عام طور پر تاریخ کو تین حصوں پر تقسیم کرتے ہیں یعنی قدیم۔ وسطی اور موجودہ، جدید سہولت کے لحاظ سے ہر ملک کی ابتدا اور انتہا کی مقررہ تاریخیں بھی قائم کی گئی ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ فلاں تاریخ اور سنہ میں قدیم

ختم ہو جاتا ہے اور زمانہ وسطیٰ شروع ہوتا ہے اگر ایسا کیا جائے تو ایک تاریخی غلطی ہو گی کیونکہ موجودہ زمانہ میں واقعات کا تسلسل جس میں کوئی باقاعدہ رکاوٹ نہیں پائی جاتی ایک ناقابل ترک اصول ہے۔ ایک زمانہ دوسرے زمانہ سے گتھا ہوا ہے ہم بعض تاریخی واقعات چن کر زمانہ قدیم میں شامل کر کے علیحدہ نہیں رکھ دے سکتے کیونکہ ہر واقعہ اپنی ابتدا کسی زمانہ میں اور انتہا کسی دوسرے میں اپنی علت کسی ایک میں اور نتیجہ کسی دوسرے میں رکھتا ہے۔ ایک واقعہ ایک زمانہ میں پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا اور ترقی کرتا ہوا اپنے ارتقائی منازل طے کر کے ایک دیگر زمانہ میں عظیم الشان اہمیت حاصل کر لیتا ہے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اپنی سہولت کے لئے بعض اہم واقعات سے جو خاص قوتوں کے تحت ظاہر و نمودار ہوئی ہیں اُن سے ایک خیالی حد قائم کر لیتے ہیں کسی واقعہ کا پورا اثر اسی وقت محسوس نہیں ہوتا اور تبدیل کے وقت کوئی شخص فرق کو معلوم نہیں کر سکتا کیونکہ انسانی زندگی کے واقعات انقلابی نہیں ہوتے بلکہ ارتقائی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ موجودہ ترتیب و انتظام کو آہستہ آہستہ بدلتے ہوئے زمانہ کے موافق بنا دیتے ہیں۔

زمانہ کا تعین در اصل سن عیسوی یا ہجری سے نہیں ہوتا بلکہ واقعات پر ہوا کرتا ہے ہم در اصل تاریخ عالم کے واقعات کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے دلائل و اقعات کس جگہ اور کس وقت وقوع پذیر ہوئے اس سوال کا ہم جو جواب پاتے ہیں اسی سے ہم اس ملک کی تاریخ کو ازمنہ سنن کے مطابق مقرر کر دیتے ہیں مثلاً یورپ میں عموماً ۵۰۰ء سے ۱۴۵۳ء کے بیچ میں جو زمانہ گزرا ہے اس کو ازمنہ وسطیٰ کہتے ہیں۔

ہر زمانہ کے کچھ نمایاں خصوصیات ہیں جس سنہ میں وہ نمایاں خصوصیات کسی ملک میں پائی جاتی ہیں وہ زمانہ انہیں کی مناسبت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تجربہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کے واقعات اپنے خصوصیات کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ کئے جا سکتے ہیں اور یہ ہر حصہ دنیا میں وقت اور مقام کے فرق سے پائے جاتے ہیں جن کے لحاظ سے ہر ملک میں اُن کا تعین مروجہ سنن میں کیا جاتا ہے۔ تاریخ عالم کے مطالعہ سے یہ مطلب صاف طور پر سمجھ میں آ سکے گا۔

ہمارے مطلب کے لئے تاریخ یورپ کا دکن سے مقابلہ کرنا کافی ہے چنانچہ یورپ میں ۵۰۰ء کے قبل جو رجحانات اور واقعات کے خصوصیات ہیں انہیں ذہن نشین کر کے اگر تاریخ دکن سے مقابلہ کیا جائے تو ۱۳۹۰ء تک دکن میں ہمکو پھر وہی عالمگیر اصول کام کرتے ہوئے نظر آئینگے جو یورپ میں ۵۰۰ء تک موجود تھے۔ اس لئے ہم تاریخ دکن کو ۱۳۹۰ء تک زمانہ قدیم اور اس کے بعد ۱۸۵۳ء تک ازمنہ وسطیٰ اور اس کے بعد سے زمانہ حال میں تقسیم کرتے ہیں۔

ہمارے مضمون کا تعلق زمانہ قدیم و زمانہ وسطیٰ کے درمیانی حصہ سے ہے اور یہی وجہ اس کی اہمیت کی ہے۔ علاؤالدین کی شخصیت کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے لئے ہم تاریخ یورپ سے تاریخ دکن کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے نتیجے پر پہنچینگے یہی بہترین طریقہ واقعات کو اچھی طرح سمجھنے اور عالمگیر اصول کی اہمیت کو جانچنے کا ہو سکتا ہے یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یورپ میں ۵۰۰ء عیسوی سے زمانہ وسطیٰ شروع ہوتا ہے اور ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ تاریخ کو ازمنہ میں تقسیم کرنا محض

ایک خیالی چیز نہیں، بلکہ خاص اصول کے تحت اس کو ایسا کیا جاتا ہے لہٰذا اب ہم دیکھینگے کہ یورپ کی تاریخ کو زمانہ قدیم سے زمانہ وسطیٰ میں تقسیم کرنے والے کون سے واقعات ہیں اس کے لئے یہاں زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ہم ان عالمگیر واقعات کو دکھلائینگے جو اس کے موید ہیں۔

زمانہ قدیم کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کا جنوبی حصہ ترقی یافتہ اور مہذب ہے رومی سلطنت اپنے عروج پر ہے اور کوئی اس کی قوت اور اس کے حقوق کا دعویدار اور رقیب نہیں دریائے ڈانیوب اور رائن گا کے شمال میں بربریت پھیلی ہوتی ہے۔ یونانی اور رومی تہذیب اٹلی۔ یونان۔ اندلس۔ فرانس کے جنوبی حصوں تک محدود ہے زمانہ قدیم کے اختتام پر جو واقعات صاف طور پر نظر آتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں کہ زبان کے لحاظ سے صرف دو زبانیں یعنی رومی اور یونانی ترقی یافتہ اور مہذب ہیں باقی جتنی زبانیں یورپ کی تھیں وہ غیر مہذب حالت میں رہتی پڑی تھیں جنہیں غیر مہذب اقوام اپنے ضروریات معمولی پورا کرنے کی غرض سے استعمال کرتی تھیں۔ مذہبا سارا یورپ عام تاریکی اور جہالت بت پرستی و اوہام پرستی میں گھرا ہوا تھا کوئی رہانی رفعت انسانی تخیل میں نہیں پائی جاتی۔ انسان فطرتی مناظر سے ڈرتا ہے اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے اُن کی پرستش کرتا ہے۔ الوہیت سے محبت اور عشق نہیں ہے ہاں تک پہنچنے کی خواہش نہیں بلکہ صرف اپنی دنیوی زندگی کو خوشی سے گزارنے کو خواہش اور خلاف ورزی کرنے میں اُس کے زائل ہونے کا اندیشہ اسے پرستش کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ سیاسی حیثیت سے یورپ کی صرف دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ رومی یورپ اور بربری یورپ۔

لیکن تشدد میں جب گاتھ اقوام نے سلطنت روما پر ترکتازیاں شروع کیں تو اس میں شک نہیں کہ اس سے زمانہ قدیم کی ایک عظیم الشان عمارت ہل گئی اور اسی وقت سے اس کی بیخ کنی کی بنیاد پڑی اس کے پیشرو کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا اور کوئی اس کے حق حکمرانی کا دعویدار نہ تھا لیکن یہ ایک نیا اثر ہے جو رومی سلطنت کے دعوئ عالمگیر حکمرانی کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے اگر اس واقعہ کو تاریخ کی روشنی میں ہم بیان کرتے چلے جائیں تو ظاہر ہوگا کہ ایک مسلہ اصول ہے جو کام کر رہا ہے جس نے پرانے واقعات کے خلاف نئے واقعات کی بنا ڈالی لیکن یہ نیا واقعہ بطور نتیجہ کے پرانے سے پیدا ہوتا ہے۔ زمانہ وسطیٰ کی خصوصیات میں سے ایک عالمگیر سلطنت کی مخالفت کا خیال ہے جو آخر کار کامیاب ثابت ہوتا ہے سارے زمانہ وسطیٰ میں یہی نظر آئے گا۔

المانی اقوام کا جب رومی سلطنت سے تصادم ہوا تو رومی اثرات نے اُن کو خود اپنے سے متاثر کیا اور رومی اثرات المانی لباس میں ظاہر ہونے لگے۔ المانی آزادمنش اور مغرور تھے اُن کی نمایاں خصوصیت انفرادیت تھی رومی تہذیب اور ان خصوصیات کے میل جول سے جو چیز پیدا کی وہ انفرادی اصول حکومت تھا انفرادی اجزا کا شہنشاہی حکومت میں یکجا رہنا اب ناممکن تھا یہ اس تحریک کی ابتدا ہے جو اپنے حد کمال پر زمانہ وسطیٰ کے اختتام پر پہنچتی ہے۔

نئے اصول کی مخالفت کیجاتی ہے اور اس کو بار آور ہونے سے روکنے کی انتہا درجہ کوشش ہوتی ہے لیکن زمانہ کے اثر کو
روک نہیں سکتے۔ یہ مخالفت اور کوشش نہایت ہی ضروری چیز ہے یہی نتیجہ واقعات اور ضرورت زمانہ کا ہے۔ اگر ان قوتوں
کو روکنے کیلئے کوئی دوسری مخالف قوت نہ ہو تو یہ اپنی تیز رفتاری سے ساری سوسائٹی کو برباد کر کے ہنوز روز اول
کا تماشہ دکھانے لگتے۔ چنانچہ کارل اعظم نے مخالف قوت کا کام روا کیا یہ اپنے زمانہ کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس نے قدیم اصول
کی حمیت میں اپنی خدمت مفوضہ پوری کی اور اپنی حیات تک نئی قوتوں کو روکے رکھا اور بہت آہستہ آہستہ
ان کو جانشین ہونے کا موقع دیا گیا ورنہ اگر یہ مخالف قوت نہ ہوتی تو نہ معلوم اور کیا حشر ہوتا۔ المانی حملہ ناگزیر تھا
اس کے ساتھ کی بربادیاں ایک حد تک قابل اعتنا تھیں۔ ظاہر ایہ ایک عذاب تھا جو یورپ پر نازل ہوا لیکن باطن
اس کی تہ میں ایک اصول کام کر رہا تھا وہ شہنشاہیت اور مرکزیت میں اتحاد و یگانگت عالم کے خلاف ردعمل تھا۔ المانی
قوم ان خصوصیات سے مختص تھی اس ردعمل پورا ہونے کی صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک انقلابی صورت اور ایک
ارتقائی۔ انقلابی صورت جلد اثر دکھلاتی ہے لیکن یہ غیر فطرتی ہے اور دیرپا نہیں ہوتی تاریخی واقعات انقلابی
نہیں ہوتے وہ ارتقائی ہوا کرتے ہیں اور جو انقلابات تاریخ میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ایک ارتقائی واقعہ کے دوران
رفتار کی شدید صورت پیش کرتے ہیں مثلاً ایک بیمار کو کبھی نہ کبھی شدت مرض ہوتی ہے۔ اگر یہی انقلابی صورت اختیار
کی جاتی تو اس کے بہت برے اثرات مترتب ہوتے بجائے ترقی کے دنیا اور تنزل کی طرف ہٹ جاتی۔

المانی بربریت کو روکنے سے کچھ ان کو مقامی ضروریات کے موافق اپنی طبیعت ڈھالنے کا موقع ملے گا
اور اسی طرح رفتہ رفتہ وہ عالمگیر اصول جاگزیں ہوتا گیا۔

۸۸۷ء میں کارل کا انتقال ہوا لیکن تین صدیوں میں بربریت اور رومی تہذیب نے ایک دوسرے پر
اپنا پورا اثر کر لیا تھا اور ان دونوں کے اتحاد سے ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ قانونی جکڑ بندی اقوام کی غلامی
اور مرکزیت اپنی جا چھوڑ چکے تھے۔ انفرادی ازادی اور اس کے ساتھ جنگجو خصلت قومیت اور لامرکزیت
کے ساتھ رومی تہذیب کے اثرات یعنی فوجی انتظام شہنشاہ کی بجائے بادشاہ۔ عالمگیر قومیت کی بجائے مقامی قومیت
قائم ہو گئی اور فرانک۔ برگنڈی لمبارڈی وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔

ازمنہ وسطیٰ کے بیچوں بیچ جاگیرت اس انفرادیت کا بدترین متن اور روحی پہلو ہے اس کے خلاف پھر ردعمل
شروع ہوتا ہے اور اس کی روک تھام ہوتے ہوتے موجودہ زمانہ میں وہ تصفیہ شدہ ہو کر قومی انفرادیت قائم
ہو جاتی ہے دوسرا پہلو مذہبی ہے۔ عیسائی مذہب اپنے مراحل ابتدائی طے کر کے اور اس کی گوناگوں شورشوں
اور قدیم مذاہب مختلف کی زبردست عصبیت کا مقابلہ کرتے ہوئے کانسٹنٹین کے زمانہ میں سیاسی وجوہات کی
بنا پر سرپرستانے کا موقع پاتا ہے۔ اور ۳۷۵ء تا ۳۹۵ء میں تھیوڈوسیس اور گراشین نے آخر کار اس مذہب کو

قانونی اور ملکی مذہب بننے کا افتخار بخشا گرچہ کی مصروفیت اور کوشش نے دو ہی صدیوں میں سارے یورپ کو اپنے ذہن میں لے لیا۔

آئرلینڈ میں سینٹ کتھبرٹ جس کا انتقال ۶۸۷ء یا ۶۹۳ء میں ہوا سب سے پہلا مبلغ تھا۔ ساتھویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے عیسائیت کو کامل طور سے قبول کر لیا آٹھویں صدی کے درمیاں بونیفیس کی محنت جرمنی میں بارآور ہوئی۔

مگر یہ مذہبی پہلو سیاسی پہلو سے جدا نہیں ہے شہنشاہ نے اپنے اغراض کے لئے عیسائی مذہب کو موزوں جانکر رواج دیا اور عیسائیت گو وہ مسیح علیہ السلام کی نبوت کا نہیں بلکہ پطرس کی زبردست ابلہ فریبی اور دنیا پرستی کا منقلب اور ملتبس نتیجہ تھی اور تبلیغ و اشاعت سے زیادہ بزور شمشیر رومی سلطنت میں منوائی گئی۔ باوجود اس کے اس مذہب اور یورپ کے قدیم مذاہب میں بین فرق تھا اس میں اعلیٰ روحانیت اور آسمانی الوہیت کی کچھ نہ کچھ جھلک باقی رہ ہی گئی تھی اس لئے اس نے المانی بربریت اور انگریزی نامرادی کو دفع کرنے میں بہت امداد دی اور حملہ کے مضر اثرات کو روکنے میں اس کا بڑا حصہ ہے مگر پھر یہ خود گرچہ بھی ایک طرف انفرادی اصول کی ترویج دوسری طرف شہنشاہی حکومت کی بیخ کنی کا باعث ہو جاتا ہے رہبانیت اور پاپائیت "ادارے" کا وجود اپنے وقت کے لئے موزوں تھا۔ مذہبی رنگ میں شہنشاہ کی حکومت کی مخالفت اور پاپا اور شہنشاہ میں اختیارات کی تقسیم بھی ایک مخالفت تھی اتحاد کی پھر خانقاہیں اور گرجوں کی آپس میں تقسیم جن کی ابتدا اب ہو کر ریفرمیشن میں پائے تکمیل کو پہنچتی ہے اور آخر کار ہر قوم بلکہ ہر شخص کو مذہبی آزادی یعنی مذہبی انفرادیت حاصل ہو جاتی ہے اسی طرح غیر مہذب زبانیں ترقی کرتی ہیں اور یونانی اور لاطینی زبان کی ہمہ گیری زائل ہو جاتی ہے اور یہی بربری زبانیں آخر کار مہذب بن جاتی ہیں۔

یورپ کی تاریخ سے گزر کر ایشیا کو اگر ملاحظہ کیجئے تو یہاں پر بھی زمانہ وسطیٰ کے اثرات وہی نظر آئینگے خلافت کی ہمہ گیری کا زوال چاروں طرف اس کی مخالف قومی سلطنتوں کا قیام۔ جنگی اور امرائی اصول کی ترقی مرکزیت کی خلاف ورزی۔ انفرادیت کی عام مقبولیت۔ ہندوستان۔ ایران۔ افغانستان۔ سمرقند۔ بخارا۔ تاشقند۔ مصر۔ اندلس سب اعلیحدہ اعلیحدہ قومیں نظر آئینگی اور زمانہ اول کی یگانگت کہیں دکھائی نہ دے گی۔ مذہبی فرقہ واری کی ابتدا بھی اسی زمانہ میں مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ خلیفہ برائے نام رومی شہنشاہ کی طرح ایک زمانہ تک رہتا ہے لیکن اس کی اہمیت قطعاً گھٹ جاتی ہے اور کوئی سلطان اور امیر دراصل اپنے کو کسی کا محکوم نہیں سمجھتا یہ بجائے خود ایک طویل مضمون ہے

اس پر زیادہ بحث نہیں کی جا سکتی صرف ایک سرسری نظر ڈالنا اس لئے مناسب ہے کہ اس سے ہمارے نفس مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔ (جس کثرت سے سلطنتیں اور امارتیں دنیائے اسلام میں اس زمانہ میں پائی جاتی ہیں اور جو تاریخ اسلام میں من حیثیت المجموع زمانہ وسطیٰ ہے) جس طریقہ سے یورپ ہمہ گیر سلطنت۔ تہذیب و مذہب و زبان سے نکلکر بدترین لامرکزیت اور انفرادیت سے ہوتا ہوا موجودہ زمانہ کی تقسیم یعنی قومیت اور قومی تقسیم سیاسی مذہبی اور زبانی پر آگیا ہے اسی طرح اسلامی سلطنت زمانہ کے انقلابات و حادثات کا شکار ہوتے ہوئے وہ پستی اور زوال کے عالم میں پہنچ چکی ہے۔

زمانہ قدیم اور موجودہ زمانہ کے بیچ میں زمانہ وسطیٰ ایک عبوری دور ہے۔ زمانہ قدیم کے خلاف ایک اور عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی مختلف حالتوں سے گذرتا اور تدریجی ترقی کرتا ہوا کبھی تیز رفتاری کبھی سست رفتاری کبھی انقلابی کبھی ارتقائی طور پر زمانہ وسطیٰ کے آخر میں ختم ہوتا ہے اس تحریک کا ماحصل اور نتیجہ انفرادیت ہے اس انفرادیت کے مختلف پہلو ہیں۔

اسکی بدترین صورت امرائی حکومت ہے یعنی جاگیریت اور بہترین شکل قومیت ہے چنانچہ مرکزیت سے بغاوت کرکے دنیا مختلف حالتوں کا اندازہ کرتی ہوئی اور تجربے حاصل کرتی ہوئی موجودہ زمانہ تک آئی اور موجودہ زمانہ پھر اس حالت سے لازمی طور پر بغاوت کر رہا ہے انفرادیت کے خلاف ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ مضر اثرات کو روکنے کے لئے مخالف قوتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ کارل اعظم کی شخصیت بحیثیت شہنشاہ کے۔ پوپ کی شخصیت بحیثیت مذہب کے یورپ میں مخالف قوتیں ہیں۔ اس طریقہ سے سلطان صلاح الدین کی شخصیت دنیا اسلام میں اور علاؤ الدین خلجی کی شخصیت خاص ہندوستان میں اس مخالف قوت کی مظہر ہیں۔ اگر یہ قوتیں نہ ہوتیں تو معاشرہ اور تہذیب انسانی کا شیرازہ پارہ پارہ ہو جاتا اور دنیا نہیں معلوم کس ابتری اور زبون حالت پر پہنچ جاتی ان شخصیتوں کا وجود کوئی اتفاقی نہیں تھا بلکہ ضرورت زمانہ اور واقعات کی ارتقائی حالت اس کی مقتضی تھی اور یہی اُن کی پیدائش کا باعث ہوئی۔

علاؤ الدین خلجی کی شہنشاہیت پرستی ہندوستان میں زمانہ وسطیٰ کی انفرادیت اور لامرکزیت کے اصول کے خلاف بڑی زبردست روک تھی جس نے نہایت ہی کامیابی سے اپنا کام کیا اور دنیا کی تاریخ میں جو حصہ اس کے سپرد تھا اس کو اس نے پورا کیا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ

دکن نے جس پر ابھی ہم غور کرینگے اس ردعمل سے مفید فائدے اُٹھائے۔ دکن کی تاریخ ہم پڑھ چکے ہیں اوائل زمانہ یعنی زمانہ قدیم میں وہی عالمگیر اصول یہاں بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ چلو کیا سلطنت کی عالمگیری دکن میں اور چولا سلطنت کی شہنشاہیت جنوب بعید میں مسلمہ ہے کوئی انکی مخالفت نہیں کرتا اور صدیوں تک نہایت ہی شاندار طریقہ سے حکومت ہوتی رہی ہے تہذیب و تمدن زمانہ کے موافق اپنے انتہا پر پہنچ چکتے ہیں دکن کے تعلقات بیرونی دنیا سے ہم دیکھ چکے ہیں نہ صرف عرب و ایران چین و مصر بلکہ سلطنت روما اور یونان سے قائم ہیں امن و امان کی وجہ سے لوگ ادبی اور معاشرتی اغراض کو پورا کرتے ہیں۔ شاعری۔ بت تراشی۔ معماری کے فنون ترقی پر ہیں۔ فلسفہ۔ جغرافیہ۔ فلکیات۔ علم نباتات۔ علم ہندسہ وغیرہ پائے تکمیل کو پہنچے ہیں۔

گیارھویں صدی عیسوی سے زمانہ وسطیٰ کہلانے والے اثرات پیدا ہوجاتے ہیں۔

وکرما دتیا کی بغاوت صرف ایک وجہ تحریک تھی عالمگیر اثرات کے ظہور پذیر ہونیکا راجہ اسوکا اور موریا سلطنت رومی سلطنت کی مانند ہندوستان میں عالمگیر حکومت تھی۔ موریا سلطنت کے بعد اندھرا قوت نے اپنا لوہا سارے ہندوستان سے منوایا افسوس ہے کہ اس کے بعد تین صدیوں تک تاریخ خاموش ہے ورنہ ہم کو اس سے واقعات کا تسلسل قائم کرنے میں بڑی مدد ملتی۔

چھٹی صدی عیسوی میں چلوکیا سلطنت دکن میں عالمگیر حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ راستوں کی خرابی اور ارسال رسل و رسائل کی کمی نے ہندوستان اور دکن کی تاریخ کو ہمیشہ علیحدہ رکھا۔ اس لئے اب عالمگیریت سارے اقلیم ہند کی نہیں بلکہ دکن کے لئے چلوکیا سلطنت نے قائم کی۔ چلوکیا راجہ دراصل شہنشاہ تھے جو سارے دکن کی وسعت پر حکومت کرتے تھے۔ کرتی ورمن اور پولاکسن دوم نے نہایت ہی بہادری سے اس شہنشاہیت کو قائم رکھا۔ ہندوستان اور دکن کی رقابت ایسی ہی ہے جیسے یونان اور روما کی۔ چنانچہ پھر ایک کوشش پاوشاہ کے زمانہ میں اُن کو متحد کرنے کی کیگئی لیکن زمانہ اُس کے لئے موزوں نہ تھا۔ ہیون تسانگ کا سفرنامہ پولاکسن کی عظمت و وقار کا نمونہ ہے۔

اس کے بعد راشٹر کوٹ دو سو سال دکن کی سلطنت کو چلاتے رہے اور پھر چلوکیا گیارھویں صدی عیسوی تک اپنے فرض کو انجام دینے میں کامیاب رہے جس کا اندازہ گذشتہ اوراق سے ہوسکتا ہے۔ سلطنت کی عظمت اور اُس کی مرکزیت پر کبھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا۔

اور باجگذار ہمیشہ اپنے کو شہنشاہ کے نوکر تصور کرتے رہے لیکن آنے والے زمانہ کے اثرات دکھاتا دم کی بغاوت سے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں صوبہ داروں اور باجگذار سلطنتوں کی لاپروائی اور مخالفت وجیالا کی بغاوت زمانہ وسطیٰ کی ابتدا کرتے ہیں لامرکزیت نمایاں ہونے لگتی ہے اور انفرادی اصول ترقی کرتا جاتا ہے۔ دکن میں تین زبردست صوبہ دار خود مختار بادشاہ بنجاتے ہیں جنوب میں بھی ہوسلہ کی مخالفت زمانہ وسطیٰ کا پیش خیمہ ہے۔ چولا سلطنت جو اپنا کام بارھویں صدی تک پورا کرتی رہی آخر کار مختلف حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

زمانہ قدیم کے آخر میں چھ سات بڑی سلطنتیں اور بیسیوں چھوٹی ہوا تین سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں جس کا اندازہ تاریخ دکن کے سرسری مطالعہ سے ہو سکتا ہے جو ہم نے اوپر پیش کر دیا ہے یہ لامرکزیت اور انفرادیت روز افزوں ترقی کرتی ہے اور اپنی پوری قوت سے انسانی معاشرۂ تہذیب و تمدن کو سیلاب کی طرح بہا لیجاتی ہے۔ نہ صرف سیاسی شیرازہ بکھرتا ہے بلکہ مذہبی اثرات اتحاد بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں ملک کے گوشہ گوشہ سے نفسانفسی کی صدا بلند ہوتی ہے۔ اب سلطنت کی حفاظت کیلئے قلعے تیار نہیں کئے جاتے بلکہ ہر حصے پر اور جہاں جو کوئی سورما ہوتا ہے اپنی اور اپنے متعلقین کی حفاظت کے لئے قلعے تیار کر لیتا ہے جسکا پتہ ابتک دکن کے ہر گاؤں اور قریہ میں ملتا ہے۔ مذہبی تفرقہ کی زبردست تحریک بھی تنزل کی طرف رہبر تھی اس لامرکزیت کو روکنے والی قوتیں سب اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں اور زمانہ وسطیٰ کے اثرات بہت بری طرح جاگزیں ہو رہے تھے۔ تہذیب و تمدن مٹ چکا تھا صرف جنگ و جدال فوجی کارنامے لوٹ مار اور اسکی گونج اس کے سر کی نوبت پہنچ چکی تھی کہ ۱۲۹۴ء میں علاؤ الدین خلجی نے اپنی مخالف قوت کے تحت دکن پر حملہ کیا۔ گو اس کی سلطنت دکن پر زیادہ دن قائم نہ رہ سکی بلکہ وہ ایک آنے والی قوت کا پیش خیمہ تھی اور گو ملک کافور دکن اور جنوب بعید میں مدھرا تک پہنچ گیا لیکن یہ ہرا دل تھے تغلق شاہی حملے کے۔

محمد تغلق نے سلطنت دکن کو اپنے قبضہ میں لاکر ایک حد تک روعمل کا کام کیا مگر خود ہندوستان میں زمانہ وسطیٰ اپنا رنگ پوری قوت سے دکھلا رہا تھا۔

امیر قرون وسطیٰ میں یورپ کے سورماؤں کا کام کر رہے تھے۔ محمد تغلق کی نااہلی نے اور واقعات کو پیچیدہ کر دیا۔ ابتک صرف ہندو لامرکزیت تھی لیکن اب اس میں مسلمان بھی شامل ہو گئے اور نہ صرف دکن بلکہ سارا ہند اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔

ایسے وقت زبردست قوتوں کی ضرورت تھی جو نئے خیالات کو بار آور ہونے دیتیں اور اُن کے مضر اثرات کو بھی روکے رہتیں۔ ہندوستان میں بابر کی تخت نشینی اس کا کام کرتی ہے اور دکن میں اس کو علاؤالدین حسن گنگو پورا کرتا ہے۔ گو وہ خود ایک سورما ہے لیکن اس نے اپنا فرض ادا کیا۔ صرف دکن میں حیثیت المجموع بغاوت نہیں کر رہا تھا بلکہ دکن میں ہر حصہ دوسرے حصہ سے باغی تھا اور ہر فرد دوسرے کا مخالف تھا۔

ایسی صورت میں ایک تحریک جو معاہدہ معاشری کے قریب ہو سکتی ہے دکھنی امراء میں پیدا ہوتی ہے گو یہ خود مرکزیت کے خلاف تھی لیکن یہی ایک دوسری مرکزیت کا باعث ہوتی ہے جس نے اپنے کام کو نہایت ہی عمدگی سے انجام دیا۔

امیر اسمٰعیل کی تخت نشینی برائے نام ایک مرکزی قوت قائم کر دیتی ہے اور جب بیرونی مقامات سے جان و مال کا خوف جاتا رہتا ہے اور کچھ وقت سوچنے بچار کا ملتا ہے تو علاؤالدین گنگو کی شخصیت اپنی ضرورت کو محسوس کر کے اُس کو آگے لاتی ہے اور ۱۳۴۵ء میں تخت دکن پر جلوہ افروز کراتی ہے۔

خواہ علاؤالدین گنگو برہمن کا غلام ہو یا در اصل شاہان ایران کی نسل سے ہو وہ تخت نشین ہوتے ہی انہیں قوتوں کو جو مرکزیت کو توڑ رہی تھیں اپنے قابو میں لاتا ہے اور ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔

وہی امراء جو بادشاہت دہلی کی مخالفت میں جگہ جگہ بغاوت اور لوٹ کھسوٹ مچائے ہوئے تھے اب ایک علم کے نیچے متحد ہو جاتے ہیں اور اُن کا مطمح نظر خود غرضی سے بلند ہو کر ایک اور اعلیٰ اور ارفع زمینہ پر قائم ہوتا ہے۔ اسمٰعیل کی تمکرامی پر اس کا قتل اور امراء کی اطاعت پتہ دیتی ہے کہ کس قدر جلد وہ اپنی حکومت اور عزت قوم کی نظروں میں قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

حسن کے بیٹے کی شادی میں ایک سال کا جشن بتلاتا ہے کہ اس ہنگامہ بے تمیزی اور خونریزی کے بعد آخر کار کامل اطمینان اور امن و امان قائم ہو گیا جس نے علاؤالدین حسن کو ایک سال تک جشن منانے کی فرصت دی یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک عیاش شخص تھا جو موقع پاتے ہی ملک کے کاروبار کو چھوڑ کر عیش و عشرت میں گزارنے لگا۔

علاؤالدین کو بہت کچھ کرنا تھا صرف بادشاہ بنجانا کافی نہ تھا اور نہ دکن کو اپنے وقتیہ

بادشاہ کی ضرورت تھی۔

ایک سلسلہ بادشاہوں کا درکار تھا جو زمانہ وسطیٰ کے اثرات کو روکے ہوئے ارتقائی منازل طے کراتا ہوا سیدھے راستے لے چلے۔ اس عظیم الشان کام سے وہ غافل نہ تھا چنانچہ اس کا جشن منانا اُس کی عیش پرستی نہ تھی بلکہ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایک گونہ اطمینان اس جلیل القدر اور مصروف شخص کو ستانے کے لئے مل گیا۔ ملک سیف الدین غوری کی بہن شاہ بیگم کو اپنی بہو بنا کر سال بھر تک خیر و خیرات انعام و اکرام میں بسر کی۔

فوج کثیر اور دولت بے انتہا دکن میں منتشر پڑی تھی علاؤالدین نے ملک کو اپنے امراء میں تقسیم کر کے سب کو ایک ملک میں باندھ دیا اور فیوڈل جاگیریت کو نظام کو جو لامرکزیت کا موید تھا مرکزیت میں شامل کر لیا۔ اس کی دو وجوہات ہوئیں ایک تو یہ کہ مسلمانان دکن کا تعلق اب بالکل ہندوستان سے ٹوٹ گیا اور انہوں نے اس کو اپنا ملک بنا لیا یہاں استقامت حاصل کرنے کی ضرورت نے انہیں متحد کر دیا چنانچہ بادشاہت کے قائم ہوتے ہی امراء نے بغیر کسی چون چرا کے اس کی اطاعت قبول کر لی دوسری وجہ یہ کہ بادشاہت انہیں کی مرضی سے قائم ہوئی تھی اور جو دہلی کے خوف کا سدباب تھی۔ علاؤالدین نے مقبوضہ ملک کو امراء میں تقسیم کر کے جو جاگیری نظام حکومت کی ابتدا ڈالی اس سے ہندو رعایا جو پریشان حال تھی اس کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ اور خود مختار چھوٹے چھوٹے جاگیردار آپس میں لڑنے جھگڑنے اور پُر امن مشغولیتوں کا لطف خراب کرنے والے باقی نہ رہے۔ یہ مسلمان جاگیردار ایک منظم جماعت تھی جو خاص جوش و فروش اور خاص خیالات اور خصوصیات اپنے ساتھ رکھتی تھی۔

اُن کی قسمت ان کے بادشاہ کی قسمت کے ساتھ وابستہ تھی اور بادشاہ کی قسمت امراء کی قسمت سے وابستہ۔ اس لئے وہ لامرکزیت کے مخالف تھے اور بادشاہ کی اطاعت اور وفاداری میں دن رات مستعد تھے۔

اسمٰعیل خاں کا بادشاہت کر کے تخت سے دست بردار ہونا اور پھر سپہ سالاری کے عہدے کو خوشی سے قبول کر کے امراء میں داخل رہنا اور مہمات سلطنت میں مدد دینا ان تعلقات کو واضح کرتا ہے جو بادشاہ اور امراء کو شیر و شکر کئے ہوئے تھے۔

ان امراء کی وجہ سے رعایا کا رشتہ بادشاہ سے راست بندھ گیا۔ نئے نظام کے تحت

بادشاہ سارے ملک کا مالک منبع فیض وعدل اور سپہ سالار تھا اُس کی سماجی حیثیت مثل ایک باپ کے تھی۔ امرا در اصل جاگیردار تھے جنہیں فوجیں فراہم کرنے کے لئے موضعے بادشاہ کی جانب تفویض کئے جاتے تھے اور بادشاہ کو ہر وقت ان کے واپس لینے کا اختیار تھا۔

نظریہ کی شکل میں یہ واقعات اس طرح ڈھالے جاسکتے ہیں کہ علاؤالدین کے ہمعصر امرا میں معاہدہ ہوا ہر ایک نے ایک وقت میں اپنے حقوق کو ایک شخص کے تفویض کر دیا جو اس معاہدہ کا فریق نہ تھا۔ سارا ملک مقتدر اعلیٰ کا۔ کل حکومت اُس کی اگر وہ حفاظت کرے تو ہم اپنی جان و مال عزت آبرو ملک اور دولت اور حکومت سب اُس کے تفویض کرتے ہیں چنانچہ یہی ہوا ورنہ جو حق اسمٰعیل کو تھا وہی ملک سیف الدین غوری کو اور وہی علاؤالدین بہمنی کو۔ مگر امرا نے اسمٰعیل کو اپنا مقتدر اعلیٰ بنایا اُس نے اپنے میں قابلیت نہ دیکھی اور اقتدار کو علاؤالدین کے سپرد کیا دوسرے جو اپنے حقوق دے چکے تھے اب اطاعت اور فرمانبرداری میں کمربستہ ہوگئے چونکہ سارے ملک کے یہ مالک تھے لہذا یہی عام خلائق کے نمائندہ تھے رعایا کا خاموشی اور خوشی سے علاؤالدین کی حکومت کو قبول کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ امرا کے تصفیہ سے راضی تھی۔

اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ برہمن جو ہندوؤں کا سب سے زیادہ سربرآوردہ فرقہ ہے اس نے کبھی اس کے پیشتر اہل اسلام کی نوکری قبول نہیں کی اور ہمیشہ آزادانہ بسر کرتا رہا۔ لیکن علاؤالدین حسن بہمنی پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس کے یہاں سینکڑوں برہمن نوکر ہوئے اُس کے خزانہ اور محاسبی پر برہمن متعین تھے اور حیرتناک واقعہ یہ ہے کہ آج تک بھی برہمن ہی محاسبی میں کثرت سے حکومت کی نوکری کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ اس وقت بھی یہی لوگ کثرت سے خزانہ عامرہ اور صدر محاسبی میں پائے جاتے ہیں۔

اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں ایک تو یہ کہ علاؤالدین صرف مسلمانوں کا بادشاہ نہ تھا۔ اس کو دکھنیوں نے اپنا قومی بادشاہ تصور کیا جس میں دکھنی قوم بلا امتیاز مذہب و زبان کے اس کو قبول کر لیا دوسرے اُس کی بادشاہت ہندو مسلم اتحاد کا انتہائی نمونہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں اپنے قومی مفاد اور ملک کی بہبودی کے لئے ایک دوسرے کے حلیف و مددگار رہتے۔ بادشاہ بادشاہ دکن تھا اور سب اُس کی رعایا۔

جب علاؤالدین کا تسلط دکن پر ہو گیا اور ملک دکن میں ایک آزاد سلطنت قائم

ہوگئی تو کولاس اور اس کے مضافات کی مہم کو ختم کرکے سلطان نے افواج کو اطراف واکناف میں روانہ کیا تاکہ طوائف الملوکی کا خاتمہ کرکے سارے ملک اور ساری قوم کو ایک جھنڈے کے نیچے لے آئے چنانچہ رائے ورنگل اور دوسرے چھوٹے چھوٹے راجاؤں نے جو چلوکیا سلطنت کے ٹوٹنے کے باعث خود مختار ہوگئے تھے اور ہمیشہ آپس میں جنگ وجدل کرتے رہتے تھے حلقہ اطاعت قبول کیا اور سارا دکن صرف ایک بادشاہ کی حکومت میں آگیا۔

مرکزی حکومت استوار ہوگئی ملک کے لئے قوانین۔ ضوابط مرتب کئے گئے اور مختلف صوبوں میں سارے دکن کو تقسیم کرکے مرکزی حکومت نے اپنے صوبہ دار مقرر کئے۔ جو خاندانی اور موروثی نہ تھے۔

اب ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور مذکورہ واقعات کے مطالعے سے یہ آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زمانہ وسطیٰ کے مغر اثرات کو روک کر اس کے رجحانات کی تنجانی کے لئے۔ جس قسم کی مخالف قوت کی ضرورت تھی وہ علاؤ الدین حسن کی شخصیت میں ظاہر ہوئی اس نے انفرادی اصول کی اس حد تک مخالفت کی کہ جاگیری حکومت کو اس کے بُرے اثرات ظاہر نہ کرنے دئے اور انہیں روک دیا اور قومی مرکزیت قائم کرکے سب کو اس کا تابع فرمان بنا دیا اور زمانہ کا ساتھ اس طرح دیا کہ عالمگیر شہنشاہیت کی مخالفت میں اس نے قومی حکومت قائم کی اور اس کی بنیاد ڈالی گو یہ ابتداء تھی لیکن اس کی انتہا موجودہ سلطنت دکن ہے۔ علاؤ الدین حسن کی شخصیت ناگزیر تھی اور اس کی اہمیت تاریخ دکن میں بہت بڑی ہوئی ہے۔ دکھنی تہذیب تمدن مذہب زبان اپنا ایک خاص رنگ اور آن بان رکھتے ہیں ان کا بانی مبانی سلطان علاؤ الدین ہی تھا اس نے جس کام کی ابتداء کی وہ دیرپا اور مستقل تھا۔ گو کچھ دونوں تک مخالف اثرات نے پھر فیروزہ کو پریشان کرنے کی کوشش کی لیکن دراصل موجودہ دکھنی قومیت اور اس کی خصوصیات کی ابتداء اسی کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے دکن کی تاریخ کا تسلسل برابر آج تک قائم ہے چلوکیا سلطنت کا جانشین جانشر علاؤ الدین حسن تھا۔ اور اس کی بعد سے تاریخ صاف ہے۔ زیادہ صراحت کی ضرورت نہیں آپس کی شادی بیاہ میل ملاپ اور قومیت نے بلحاظ مذہب دکنی قوم کی یگانگت کو آجتک قائم رکھا ہے بہت سے ہندوانی رسومات اور اسلامی طریقے مل جل کر ایک نئی چیز بنگئے ہیں اور اسی کا نام دکھنیت ہے۔

بہمنی خاندان کا نمود اپنے زمانہ میں لازمی تھا اور عالمگیر واقعات کے تحت مسلمہ اصولوں کی پابندی میں اس کا ظہور ہوا وہ بطور نتیجہ پیدا ہوا اور وہ علت ہی موجودہ زمانہ کی۔ ہماری حکومت قومی اور ملکی حکومت ہے جس کو قوم نے اپنی خوشی سے قبول کیا اور یہی وجہ ہماری تاریخ کے تسلسل اور ہماری تدریجی ترقی کی ہے۔ ہماری تاریخ ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی یہاں تک آئی ہے۔ اس میں انقلابی صورت نہیں ہے اس کے ہر واقع میں علت و معلول کا تعلق ہے۔ اور اس کا بحیثیت مجموعی تاریخ عالم سے تعلق ایسا ہی ہے جیسے جزو کا کل سے۔

افسوس ہے کہ بعض ناگزیر واقعات کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہ ملا کہ کافی طور پر میں اس اہم تاریخی دور پر تبصرہ کرسکتا تاہم جو کچھ ہوسکا وہ ایک سرسری انداز کیلئے کافی ہے۔ انشاء اللہ کسی اور وقت بہمنی سلطنت کے احسانات پر کچھ ہدیہ ناظرین کیا جاسکیگا اور اس میں سلطان کی حکومت کے ایام کے تفصیلی حالات درج کرکے خاص اس کی حکومت پر نظر ڈالی جائے گی۔

غزل

(از جناب عشق رام پوری)

یہی شرط وفا ہے کیا یہی رسم محبت ہے۔ میں دم دیتا ہوں تیرا اور تمہیں غیر ونکی چاہت ہے
نہ مجھسے پوچھتے ہیں وہ نہ کچھ کہنے کی حاجت ہے مری صورت ہی اسکی ترجمان جو دلکی حالت ہے
وفا کہتے ہیں کس کو مرنے والے کیسے ہوتے ہیں یہ منظر بھی دکھا دینگے جو اپنا دم سلامت ہے
بھلا میں اور شکوہ آپ کی بے التفاتی کا جفا بھی ہو تو گویا آپ کی مجھ پر عنایت ہے
کرو تم شوق سے پامال لیکن سوچ لو اتنا یہ وہ دل ہے کہ جس دل میں تمہارا راز الفت ہے
غضب ہے وہ مرے پہلو سے اٹھکر غیر کو جائیں قیامت آئیگی اک دن یہ اک تو اب قیامت ہے
مرا دل چھینتے ہیں اور یہ بھی کہتے جاتے ہیں کسی سے پوچھنے کی اسمیں کیا بھی ضرورت ہے
رسائی گوش جاناں تک کہاں اب نہیں آتی ہماری آہ بھی کمبخت اتنی پست ہمت ہے

کسی پر دین و مذہب عشق کا ظاہر نہیں ہوتا
نہ داخل ہے طریقت میں نہ پابند شریعت ہے

نواب مسعود جنگ بہادر صاحب امیر جامعہ اسلامیہ علیگڈھ

بھوت

از

(جناب ایم - اسلم صاحب)

میں اکثر لوگوں کی طرح نہ تو توہم پرست ہوں اور نہ ہی طبیعت کا اسقدر کمزور واقع ہوا ہوں کہ جہاں کہیں بھوت یا آسیب کی بات سنی وہیں خوف زدہ ہوگئے۔ اگر سچ پوچھو تو میں ایک حد تک بھوت کے وجود کا قائل بھی ہوں۔

فی زمانہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے "جو حیات بعد الممات" کے نظریہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اپنی آنکھوں سے کسی مدتوں سے بچھڑے ہوئے عزیز کو دیکھ کر بھی یہ کہنے کی کہ "ہاں ہم نے دیکھا ہے" جرات نہیں کرتے اور پھر دوسروں کو یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ جو کچھ مشاہدہ میں آیا ہے وہ وہم کی پیدا کردہ چیز نہیں بلکہ ایک حقیقت امر ہے۔ یہ ایک قسم کی اخلاقی کمزوری ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ قرار دیجا سکتی ہے کہ دیکھنے والا خود کشمکش و پیچ میں ہوتا ہے اور حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی آنکھوں نے اُسے دھوکا نہیں دیا۔

اس قسم کے واقعات عموماً ایسے مقامات میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ جہاں مرنے والے نے ایک طویل زمانہ تک قیام کیا ہو۔ اور جہاں ایسی متعدد چیزیں موجود ہوں جو اس کی یاد کو تازہ کرتی رہیں۔ یا بالفاظ دیگر مرنے والا اپنے گھر میں اپنا ایک دائمی نقش چھوڑ جاتا ہے اور اُس کی ہر چیز دیکھ کر اُس کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کسی چیز کی یاد اُس کی محبت سے زندہ رہتی ہے اور محبت کی مقدار کے مطابق دل متاثر ہوتا رہتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر مرنے والے کی محبت اور یاد دل میں مستور ہے تو اُس کی دید سے آنکھیں کیوں محروم ہیں تو اُس کا جواب صرف اس قدر دیا جا سکتا ہے کہ یہ صرف اپنی آنکھوں کا قصور ہے۔ "وہ" جس کی محبت آپ کو بے قرار رکھتی ہے مختلف حالتوں کے ماتحت اکثر آپ کے پاس موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کو دیکھتے نہیں تو سمجھ لیں کہ ابھی آپ کو اور زیادہ انہماک اور جستجو کی ضرورت ہے۔

بعض لوگ اس بات پر فخر کیا کرتے ہیں کہ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ لیکن اگر یہ حضرات ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یہ "ہجوم دوستاں" کچھ زیادہ لطف کی چیز نہیں۔ مجھسے اگر کوئی پوچھے تو میں اتنا عرض کروں گا کہ اس وسیع دنیا میں میں نے حتہ الوسہ بہت کم دوست پیدا کئے ہیں۔ میری طبیعت کی افتاد ہی کچھ ایسی ہوئی ہے کہ میرے ملنے جلنے والے بہت جلد مجھ سے اکتا جاتے ہیں اور یہ اُسی کی طفیل ہے کہ آپ مجھے اکثر تنہا ہی پائینگے۔ صبح و شام دریا کی سیر میرا روزانہ معمول ہے لیکن تین سو پینسٹھ دن میں سے تین سو چونسٹھ دن آپ مجھ کو تنہا ہی لب جو ٹہلتے دیکھینگے۔ یہ اور بات ہے کہ بارود کی زبان سے آتشیں باتیں کرنے والی بندوق گاہے گاہے آپ میرے کندھے پر دیکھ لیں۔

میں قدرتاً خاموشی اور تنہائی پسند ہوں۔ اور اکثر "بقائے دوام" کے مسئلہ پر غور و فکر کیا کرتا ہوں۔ میں اس دنیا اور اُس کے دھندوں کو ایک نقلی کھیل سمجھتا ہوں اور بسا اوقات نقالوں کی انگشت نمائی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے کھیل تماشوں میں بھی شریک ہو جاتا ہوں جنہیں اکثر لوگ کچھ پسندیدہ نہیں سمجھتے۔

میرے ملنے جلنے والوں میں ایک ڈاکٹر بھی ہیں۔ اور جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مجھے ممنون کرنے کے لئے وہ اس تمنا میں رہتے ہیں کہ میں بیمار ہو جاؤں اور وہ میرا علاج کریں۔ حالانکہ ان کو یہ خوب معلوم ہے کہ میں علاج اور پرہیز کا چنداں قائل نہیں۔ انسان دنیا میں اس لئے نہیں آیا کہ اپنی مختصر سی زندگی پرقیود عائد کرتا رہے۔ خصوصیت سے کھانے پینے والی چیزوں کے معاملہ میں۔

ڈاکٹر صاحب کو بھی بھوتوں کے قصے افسانے پڑھنے یا ایسے مقامات کی سیر کا بہت شوق ہے جہاں اس قسم کے واقعات ظہور پذیر ہونے کی افواہ ہوا کرتی ہے۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔

میں نے اپنی کرسی سے کسی قدر اُٹھتے ہوئے اُن سے ہاتھ ملایا۔ وہ ایک آرام کرسی کھینچ کر میرے پاس ہی بیٹھ گئے اور بولے۔

"کہو کس فکر میں ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں اس وقت اس فکر میں تھا کہ دیکھیں حشر کے روز کے لوگ آپ پر غلط علاج کرنیکا دعوے کرتے ہیں"

"اوہو تم میری فکر میں تھے۔ لیکن تمہارا رنگ کیوں زرد ہو رہا ہے"

"اس خوف سے کہ آپ آتے ہی کوئی پرہیز بتلا دینگے" لیکن آپ اتنے روز کہاں رہے"

ڈاکٹر بولا

"میں پہاڑ پر گیا تھا"

"تو پہاڑ کی خوب سیر کی کہاں ٹھہرے تھے"

"ارادہ تو یہ تھا کہ ایک عزیز کے ہاں جو مدت سے وہیں کاروبار کرتے ہیں قیام کرونگا لیکن وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ اُن کے بچے بیمار ہیں۔ اور ایک دو مہمان بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس لئے مجھے اور جگہ تلاش کرنی پڑی۔ ایک ڈاکٹر کا مکان کرایہ پر مل گیا"

"اچھا ہوا" میں نے کہا "کہ ڈاکٹر کو ڈاکٹر کا ہی مکان ملا۔ ہم پیشہ آدمی کی صحبت میں تو خوب بسر ہوئی ہوگی"

"نہیں" ڈاکٹر بولا "مکان خالی تھا۔ دس برس سے کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر کہاں چلا گیا ہے۔ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ ایک چوکیدار ہے جو مکان کی رکھوالی کرتا ہے اور ایک مختار ہے جو کرایہ وصول کر کے ڈاکٹر کے ایک عزیز کو جو کسی شہر میں رہتا ہے بھیج دیتا ہے"

"یہ تو خاصی مسٹری ہسٹری" میں نے ہنسکر کہا "شاید اس مکان میں بھوت رہتے ہوں گے۔ اور ڈاکٹر اُن کے خوف سے بھاگ گیا ہوگا"

"سنو تو سہی" ڈاکٹر میرے زانوں پر ہاتھ مار کر بولا "ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں"

"فرمائیے میں ہمہ تن گوش ہوں"

"تو ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر دس سال سے گم ہے۔ اس کی پریکٹس کچھ زیادہ نہ تھی کچھ مدت سے اُس نے کاروبار بالکل بند کر دیا۔ اور ساتھ ہی لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے گوشہ نشیں ہو گیا۔ اس تمام عرصہ میں وہ ایک خاص موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرتا رہا۔ جب کتاب تیار ہو کر شائع ہوئی تو اس کے ہم پیشہ ڈاکٹروں نے اس کے متعلق یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب نہ تو میں نے دیکھی ہے اور نہ ہی افسوس مجھے اس کا نام یاد ہے۔ لیکن جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے یہ کتاب اس موضوع پر تھی کہ

انسان موت کا صحیح وقت بہت پہلے بتلا سکتا ہے۔۔۔۔ اگر غور کیا جائے تو یہ نظریہ ایک دیوانے آدمی کی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

"معلوم ہوتا ہے" میں نے مسکرا کر کہا "آپ کی عقل بھی گھاس چرنے گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کے دیوانہ پن کی اور دلیل کیا ہو سکتی ہے؟"

"ارے یار بات تو پہلے سن لو۔ پھر رائے بھی دیجیو" ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھے اکثر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے کئی لوگوں کی موت کے متعلق پیشگوئی کی اور وہ حرف بحرف پوری اتری۔ لیکن جو کچھ میں تم کو سنانا چاہتا ہوں وہ اس سے بھی عجیب تر ہے۔"

"آپ نے کتاب تو تلاش کی ہوتی" میں نے کہا۔

"تلاش کیا خاک کرتا" ڈاکٹر نے کہا "کتاب کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا۔ تو ہاں جب میں نے یہ مکان کرایہ پر لیا تو تمام سامان عین اسی حالت میں پڑا تھا جیسے مالک چھوڑ گیا تھا۔ لیکن یہاں کی فضا بہت اداس معلوم ہوتی تھی یا یوں سمجھو کہ تمام گھر میں وحشت برستی تھی۔ اور میں اس کے اثر سے بہت دنوں تک محفوظ نہ رہ سکا۔ چند روز کے قیام کے بعد میری طبیعت میں بھی کچھ الجھن سی پیدا ہونے لگی۔

گو یہاں ملنے جلنے والوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ تاہم میرا اکثر وقت مطالعہ کرتے یا بربط بجاتے گزر جاتا۔ ڈاکٹر کے مطالعہ کا کمرہ جہاں بہت سی نادر اور دلچسپ کتابیں رکھی تھیں۔ غالباً اس مکان میں بہترین جگہ تھی۔ سامنے کی جانب کوہسار کا دلفریب نظارہ تھا۔ دور فاصلہ پر برفانی چوٹیاں جن پر شعاع آفتابی مختلف وقتوں میں مختلف رنگ پیدا کرتی رہتی تھی بہت خوشنما نظر آتی تھیں۔

لیکن اس کمرے میں آتے ہی کچھ خوف سا دامنگیر ہونے لگتا تھا۔ اور مطالعہ میں دل نہ جمتا تھا۔

اس کمرے کی جنوبی دیوار پر ڈاکٹر کی قد آدم تصویر آویزاں تھی اور مصوری کا ایک نادر نمونہ پیش کرتی تھی۔ تصویر دیکھنے سے ڈاکٹر کی عمر پچاس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اور شکل و صورت سے خوش وضع اور خوش قطع آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن طرفہ تر بات یہ تھی کہ جس روز سے میں نے یہ تصویر دیکھی تھی اس کا تصور یا خیال ہر وقت میری بغل میں یا آنکھوں کے سامنے موجود رہتا تھا۔

ایک روز میں کھانے سے فارغ ہو کر کھانے والے کمرے کا دروازہ بند کر کے اسی کمرے میں سے جہاں تصویر آویزاں تھی گزرتا ہوا اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں روشنی کے لئے ایک بتی تھی۔ اچانک میری نگاہ ڈاکٹر کی تصویر پڑی۔ بتی کی دھندلی سی روشنی میں آج مجھے اس تصویر میں زندگی کی ایک خفیف سی لہر نظر آ رہی تھی۔ میں بتی اوپر اٹھا کر غور سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر مختلف سمتوں سے اُس پر روشنی ڈالی۔ اس وقت جو کیفیت میں اس تصویر میں محسوس کر رہا تھا۔ آج سے پہلے مجھے اس کا تجربہ نہ ہوا تھا۔

میں نے تصویر دیکھتے دیکھتے ایک بار پیچھے پلٹ کر جو دیکھا تو اس وقت ایک شخص اُسی کمرے کی جانب سے جسے میں بند کر کے آیا تھا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے کمرے کی طرف والے دروازے کی جانب جا رہا تھا۔

لطف یہ تھا کہ اس کے چلنے کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی تھی جس وقت وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی مالک مکان ڈاکٹر تھا جس کی تصویر میں ابھی ابھی دیکھ رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی خود بخود معذرت کے طور پر یہ الفاظ میری زبان سے نکلے۔

"معاف فرمائیے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ واپس تشریف لے آئے ہیں۔"

لیکن ڈاکٹر نے جواب میں صرف ایک انگلی منہ پر رکھ لی۔ گویا مجھے خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ میرے سونے والے کمرے کی جانب چلا گیا۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہ وہاں بھی موجود نہ تھا۔

میں رات بھر اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اور اسی فکر میں آنکھ لگ گئی۔ اگلے روز صبح صبح مجھے گھر سے طلبی کا تار آیا۔ اور میں یہ عقدہ حل کئے بغیر وہاں سے چل دیا۔ . . . . . .

... ممکن ہے کہ تم اسے میرا وہم کہو۔ یا یہ کہو کہ میں نے بھوت دیکھا ہو گا۔"

"وہم نہیں تو اور کیا ہے . . . چلو بھوت ہی سہی۔" میں نے ڈاکٹر کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن کیا آپ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر ہی تھا؟"

"بلاشک و شبہ۔ تم تو اسے شاید کوئی افسانہ سمجھتے ہو گے۔ خدا کی قسم ڈاکٹر زندہ سلامت موجود ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اُسے چوک میں آج پھر دیکھا ہے" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اور آپ نے اُسے پہچان لیا۔ کچھ بات بھی ہوئی؟"
ڈاکٹر بولا
"میرے دیکھتے دیکھتے وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔ لیکن جب میں چوک کے سرے پر کھڑا ایک اخبار دیکھ رہا تھا تو وہ اچانک میرے پاس سے گذرا اور مجھے دیکھکر رُک کر بولا۔
"ڈاکٹر چھوڑو اخبار کو۔ جاؤ بربط بجاؤ اور فرشتوں کو گیت سناؤ۔"
میرے دیکھتے دیکھتے وہ پھر کہیں اِدھر اُدھر لوگوں میں مل جل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔"
"تو شائد وہ زندہ ہی ہو" میں نے کہا
"کون جانے؟ لیکن اس کے الفاظ جب یاد آتے ہیں تو طبیعت کچھ پریشان ہونے لگتی ہے۔"
کچھ دیر تک ڈاکٹر میرے پاس بیٹھا رہا۔ لیکن اس کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔
اگلے روز صبح صبح اس کا خادم میرے پاس آیا بہت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا بیچارہ بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔
میں نے پوچھا
"کیوں خیر باشد؟"
وہ رونی صورت بنا کر بولا۔
"ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے چل بسے۔"
"کیا کہا۔ کب؟" میں نے انتہائی تعجب سے پوچھا "ارے کل شام تو وہ میرے پاس سے بھلے چنگے گئے تھے۔"
خادم صرف اتنا کہہ کر "جنازہ دس بجے تک اُٹھے گا" چلا گیا۔
میں جلدی سے تیار ہو کر ڈاکٹر کے مکان پر پہنچا۔ مجھسے پہلے اس کے کئی دوست وہاں پہنچ چکے تھے۔ جب ہم اُس کے کمرے میں گئے تو وہ ایک گہری نیند میں سوتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بربط اور دوسرے میں گز تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بربط بجاتے بجاتے سو گیا ہے۔

اقبال

(اپنی رُباعیات کی روشنی میں)

(از جناب عزیز احمد صاحب)

عجم از نغمہ ام آتش بجان است — صد گامن در ائے کارواں است
مُدی را تیز تر خوانم چو عرفی — کہ رہ خوابیدہ و محمل گراں است
(اقبال)

(۱)

جب مشرق کا کوئی شاعر تمام اصنافِ سخن کو اپنی شوخیٔ تحریر کا فریادی بنا چکتا ہے۔ اور اُس کی مسلّمہ قابلیت، شاعری کی ہر صنف کو اپنے جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیتی ہے تو وہ رُباعی کی طرف توجہ کرتا ہے۔

رُباعی کیا ہے؟ ——— صرف چار مصرعے۔ مگر وہ چار مصرعے جن میں مطالب و معانی کے دریا بند ہوتے ہیں۔

چار قطروں میں علم و معانی کے دریا بھرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اور اگرچہ رُباعیات لکھنے والے شعراء حشرات الارض کی طرح موجود ہیں، مگر خیام اور سرمد شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ عجم کے تقریباً تمام بلند پایہ شعرا نے رُباعی کی طرف توجہ کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو فارسی رُباعیاں معرفت اور فلسفے کے دریا نظر آتی ہیں۔

(۲)

ناظرینِ کرام خیام اور سرمد کے صہبائے سخن سے مست ہوں گے۔ مگر آج میں آپ کے سامنے ہندوستان کے سحر طراز شاعر علامہ اقبال کی فارسی رباعیاں پیش کرتا ہوں ——— معرفت کے لبالب ساغر، جو اہلِ وطن کی بے توجہی سے محفلوں میں نہیں آئے۔

اقبال کی ذات پر ہندوستان جس قدر فخر کرے کم ہے۔ آپ اقبال کو اسلام کے شاہنامہ کے شاعر کی حیثیت میں، ہندوستانی شاعر کی حیثیت میں، شاعرِ شرق کی حیثیت میں، فلاسفر کی حیثیت میں اور صوفی کی حیثیت میں دیکھ چکے ہونگے۔ آج میں اقبال کی شاعری کا ایک اور رُخ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں

اقبال کی رباعیات، ان کے زندۂ جاوید شاہکار "پیامِ مشرق" کے آغاز میں "لالۂ طور" کے عنوان سے شائع کی گئی ہیں۔ ملک میں اور ملک کے باہر پیامِ مشرق کی بہت قدر ہوئی۔ اور اس قدر میں "لالۂ طور" کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ مگر غالباً بہت کم حضرات نے "لالۂ طور" کو خالص رُباعی کی روشنی میں دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہوگی۔

قصہ مختصر یہ کہ میں اقبال کو صرف ان کی رُباعیوں کی روشنی میں دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ جس سے مُجملاً اندازہ کیا جاسکے کہ مادرِ ہند کے اس مایۂ ناز سپوت کو صنفِ سخن میں کس قدر کمال حاصل ہے۔

(۳)

اقبال کی تمام تر رُباعیاں برقِ طور کی تجلّی پاشیوں سے منور نظر آتی ہیں۔ یہانتک کہ اُن کی ہر ہر رباعی میں خواہ اُس کا حاصل کچھ ہی کیوں نہ ہو معرفت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ توحید و معرفت میں شعرائے عجم نے بادۂ تخیلات کو بالکل خالی کر دیا تھا۔ اور کسی شاعر کے لیے نئے خیالات پیدا کرنا، تقریباً ناممکن تھا۔ مگر اقبال کی طبعِ رسا، وہ پھول توڑتی ہے، جن تک عجمی شعرا کے خیالات تک بھی نہ پہنچ سکے۔ مثلاً اقبال لکھے ہیں:۔

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت — فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم — منم از آدمی پائندہ تر بود

یہی نہیں بلکہ وہ ہر خیال کو اس جدّت طراز اور دلکش اسلوب سے ظاہر کرتے ہیں، کہ دل پر خاص اثر ہوتا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو کسی رُباعی گو شاعر میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اقبال کو مغربی ادب، مغربی خیالات، مغربی اسالیبِ بیان، اور مغربی فلسفے پر عبور حاصل ہے اور یہ خصوصیت متقدمین تو کیا اُن کے ہمعصروں میں بھی بہت کم پائی جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

شنیدم در عدم پروانہ می گفت — دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشان کن سحر خاکسترم را — ولیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

(۴)

عمر خیام لکھتے ہیں:۔

مقصود ز جملہ آفرینش مائیم — در چشمِ خرد جوہرِ بینش مائیم
ایں دائرۂ جہاں چو انگشتری است — بے ہیچ کسے نقشِ نگینش مائیم

لیکن اقبال کا تصورِ خیال کہیں آگے نکل گیا ہے:۔

نوائے عشق را ساز است آدم — گشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوبتر ساخت — گر با ایزد انباز است آدم

عمر خیام لکھتے ہیں:۔

کس را پسِ پردۂ خدا راہ نشد — وز سرِ خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس ز قیاسِ خویش چیزے گوید — معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نشد

لیکن اقبال اسکے قائل نہیں۔ اُن کے نزدیک:۔

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است — نہ با ہر کس محبت سازگار است
ببر دیدِ لالہ یا داغِ جگر تاب — دلِ لعلِ بدخشاں در شرار است

اور اگر خیام کا فلسفہ قابلِ قبول سمجھا جائے، تب بھی اقبال نا اُمید نہیں ہوئے:۔

دریں گلشن پریشاں مثلِ بوئیم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئیم
بر آید آرزو یا بر نہ آید — شہیدِ سوز و سازِ آرزوئیم

اور اس طرح وہ کشاکشِ دوام میں فراغتِ دوام کی لَے پالیتے ہیں اور اُن کا یہ خیال عمر خیام کے فلسفے سے کہیں زیادہ بلند پایہ نظر آتا ہے۔

عمر خیام بادۂ ناب کے شیدا ہیں، مگر اُن کے بادۂ ناب میں غالباً "برف کی امیزش" کی وجہ سے سوز و گداز زیادہ نمایاں نہیں نہ اُن کے گہرے فلسفے کی دُردِ آشامی بادہ کشوں کو مست کر دیتی ہے:۔

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما — کے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ ز مے — زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

لیکن اقبال صرف جذباتِ صادقہ، اور حرارتِ دلی کا دہکایا ہوا ایک جام پیش کرتے ہیں، جو سینوں کو گرما دیتا ہے اور دلوں کو تڑپاتا ہے:۔

شنیدم در حرم پروانہ می گفت — وے از زندگی تاب و ہم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را — دلیکن سوز و سازِ یک شبم بخش

عمر خیام کی شرابِ معرفت، مغرب اور مشرق سے یکساں مزاج میں حلول کر گئی، اور وہ حقیقتِ منتظر کا جلوہ لباسِ مجاز میں اس خوبی سے دکھاتے ہیں، کہ اُس کی حقیقت تک

پہنچنے کے لئے دیدۂ نگراں کی ضرورت ہے۔ اقبال کھلے میدان میں مے معرفت کے ساغر لنڈھاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں، جو حق و باطل اور روح و مادے کی جنگ کا زمانہ ہے، حقیقت عریاں کو پیش کرنے کی سخت ضرورت ہے اور شاعرِ مشرق ہونے کی حیثیت سے یہ اُن کا فرض ہے کہ شرق کی روحانیت کو مغرب کے مقابلے میں پیش کریں۔

عمر خیام لکھتے ہیں:۔

خشتِ سرِ خم زِ مملکت جم بہتر — بوئے قدح از خدائے مریم بہتر
آہ سحرے زینۂ خمارے — از نالۂ بوسعید و اوہم بہتر

مگر اقبال لکھتے ہیں:۔

نفس آشفتہ موجے از یم اوست — نالۂ ما، نغمۂ ما، از دم اوست
لبِ جوئے ابد چوں سبزۂ رستم — رگِ ما، ریشۂ ما، از نَم اوست

لیکن وہ خیام کے عیش و نشاط کے مخالف ہیں:۔

سخن درد و غم آرد، درد و غم بہ — مرا ہیں نالہائے دمبدم بہ
سکندر رازِ عیشِ من خبر نیست — نوائے دلکشے از ملکِ جم بہ

آج مغرب فٹز جیرالڈ کی نقاب کشائیوں کے طفیل خیام کے جام و سبو سے مخمور ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یورپ کی مادہ پرست سرشت عمر خیام کے ضمیر کو جذب کر سکی؛ ورنہ میری نظر میں اقبال کی رباعیوں کا درجہ بھی کم نہیں۔

(۵)

سر ابندر ناتھ ٹیگور جن کا زمزمۂ توحید، مشرق اور مغرب سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے، "گیتاں جلی" کو اِن حقیقت پاش الفاظ سے شروع کرتے ہیں:۔

"تیری مرضی نے میری تخلیق میں لا انتہائی مُضمر رکھی ہے۔ اس کوزۂ خاکی کو تو بیم خالی کرتا اور پھر حیاتِ نو سے لبریز کرتا رہتا ہے۔"

لیکن اقبال کہیں زیادہ بلند پروازی سے لکھتے ہیں:۔

سفالم رائے او جام جم کرد — درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد، اندر سرم بتخانہ ریخت — خلیل عشق دیرم را حرم کرد

اب ناظرین ہی انصاف فرمائیں کہ کس کا خیال عرش سے آگے نکل گیا۔

ٹیگور ایک جگہ فرماتے ہیں :-

"جب تو مجھے نغمہ سنجی کا حکم دیتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دل بار فخر سے ٹکڑے ہو جائیگا۔ میں تیرے رُخ زیبا کی طرف دیکھتا ہوں۔ اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ فرحتِ نغمہ سنجی سے مخمور ہو کر میں تجھکو اپنا محبوب کہہ اُٹھتا ہوں، حالانکہ تو میرا آقا ہے"

اب ذرا اقبال کا تخیل ملاحظہ کیجیے :-

چو ذوقِ نغمہ ام در جلوت آرد قیامت افگنم در محفلِ خویش
چو می خواہی، دمے خلوت بگیرم جہاں را گم کنم اندر دلِ خویش

ٹیگور فرماتے ہیں :-

"اے مجنون تو خود کو اپنے ہی شانوں پر لے جانا چاہتا ہے۔ اے بھکاری تو اپنے ہی دروازے پر بھیک مانگنے آیا ہے۔ یہ تمام بارِ گراں رہنے دے۔ اُس کے لئے، جس میں اس کے اُٹھانے کی سکت ہے۔ اور غفلت سے پیچھے مُڑ کر مت دیکھ"

علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

کنشت و مسجد و بتخانہ و دیر جُز ایں مشتِ گلے پیدا نہ کردی
زِ حکمِ غیر نتواں جُز بدلِ زیست تو اے غافل دلے پیدا نہ کردی

(۹)

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور کہ جان تو زِ خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

ٹیگور فرماتے ہیں :-

"تو خاموش ہے، تو میں بھی اپنے دل کو خاموشی اور ضبط سے مزین کرونگا۔ میں خاموش رہوں گا، اور اختر بیدار شب کی طرح سر جھکا کر تیرا انتظار کرونگا"

مگر اقبال کی آتش طبیعت اس افسردگی کی متقاضی نہیں :-

تو من با شاعرِ رنگیں بیاں گوئے چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود رامی گدازی زآتشِ خویش نہ شامِ دردمندے بر فروزی

ممکن ہے کہ بعض "نیگو رپسند" حضرات کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو مگر میں نے خالص حقیقت آپ کے سامنے پیش کر دی ہے۔

(۶)

جب شاعری حقیقی جذبات، اور دلی کیفیات کا عکس بن جاتی ہے تو اُس کو الہام کہا جا سکتا ہے۔ شاعر کا دل جس کی حقیقت کو یمنی من نے بڑی شدّ و مدّ سے واکیا ہے، اپنے اندر بہت سے محشر برپا رکھتا ہے۔ اب دیکھئے علامہ اقبال کی نظر دلِ سوزاں کی کیا حیثیت ہے۔

جہاں مشتِ گلِ دل حاصلِ اوست — ہمیں یک قطرۂ خون مشکلِ اوست
نگاہِ ما دوبیں افتاد ورنہ — جہانِ ہر کسے اندر دلِ اوست

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلے درد آشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

بہ کوشش ہا سپاری اے دلِ من! — مرا تنہا گزاری اے دلِ من!
دما دم آرزوہا آفرینی — مگر کارے نداری اے دلِ من!

چہ می پرسی نہانِ سینہ دل چیست — خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن — چو یک دم از تپش افتاد گل شد

دلِ من! اے دلِ من!! اے دلِ من!!! — یمِ من، کشتیِ من، ساحلِ من!
چو شبنم بر سرِ خاکم چکیدی — دریا چوں غنچہ رستی از گلِ من

(۷)

اگرچہ کہ اقبال کی رباعیات کا بیشتر حصہ معرفت، اور سوز و گداز سے لبریز ہے، مگر وہ اس صنف میں بھی وہ فرض نہیں بھولے ہیں جو نشاۃِ ثانیہ کا شاعر ہونے کی حیثیت سے اُن پر عائد ہے۔ وہ صوفی بھی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ فلاسفر بھی، لیڈر بھی۔ لکھتے ہیں:-

زجانِ بیقرار آتش کشادم — دمے در سینۂ مشرق نہادم
گلِ او شعلہ زا و از آتشِ من — چو برق اندر نہادِ او فتادم

قبائے زندگانی چاک تا کے؟ — چو مُوراں آشیاں در خاک تا کے؟
بہ پروازِ او شاہیں بیا موز — تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے؟

مسلماناں مرا حرفیست در دل — کہ روشن تر ز جانِ جبرئیل است
نہانش دارم از آذر نہاداں — کہ ایں سرّے ز اسرارِ خلیل است

(۸)

اقبال کی کم و بیش ڈیڑھ سو رباعیاں ہیں، جن میں سے ہر ایک "دامانِ رنگ و بو" اور "مے سے بھرا سبو" سے ہلوالت اجازت نہیں دیتی کہ ان سچے موتیوں کو رولوں۔ مگر بے اختیار چند رباعیاں لکھ رہا ہوں، اب آپ خود اندازہ فرمایئے کہ اقبال کو اس صنف میں کیا مرتبہ حاصل ہے۔

(۱) سحر می گفت بلبل باغباں را — دریں گل جز نہالِ غم نگیرد
بہ پیری می رسد خارِ بیاباں — ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

(۲) سحر در شاخسارِ بوستانے — چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری — سرودے "نالہ" آہے "فغانے"

(۳) اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند — دلِ چند پارہ اے خونابہ بارے
ز ابرِ نوبہاراں گریہ آموز — کہ از اشکِ تو روید لالہ زارے

(۴) بگردوں فکرِ تو دارد رسائی — ولے از خویشتن ناآشنائی
یکے بر خود کشا چوں دانۂ چشمے — کہ از زیرِ زمیں نخلے برائی۔

(۵) دریں گلشن پریشاں مثلِ بوئیم — نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئیم
برآید آرزو یا بر نیاید — شہیدِ سوز و سازِ آرزوئیم

(۶) خرد گفت "او بچشم اندر نہ گنجد" — نگاہِ شوق در آویزد و ہم است
نمیگردد کہن افسانۂ طور — کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

(۷) ز رازی بمعنی قرآں چہ پرسی — ضمیرِ ما بآیا با آتش دلیل است
خرد آتش فروزد، دل بسوزد — ہمیں تفسیر نمرودے خلیل است

(۸) ندانم بادہ ام یا ساغرم من — گہر دردانیم یا گوہرم من
چناں بینم چو بر دل دیدہ بندم — کہ جانم دیگرست، و دیگرم من

(۹) مرا مثلِ نسیم آوارہ کردند — دلم مانند گل صد پارہ کردند
نگاہم را کہ پیدا ہم نہ بینند — شہیدِ لذتِ نظارہ کردند

(۱۰) گریز از آخرِ عقلِ ذوفنوں کرد — دلِ خود کام را از عشقِ خوں کرد
ز اقبالِ فلک پیمانہ پرسی — حکیمِ نکتہ دانِ ما جنوں کرد

(۹)

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

کیا صرف علامہ اقبال کی رُباعیات ہی حضرت گرامی کے اِس شعر کی تصدیق نہیں کرتیں۔

غزل

از

(جناب سید قادر حسن صاحب قادر)

نکلو بھی گھر سے بیٹھے ہیں اُمیدوار لوگ — بے چین مضطرب ہمہ تن انتظار لوگ
آخر سبب بھی اُسکا کوئی اُسکی وجہ بھی — کوچہ میں اُس کے پھرتے ہیں کیوں بیقرار لوگ
میں اور جرمِ عشق سے توبہ کروں غلط — کیا فیصلہ کرینگے مرا ملکے چار لوگ
تقدیر میں جو ہے وہ بھگتنا ضرور ہے — میری طرف سے لیتے ہیں کیوں دل پہ بار لوگ
ابتو خیال و خواب میں ہیں وضعدارياں — سنتے تھے جس جہاں میں کبھی وضعدار لوگ
تم تم کسا رہتا ہی جوشِ جنوں فزوں — رہ رہ کے چھیڑتے ہیں عبث مجھکو یار لوگ
پی ہی جو لیکے قرض تو پی ہی کسی کو کیا — پیچھے پڑے ہیں کیوں مرے کھا کر اُدھار لوگ
اس کی بھی کچھ خبر ہے تجھے اوستم شعار — اُمید ہی میں مرگئے اُمیدوار لوگ
دیکھو زبان دے کے بدلنا نہ تھا تمہیں — ہاتھوں سے اپنے ہوتے ہیں کیا اعتبار لوگ
تم کو ہے مجھسے کام مجھے تم سے کام ہے — مانو نہ تم جو تم کو اُبھاریں ہزار لوگ
قادر حسین ہے کہیں چھپ جائے دخترِ رز — کرتے ہیں مشورہ بھی آپس میں یار لوگ

امام سیوطی اور تاریخ

مترجمہ
(جناب مولوی فاضل حافظ نثار احمد صاحب الحسینی)

سیوطی مشہور ہیں نام جلال الدین عبدالرحمٰن ابن ابی بکر ہے۔ سیوط مصر کا بڑا مردم خیز شہر ہے، یہ وہیں کے رہنے والے ہیں اسی لئے سیوطی کہلاتے جمیع علوم میں عالم متبحر ہو گزرے ان کو تمام عمر سوائے لکھنے پڑھنے کے گویا کوئی کام ہی نہ تھا مقبول عام و خاص کم از کم ان کی پانسو تصانیف موجود ہیں ۹۱۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ التشاریخ فی التاریخ انہیں کا ایک رسالہ ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ (از مترجم)

تاریخ کی ابتدا جب سے کہ حضرت آدم جنت سے اُتارے گئے اور اُن کی ذریات منتشر ہوئی اسی وقت سے اولاد آدم نے تاریخ شروع کی حتیٰ کہ خداوند کریم نے حضرت نوح کو مبعوث فرمایا۔

طوفان نوح پھر بعثت حضرت نوح سے طوفان نوح تک تاریخ لیجاتی رہی حتیٰ کہ طوفان میں جملہ کائنات ارضی غرق ہو گئی۔ بعد کو حضرت نوح جب طوفان سے نجات پاکر سمعہ ذریات و اہل سفینہ زمین پر آباد ہو گئے تو آپ نے تمام روئے زمین کو تین حصوں میں تقسیم کرکے درمیانی حصہ سام کو دیا جس میں بیت المقدس نیل فرات دجلہ سیحون جیحون اور قیون ہیں یہ حصہ وسط قیشون سے مشرق نیل تک اور وسط جنوب سے تا آخر شمال ہے۔

اور مغرب نیل اور اُس کے ماسوا سے تا آخر مشرق حام کے حصہ میں دیا۔

تیمون اور اُس کے ماسوا سے تا آخر مغرب نیل یافث کا حصہ ہوا۔

آتش نمرود جب بنو اسماعیل کی تعداد بڑھی اور جس کے بعد وہ متفرق ہوئے تو

بنو اسحاق نار ابراہیم سے تا بعثت حضرت یوسف تاریخ لیتے رہے پھر یوسف سے حضرت موسےٰ تک اور موسےٰ سے ملک سلیمان تک اور سلیمان سے بعثت حضرت عیسےٰ ابن مریم تک پھر عیسےٰ سے سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک۔

تاریخ عرب بنو اسماعیل نے نار ابراہیم نیز بنا کعبہ سے بھی (جبکہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے اس کو بنایا تھا) تاریخ شروع کی تھی چنانچہ بنائے ابراہیمی سے تفرقۂ بنی اسماعیل تک یہی مبدء تاریخ تھا۔

عام الفیل بنو اسماعیل سے جو لوگ بچ رہے تھے یہ سعد و نہد جہینہ کے خروج سے کعب ابن لوی کی وفات تک تاریخ کا آغاز لیتے رہے۔ پھر کعب کی وفات سے سنہ فیل تک اور سنہ فیل سے حضرت عمر ابن الخطاب کے تعین تاریخ تک۔

حضرت عمر کا تعین مبدء ۱۷ھ یا ۱۸ھ ہجری میں ہوا ہے[1]

ابن جریر کی رائے ابن جریر کہتا ہے کہ ایسی تشریح یہودی تاریخ کے متعلق مناسب ہوگی کیونکہ اہل اسلام نے سوائے ہجرت اور کہیں سے آغاز تاریخ نہیں رکھا ہے ہاں قریش و قبل اسلام سنہ فیل سے تاریخ لیتے رہے اور تمام عرب اپنی مشہور لڑائیوں کو مبدء تاریخ قرار دیتے تھے جیسے یوم جبلہ و کلاب اول و کلاب ثانی وغیرہ

رومی و ایرانی عیسائی زمانہ سکندر ذی القرنین سے تاریخ لیتے تھے اور ایرانی اپنے سلاطین کے زمانہ سے تاریخ لینے کے عادی تھے۔

مبدء تاریخ اگلے زمانہ میں حضرت آدم کے نزول جنت سے لیکر حضرت نوح کی بعثت تک انسان کے لئے کوئی مبدء تاریخ نہ تھا جہاں سے آغاز تاریخ ہوتا پھر طوفان نوح سے تاریخ ہو کر نار ابراہیم تک رہی نیز بنی اسماعیل کی جانب سے از بناء کعبہ تا وفات کعب ابن لوی تاریخ تھی پھر وفات کعب سے سنہ فیل تک حتیٰ کہ اہل اسلام نے ہجرت سے تاریخ آغاز کی[2]

تاریخ ہجری کا آغاز نبی صلعم نے ماہ ربیع الاول کے یوم قدوم مدینہ کو آغاز تاریخ کے لئے حکم دیا[3]

---

[1] علی ابن محمد و ابن جریر لیکن ابن جریر نے اس تفصیل میں ایسے اختصار سے کام لیا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ ابن مریم رسول اللہ صلعم تک تاریخ رہی [2] ابن عساکر [3] ابن عساکر۔

شہاب نے کہا کہ جس روز نبی صلعم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے یہی روز مبدء تاریخ ہوا ابن عساکر کہتے ہیں کہ یہ بہت ٹھیک ہے اس سے بچاؤ ہو گیا کہ حضرت عمر تاریخ کے آمر ہیں۔

اس تاریخ کے بانی آنحضرت ہیں

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ قول اول کی تائید میں میں نے ابن القماح کی تحریر اُن کے مجموعے میں دیکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن الصلاح نے کہا کہ میں نے استاد ابو طاہر محمدؐ ابن محمش الزیادی کی کتاب الشروط سے معلوم کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کو آغاز تاریخ کیلئے مقرر فرمایا۔ کیونکہ جب آپ نے نجران کے نصاریٰ کو مراسلہ بھیجا ہے تو حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ اس میں ۵ھ ہجری لکھ دیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت کو مبدء قرار دینے والے خود رسول اللہ ہیں اور حضرت عمرؓ اس معاملہ میں حضورؐ کے پیرو ہیں۔

تحقیق

۔ اس موقع پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس حدیث سے تاریخ کا آغاز ۵ھ سے ہوتا ہے اور پہلی حدیث سے یوم قدوم یہ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث اول میں جو یوم قدم المدینہ میں ظرف ہے وہ فعل آمر سے متعلق نہیں بلکہ تاریخ سے متعلق ہے اس صورت میں یہ مفہوم ہوگا کہ اس دن سے تاریخ کا حکم دیا نہ کہ اس دن میں غور کرو یہ ایک عمدہ لطیفہ ہے۔

حضرت ابن عباس کا مقولہ ہے کہ آغاز تاریخ اسی سنہ سے ہے جس میں کہ نبی صلعم مدینہ تشریف لائے[۱]

حساب کی غلطی

سعد نے کہا کہ لوگوں نے حساب میں غلطی کی جو بعثت رسول اللہ صلعم یا وفات آنحضرت سے تاریخ کا شمار نہیں لیا بلکہ آپ کی مدینہ میں تشریف آوری سے شمار لیا ہے[۲]

لیکن مصعب نے اسی شئے کے تذکرہ کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ قریش کا آغاز تاریخ ہاشم ابن مغیرہ کے وفات سے تھا یعنی اُنکا آخری مبدء تاریخ۔ بخاری نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ لیکن باخطاء الناس (لوگوں نے غلطی کی) کا ذکر نہیں کیا ہے۔

کتابت میں کس نے پہلے تاریخ لکھی

کتابت میں تاریخ لکھنے والے پہلے شخص یعلے ابن امیہ امیر یمن ہیں جبکہ انہوں نے حضرت عمر کو ایک مراسلہ

---

[۱] جریج [۲] تاریخ صغیر محمدؐ ابن حسان و مصعب۔

بھیجتے وقت لکھی تھی۔[1]

فاروق اعظم نے اس کو رواج دیا۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ مہاجرین کو جمع کر کے کہتے تھے کہ تاریخ کب سے لکھیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جس دن سے کہ نبی صلعم نے ہجرت فرمائی۔ ابو موسیٰ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ آپ کے پاس سے غیر مورخ مراسلے وصول ہوتے ہیں تاریخ لکھا کیجئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس معاملہ میں مشورہ فرمایا۔ بعض نے کہا کہ بعثت نبی صلعم سے تاریخ رکھیئے بعض نے کہا کہ وفات سے۔

تاریخ ہجری کا اصلی سبب حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں بلکہ ہم ہجرت سے تاریخ رکھتے ہیں کیونکہ ہجرت ہی نے حق و باطل میں تفریق کی چنانچہ اسی ہجرت سے تاریخ بھی معین کر دی الغرض تاریخ ہجری پر سب متفق بھی ہو گئے۔[2]

تاریخ کے اول کاتب کی نسبت ابن المسیب کا قول ابن المسیب کہتے ہیں کہ تاریخ لکھنے والے پہلے شخص حضرت عمرؓ ہیں کہ بہ مشورۂ حضرت علیؓ انہوں نے اپنی خلافت کے دوسرے سال بعد لکھی تھی یہ واقعہ سولہویں محرم کا تھا۔

محرم سے ابتداء ایک مسلمان نے یمن سے آکر حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں نے وہاں ایک چیز دیکھی ہے جس کو وہ لوگ تاریخ کہا کرتے ہیں اور فلاں اور فلاں مہینہ لکھا کرتے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ ہے تو ٹھیک (سب سے مخاطب ہو کر) تم تاریخ وضع کرو چنانچہ جب تاریخ کے لئے سب متفق ہو گئے تو آغاز حساب کے لئے مشورہ کیا بعض لوگوں نے ولادت رسول اللہ صلعم سے رائے دی اور بعض نے آنحضرت کی بعثت سے اور بعض نے وہ وقت بتایا جب کہ رسول اللہ ہجرت کر کے مکہ سے روانہ ہوئے بعض نے وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رائے دی حضرت عمرؓ نے تصفیہ فرمایا کہ آنحضرت کے مکہ سے روانگی مدینہ کے وقت سے آغاز حساب تاریخ کرو۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کس مہینہ سے آغاز ہوا کرے جس سے سنہ کی ابتدا ہو بعض نے کہا کہ رجب چونکہ زمانہ جاہلیت میں عرب اس مہینہ کی بڑی عظمت کرتے تھے۔ بعض نے رمضان کی رائے دی۔ اور بعض نے ذی الحجہ کیونکہ اس میں حج ہے بعض لوگوں نے کہا کہ وہی

---

[1] امام احمد ابن حنبل، واقدی، تاریخ صغیر، ابن عساکر، ابو الفداء۔

مہینہ جس میں کہ آنحضرت نے ہجرت فرمائی۔ بعض نے کہا کہ جس مہینہ میں حضور مدینہ میں تشریف لائے۔ حضرت عثمان نے فیصلہ فرمایا کہ آغاز سال کی تاریخ محرم کی ابتداء سے لیا کرو اس لئے کہ وہ شہر حرام بھی ہے اور شمار شہور میں پہلا بھی ہے۔ ماسوا یہ مہینہ لوگوں کو حج سے فراغت دلا کر واپس کیا کرتا ہے لہذا محرم ہی سے آغاز سال رکھو یہ واقعہ ۱۷ھ یا بقول بعض ۱۶ھ ہجری کے نصف ماہ ربیع الاول کا ہے۔[1]

ایک نکتہ مصنف کا قول ہے کہ محرم سے آغاز سال میں ایک اور بھی نکتہ ہے چنانچہ سعد ابن منصور نے اپنی سنن میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے والفجر کو انہوں نے کہا کہ یہ وہی ماہ محرم ہے جس کو فجر سنہ کہنا چاہیئے۔ بیہقی نے بھی اس کو شعب میں لکھا ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں کہ اس حدیث سے اس اعتراض کے حکیمانہ جواب کا پتہ چلتا ہے کہ آغاز تاریخ ربیع الاول سے موخر کر کے محرم میں رکھی گئی باوجودیکہ مبدء تاریخ بالاتفاق ہجرت قرار پائی اور یہ تو ربیع الاول ہی میں تھی۔[2]

عبید ابن عمر نے کہا کہ محرم شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) اور راس السنہ ہے اس میں خانہ کعبہ کو پوشش دیجاتی ہے اور تاریخ آغاز ہوتی ہے اور درہم ڈھلتے ہیں۔[3]

فائدہ ۔ سنہ ہجری کی یکم محرم پنجشنبہ ۹۳۳ ذوالقرنین کے ماہ ایار میں تھی۔[4]

(تاریخی فوائد)

میقات شناسی اوقات مشروط کا علم شیوخ کی وفات و ولادت اور اُن کے راویوں کا علم یہ جملہ فوائد تاریخ سے حاصل ہوتے ہیں اس سے جھوٹوں کا جھوٹ اور سچوں کا سچ معلوم ہوتا ہے قرآن میں وارد ہے یاایہا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ (اے ایمان والو جس وقت کسی اُدھار کی معاملت کسی معین وعدہ پر کیا کرو تو لکھ لیا کرو) حضرت عمرؓ کے پاس ایک دستاویز پیش ہوئی جس میں شعبان کی میعاد تھی چنانچہ حضرت عمر نے جرح کی کہ کونسا شعبان آیا گذشتہ یا موجودہ کہ آئندہ؟ پھر صحابہ سے فرمایا کہ تاریخ وضع کرو چنانچہ بعض نے کہا کہ رومیوں کی تاریخ لکھا کرو تو

---

[1] ابن ابی خیثمہ [2] الی لابن حجر [3] یعقوب بن القسوی [4] ابن عساکر۔ ابن القوس۔

حضرت نے جواب دیا کہ اُن کی تاریخیں طولانی ہوتی ہیں (طولانی حساب کی ہوتی ہیں) کہ زمان ذی القرنین سے اُن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ بعض نے رائے دی کہ ایرانیوں کی تاریخ لکھا کرو تو فرمایا کہ جب اُن کے یہاں جدید بادشاہ ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی ساتھ تاریخ سابق بھی تبدیل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ سب کے سب ہجرت سے آغاز حساب تاریخ پر متفق ہو گئے جس کو دس ہی برس ہوئے تھے چنانچہ ہجرت نبی صلعم سے تاریخ لی گئی۔[۱]

کذب راوی کی شناخت جب راویوں نے کذب شروع کیا تو ہم نے تاریخ کے استعمال کا انتظام کیا۔[۲]

جب کسی شیخ (راوی حدیث یا محدث) پر کذب کا الزام آئے تو زمانہ کا حساب کر لیا کرو اور مروی عنہ کے زمان زندگی کو دیکھا کرو۔[۳]

ہمیں گاؤبین روایت پر تاریخ کے مثل مدد دینے والی اور کوئی شئی نہیں۔[۴]

فوائد متعلقہ

اول تاریخ تو ماہ قمری کی ہے جو کبھی اُنتیس اور کبھی تیس دن کا ہوتا ہے (جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے) بخلاف حساب ماہ شمسی جس میں ہمیشہ تیس دن ہوتے ہیں لہذا یہ ماہ قمری سے بڑھ جایا کرتا ہے سورۂ کہف میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلبثوا فی کہفہم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعا (اور ٹھہرے یہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال اور انہوں نے نو کا اضافہ کر لیا) مفسرین کہتے ہیں کہ نو کی زیادت قمری حساب سے ہے ورنہ شمسی حساب سے صرف تین سو ہوتے ہیں۔

احادیث سے حساب قمری کی تائید قمری حساب کی تائید احادیث ذیل سے بھی ہوتی ہے انا امۃ امیۃ لانکتب ولانحسب (ہم امی قوم ہیں حساب کتاب نہیں کرتے) اذا رأیتموہ فصوموا اذا رأیتموہ فافطروا (چاند دیکھ کر روزے رکھا کرو اور چاند ہی دیکھ کر روزے چھوڑا کرو)

---

[۱] بخاری فی ادب المفرد۔ الحاکم [۲] ابن عدی [۳] حفص ابن غیاث [۴] حماد ابن زید۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازدواج میں سے کسی سے ایلاء[1] کیا اور انتیسویں دن اُن کے پاس بھی تشریف لے گئے حتیٰ کہ حضور سے اس متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے۔

باستثنائے ماہ استحاضہ و نفساء شریعت میں ہر مہینے سے ماہ ہلالی ہی مراد ہوتا ہے۔[2]

دوم چونکہ رات دن سے قبل ہے اس لئے تاریخ رات سے لینا ضروری ہے۔ قرآن میں ہے کانتا رتقاً ففتقناھما (زمین و آسمان منہ بند تھے پھر ہم نے اُن کو کھولدیا) مفسرین نے بیان کیا ہے کہ ارتقاق (بندش) کے ساتھ ظلمت ہی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ نور (دن) سے سابق ہے۔

پہلے خدا نے نور و ظلمت کو پیدا کیا اور اُن میں تمیز اس طرح پر کی کہ ظلمت کو رات اور نور کو دن بنایا۔[3]

پنجم اسمائے شہور و ایام

یکشنبہ (الاحد) خود اس نام کا تقاضہ ہے کہ وہ ہفتہ کا پہلا دن ہو۔[4] ابن عباس فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ نے یوم الاحد (یکشنبہ) کو پیدا کیا اسی لئے یوم الاحد سے موسوم کیا۔[5] عرب اس دن کو یوم اول کہتے تھے۔ لیکن ہمارے متاخرین اصحاب حدیث مسلم التربۃ یوم السبت الخ (خدا نے مٹی شنبہ کو پیدا کی پہاڑ یکشنبہ کو درخت دوشنبہ میں مکروہ اشیاء سہ شنبہ میں نور چہار شنبہ میں حیوانات منتشر کئے پنجشنبہ میں اور جمعہ میں عصر کے بعد آدم کو پیدا کیا) کے قائل ہیں۔

نصاریٰ و یہود کی روایت اہل توریت کا مقولہ ہے کہ خلق دنیا خدا نے یکشنبہ کو شروع کی اور اہل انجیل دوشنبہ بتاتے ہیں۔[6]

---

[1] لغت میں ایلاء کے معنی قسم کھانے کے ہیں مگر اصطلاحاً مدت معینہ تک اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھانا [2] تدریب [3] فائدہ سوم و چہارم عربی ادب سے متعلق ہیں جن کو موضوع سے چنداں علاقہ نہیں لہذا ترجمہ میں ہم ان کو محذوف کرتے ہیں از مترجم [4] شرح مہذب [5] ابن عساکر۔ [6] ابن اسحاق۔

اہل اسلام کا مسلک اور ہم اہل اسلام (اس بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت پہنچی ہے) شنبہ کہتے ہیں۔

خلق دنیا خدا نے یکشنبہ کو شروع کی اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ایک جماعت بھی اسی جانب مائل ہے[1] حدیث مذکور کی لفظ احد سے تائید ہوتی ہے[2]۔ غرض خداوند کریم نے تکمیل خلق جمعہ میں کی چنانچہ اہل اسلام نے اس کو اپنا تیوہار بنالیا۔ قبل اسلام اہل کتاب اس دن سے واقف نہ تھے۔

اعتراض۔ مسلم کی اگلی حدیثوں میں شدید غرابت ہے اس لئے کہ زمین چار یوم کی مدت میں بنائی گئی پھر دو دن میں آسمان۔ اس امر کو بخاری اور بعض محدثین نے بیان کیا ہے چنانچہ یہ زیادہ صحیح ہے[3]۔

فائدہ۔ صرف ایک دن اتوار کا روزہ مکروہ ہے[4]۔

فائدہ۔ احد کی جمع آحاد بالمد احاد بالکسر اور وحود آتی ہے۔

دوشنبہ (الاثنان) اس کا نام اثنان اس وجہ سے ہے کہ وہ ہفتہ کا دوسرا دن ہے[5] عرب اس دن کو اہون سے موسوم کرتے تھے۔

دوشنبہ کا روزہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوشنبہ کے روزے کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس دن میں پیدا ہوا اور اس روز مجھ پر وحی اتری[6]۔

مدینہ میں ورود نبوی۔ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دوشنبہ ہی میں وارد مدینہ ہوئے[7]۔

سہ شنبہ۔ (الثلثاء) جس کی ثلاثاوات اور اثالث جمع ہوتی ہے۔ عرب اس کو جبار سے موسوم کرتے تھے۔

چہارشنبہ۔ (الاربعاء) جس کی اربعاوات اور ارابیع جمع ہوتی ہے عرب اس کو دبار کہتے تھے لوگوں میں مشہور ہے کہ آیۃ فی یوم نحس مستمر سے یہی چہارشنبہ مراد ہے اور اسی لئے اس دن سے شگون بد لیتے ہیں۔

بدپیشگوئی کی تحقیق۔ یہ ایک سخت غلطی ہے اس لئے کہ قول خداوندی فی ایام نحسات سے آٹھوں دن مراد ہیں اس سے تو لازم آئے گا کہ تمام کے تمام دن منحوس ہو جائیں بلکہ درحقیقت وہاں نحس علیہم (موعود علیہم کے لئے نامبارک) مراد ہے[8]۔

---

[1] ابن جریر [2] ابن کثیر [3] ابن یونس [4] شرح مہذب [5] مسلم [6] طبرانی ابن ابی الدنیا [7] ابن سعد

پنجشنبہ۔ (الخمیس) جس کی اصل اور اخامس جمع ہوا کرتی ہے عرب اس کو مونس کہتے تھے۔

جمعہ۔ بضم و سکون میم ہر دو درست ہے اس کی جمع جمعات آتی ہے عرب اس کو عروبہ کہتے ہیں۔

فضیلت جمعہ۔ بہترین ایام جن میں کہ آفتاب طلوع ہوتا ہے جمعہ ہے اسی دن حضرت آدم پیدا ہوئے۔ اسی دن جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن جنت سے نکالے گئے۔ اور ایک روایت سے ثابت ہے کہ اسی دن وفات بھی پائی۔ اسی روز قیامت بھی شروع ہوگی۔ اسی روز ایک بے مثل ساعت ہے کہ جس میں خدا بندۂ مسلم کی دعا قبول فرماتا ہے[۱] ایک حدیث میں مذکور ہے کہ بزرگترین ایام روز جمعہ ہے اور بہترین شب لیلۃ القدر اور افضل شہور رمضان ہے[۲] ایک حدیث میں ہے کہ شب جمعہ مخصوص شب ہے اور روز جمعہ ممتاز ترین[۳]

فائدہ۔ چند احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہا جمعہ ایک دن کا روزہ مکروہ ہے[۴] لیکن بزار کی حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جمعہ میں بے روزہ نہ تھے ضعیف ہے[۵]

شنبہ۔ (السبت) جس کی جمع اسبت اور سبوت آتی ہے اس کو پہلے شیار کہا کرتے تھے۔ تنہا شنبہ ایک دن کا روزہ مکروہ ہے[۶]

فائدہ۔ ہاں اگر شنبہ کے روزے کے ساتھ جمعہ یا اتوار کا روزہ ہو تو کراہت نہیں جس کی توجیہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب دو مکروہ جمع ہو جاتے ہیں تو کراہت زائل ہو جاتی ہے۔ شنبہ سے متعلق یہودیوں کا قصہ مشہور ہے[۷]

فائدہ۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یکشنبہ ابتدائے تخلیق کا روز ہے اور دوشنبہ سفر کا دن سہ شنبہ ذبح و کشتار کا دن۔ چہار شنبہ لین دین کا۔ پنجشنبہ شاہوں سے ملاقات کا جمعہ شادی بیاہ کا دن ہے[۸]

مشاغل یومی۔ مصنف کہتا ہے کہ میں نے حافظ شرف الدین دمیاطی کے قلمی یہ چند اشعار دیکھے جن کو حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے منسوب کیا گیا تھا۔

لنعم الیوم یوم السبت حقا لصیدان ارادت بلا امتراء

---

[۱] صحیح [۲] طبرانی [۳] بیہقی [۴] صحیحین [۵] امام سیوطی [۶] امام سیوطی [۷] ابو لعلے۔

ترجمہ۔ مقصد شکار کے لئے بہترین روز بے شبہ شنبہ ہوا کرتا ہے۔

وفی الاحد النباء لان فیہ قبدی اللہ فی خلق السماء

ترجمہ۔ یکشنبہ میں تعمیر بہتر ہے اس لئے کہ خداوند کریم نے اس دن آسمان بنانا شروع کیا۔

وفی الاثنین ان سافرت فیہ فترجع بالنجاح وبالثراء

ترجمہ۔ اگر تم دوشنبہ میں سفر کروگے تو فیروزی اور کامیابی سے واپس آوگے۔

وان تردا لحجامتہ فی الثلاثاء ففی ساعتہ ھراق الدماء

ترجمہ۔ اگر تم کو پچھنے لگانا منظور ہو تو سہ شنبہ میں (مناسب ہے) اس لئے کہ اُسی دن کی گھڑیوں میں خون بہایا گیا ہے۔

وان شرب امرءٌ یوماً دواءً فنعم الیوم یوم الاربعاء

ترجمہ۔ اگر کوئی دوا پینا چاہے تو چہار شنبہ بہتر ہے۔

وفی یوم الخمیس قضاء حاج فان اللہ باذن بالقضاء

ترجمہ پنجشنبہ میں دعا مناسب ہے کیونکہ اللہ اس دن دعا قبول فرماتا ہے۔

وفی الجمعات تزویج وعرس ولذات الرجال مع النساء

ترجمہ مردوں کی عورتوں سے لذت اندوزی اور شادی بیاہ جمعوں میں بہتر ہے۔

مصنف کہتا ہے کہ ان اشعار کی حضرت علی سے نسبت میں مجھے تامل ہے۔

محرم جس کی محرمات محارم اور محاریم جمع آتی ہے بعض عرب اس کو مؤتمر کہتے ہیں جس کی جمع مآمر اور مآمیر آتی ہے۔

محرم کے روزے۔ رمضان کے روزوں کے بعد شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) محرم کے روزے افضل ہیں[1]

صفر۔ جس کی جمع اصفار آتی ہے۔ ابن اعرابی کہتا ہے کہ تمام لوگ صفر کو منصرف کہتے ہیں مگر خلاف اجماع۔ مگر ابو عبیدہ اس کو غیر منصرف کہتا ہے۔ جس کی وجہ تانیث اور علمیت بتاتا ہے۔ لیکن ثعلب کا قول ہے کہ ابو عبیدہ نے یہ نہ سمجھا کہ جملہ از سنہ اوقات ہیں (ان میں علمیت نہیں ہوتی) بعض عرب اس کو ناجر کہتے ہیں۔

---

[1] صحیح۔

ماہ صفر کی تحقیق بدشگونی | بعض لوگ اس مہینہ سے بُرا شگون لیتے ہیں اسی لئے حدیث ہے لاعدویٰ ولاطیرہ ولا صفر (تعدیہ اور شگون کوئی چیز نہیں ہے)

ربیع | فرّاء نے کہا کہ ربیع الاوّل جب کہا جائے تو گویا لفظ اوّل شہر کی صفت ہوتی ہے اور جب اولیٰ کہا جائے تو وہ ربیع کی صفت ہوتی ہے۔ بعض عرب اس کو خوان کہتے ہیں جس کی جمع خوانہ آتی ہے بعض عرب والصان بھی کہتے ہیں جس کی جمع وصلان آتی ہے۔

ربیع الاوّل کی فضیلت | اسی مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے اسی میں ہجرت فرمائی اور اسی میں وفات پائی۔

جمادی | جس کی جمع جمادیات ہوتی ہے فراء کہتا ہے کہ باستثنائے جمادئین ہر مہینہ مذکر ہے اہل عرب جمادی الاولیٰ وجمادی الآخرۃ بولتے ہیں۔ بعض لوگ جمادی الاولیٰ کو جمادین کہتے ہیں جس کی جمع احمۃ آتی ہے اور جمادی الآخرۃ کو درنہ کہتے ہیں جس کی جمع دنان آتی ہے

مسئلہ ۔ کیا سلم صرف ربیع یا جمادی کے تذکرے سے ہو سکتی ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ ابہام کے باعث صحیح نہ ہوگی۔ لیکن درست یہی ہے کہ ہو سکتی ہے اور اس صورت میں ربیع الاوّل اور جمادی الاولیٰ کا مفہوم لیا جائے گا۔

رجب | جس کی جمع رجبات ارجاب یا رجاب ہوتی ہے چونکہ اہل عرب اس مہینے کی بڑی عظمت کرتے تھے کہ جنگ وغیرہ اس مہینے میں حرام جانتے تھے ہتیاروں کی جھنکار نہ سنائی دیتی تھی اس لئے وہ اس مہینے کو اصم کہتے تھے۔

صیام رجب کی حقیقت | اس ماہ کے روزوں کے متعلق بہت سی حدیثیں وارد ہیں۔ لیکن وہ سب کی سب منکر یا موضوع ہیں کوئی بھی ثابت نہیں ہے۔

شعبان | جس کی شعابین اور شعبانات جمع ہوا کرتی ہے۔ بعض اس کو وعل کہتے تھے جس کی جمع اوعال یا وعلان آتی ہے۔

شعبان کے روزے | رمضان کے سوا اور کوئی ایسا مہینہ نہیں ہے جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں۔

ہاں اگر نصف ماہ اول میں روزے نہ رکھے جائیں تو صرف نصف آخر کے روزے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حرام کر دیتے تھے۔

رمضان یہ رمضاء بمعنے شدت الحرارت سے مشتق ہے جس کی جمع رمضانات ارمضہ یا رماض آتی ہے۔ نحاۃ نے کہا کہ شہر رمضان بولنا بجائے صرف رمضان بولنے کے زیادہ فصیح ہے۔

کیا رمضان خدا کا نام ہے مصنف کہتا ہے کہ ابن حاتم نے بسند ضعیف ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ خدا کا نام ہے اس لئے مطلق رمضان نہ کہا کرو شہر رمضان کہا کرو۔

بعض عرب اس کو ناتق کہتے ہیں جس کی جمع نواتق آتی ہے۔

شوال جس کی جمع شوالات شواول یا شواویل آتی ہے۔ اس کو بعض عرب عادل کہتے ہیں جس کی جمع عوادل آتی ہے۔

اس مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تھا حضرت عائشہؓ اس مہینے میں نکاح پسند فرماتی تھیں۔ شہور حج میں یہ پہلا مہینہ ہے۔

ذوالقعدہ وذوالحجہ قعدہ کے ق کا فتحہ اور حجہ کے ح کا کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ اس کے برعکس غیر فصیح ہے۔ اگرچہ ان ہر دو حروف کا فتحہ وکسرہ دونوں درست ہیں ان کی جمع ذوات القعدہ اور ذوات الحجہ آتی ہے۔ اول کو ہواع جس کی جمع اہوعہ اور ہواعات آتی ہے کہتے تھے اور دوسرے کو بُرک کہتے تھے جس کی جمع برکات آتی ہے۔

فائدہ ۔ محرم کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں جنگ حرام ہے۔

صفر کی یہ ہے کہ عرب اس مہینے میں بمقام صفر جمع ہوا کرتے تھے

جمادیین اس لئے کہ ان مہینوں میں پانی جم جاتا تھا۔

رجب اس لئے کہ اس مہینے میں درختوں کو نصب کرتے تھے۔ ۱۲

شعبان اس لئے کہ اس مہینے میں قبائل متفرق ہوئے تھے ۱۳

---

۱۱ ربیع ربع سے مشتق ہے ربع بمعنے مکان وقیام کرنا ۱۲ رجب بمعنے خاص اہتمام کرنا

۱۳ شعبان شعب بمعنے تفرق وتفرع سے مشتق ہے۔

رمضان اس لئے کہ اس مہینے میں شدت گرما سے پستانوں میں دودھ خشک ہو گئے تھے[۱]

شوال اس لئے کہ اس مہینے میں اونٹنیاں گرما کر دم اٹھاتی تھیں[۲]

ذوالقعدہ اس لئے کہ عرب اس مہینے میں جنگ سے باز رہتے تھے[۳]

ذوالحجہ اس لئے کہ اس میں حج کرتے ہیں[۴]

چونکہ یہ فوائد مہتم بالشان تھے اس لئے ہم نے ان کو یہاں بیان کیا کسی کاتب یا مورخ کو اُن سے لاعلمی مناسب نہیں۔

رُباعی

از

جناب قتیلؔ حیدرآبادی

بلبل کو چمن میں جستجو ہے قمری کی زباں پہ نعرۂ کو کو ہے

توحید کا تیری بولتا ہی طوطی مینا کہتی ہیں نہیں ہو تو ہے"

---

[۱] رمضان رمضاء یعنی شدت الحرارت سے مشتق ہے [۲] یہ شوال الناقۃ سے مشتق ہے یعنے اونٹنی کا دم اٹھانا چونکہ انتہائے مستی سے اونٹنی دُم اٹھاتی تھی اس لئے شوال اس مہینے کا نام پڑا [۳] قعدہ اور قعود معنی بیٹھنا [۴] ابن عساکر۔

خاندان چوہان کا آخری راجہ

(ایک تاریخی ڈرامہ)

(از جناب شیخ نور الحسن عثمانی صاحب)

تمہید - پرتھوی راج شمالی ہند کا زبردست اور طاقت ور راجہ تھا دہلی اور اجمیر دونوں ریاستوں کا مالک تھا۔ راجہ بننے سے پہلے ہی شجاعت اور بہادری میں مشہور تھا۔ اجمیر کی ریاست اُس کو باپ کے اور دہلی کی ریاست چچا کے ورثہ میں ملی تھی۔

دہلی کی ریاست کے مل جانے سے اُس کا قریبی رشتہ دار جے چند حسد کرنے لگا۔ اور اس طرح دونوں میں باہم عداوت پیدا ہوگئی جے چند نے جو قنوج کا راجہ تھا اپنی دختر سنجوگتا کا سوئمبر رچایا اور تمام ہندوستان کے رجواڑوں کو مدعو کیا۔ پرتھوی راج پہلے ہی سے چاہتا تھا کہ سنجوگتا کو اپنی رانی بنائے۔ مگر جے چند نے عداوت کی بنا پر اُس کو ذلیل کرنے کی غرض سے مدعو نہ کیا بلکہ اس کی ایک مورت بنوا کر اپنے دربار کی جگہ کھڑا کر دیا۔ عین سوئمبر کے وقت پرتھوی راج چند سورماؤں کو لے کر قنوج پہونچا۔ اور بھیس بدل کر رسم میں شریک ہوگیا۔ سنجوگتا نے کسی کو پسند نہیں کیا بلکہ پرتھوی راج کی مورت کو ہار پہنا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ پرتھوی راج نے موقع پاکر فوراً سنجوگتا کو گھوڑے پر سوار کیا اور لڑ بھڑ کر قنوج کی سرحد سے پار نکل گیا۔

افراد

پرتھوی راج - دہلی اور اجمیر کا راجہ۔

سنجوگتا - پرتھوی راج کی رانی۔ راجہ جے چند والئے قنوج کی بیٹی۔

سفیر - دایہ - پرتھوی راج کی قدیم خادمہ۔

پہلا سین

سین - محل دہلی کا اندرونی برآمدہ جس میں پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ راجہ اور رانی

دونو گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رانی پرتھوی راج کو ہتیار اور زرہ بکتر پہننے میں مدد دے رہی ہے۔ راجہ لڑائی پر جانے کو تیار ہو رہا ہے۔

سنجوگتا۔ پیارے شوہر۔ سب سامان تیار ہے۔ باہر دربار میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاکہ آپ کو منزل مقصود پر لے جائیں۔

پرتھوی راج۔ پرماتما اُن کو ثابت قدم رکھے۔ چھ مرتبہ میں نے دشمنوں کو مار بھگایا اور اب پھر بارہ چاند کے بعد ہمارے آرام میں خلل ڈالنے آئے ہیں۔

سنجوگتا۔ کیا ہمیں آرام اور امن کی زندگی بسر کرتے ہوئے بارہ چاند ہو گئے؟ مگر مجھکو تو ایک ہی دن معلوم ہوتا ہے۔

پرتھوی راج۔ پیاری ہم دونوں نے خوشی اور شادمانی کے جام خوب بھر بھر پیئے ہیں۔ اس لئے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

سنجوگتا۔ تو کیا اب ہمارا خمار اتر گیا ہے؟۔ اور ہماری عیش کی گھڑیاں گزر چکی ہیں۔ اور آپ مجھ سے منہ چھپانا چاہتے ہیں۔

پرتھوی راج۔ پیاری۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارے الفاظ بدشگونی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر یہ چمکدار آنکھیں پھر کب ..... تم اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ لاؤ۔ کسی بات کا خیال ہرگز دل میں نہ لاؤ۔ قسمت ایسی ظالم اور بے رحم نہیں ہے کہ وہ ہم دونوں میں جن کے لئے اُس نے بہشت کے دروازے کھول دئے ہیں۔ جدائی ڈالدے!۔

سنجوگتا۔ پرمیشور نے ہمیں بہت سی فتوحات عطا کی ہیں۔ مگر جو کچھ تقدیر میں ہوتا ہے وہی ہوگا۔ تقدیر کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ وہ جسے چاہے فتح دے اور جسے چاہے شکست دے۔

پرتھوی راج۔ پرمیشور کی کرپا کر سے بزدل دشمنوں کو کئی مرتبہ نیچا دکھا چکا ہوں۔ اب بھی اُسنے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ کیا خوف ہے۔

سنجوگتا۔ اُس شخص کے لئے جس نے اپنے دشمن کی لڑکی سے شادی کی کوئی فتح آخری فتح نہیں ہو سکتی۔

پرتھوی راج۔ (آہستہ سے) مجھے کسی کی سازش کا خوف نہیں ہے۔ میری پیاری۔ مجھے

ل بارہ ۱۲

کسی کا بھی خیال و خوف نہیں ہے۔ مگر اُس کا جس کا کہ خیال مجھے اوّل اور آخر ہے۔

سنجوگتا۔ نہیں میرے پیارے سورج بنسی خاندان کے راجہ میں آپ سے منحول نہیں کر رہی ہوں۔ بلکہ میرا حریف باپ راجہ قنوج جس کے سامنے ہم دونوں نے ایک بھڑکتا ہوا حسد کا شعلہ گرایا ہے۔

پرتھوی راج۔ آہ۔ میری انمول۔ میری پیاری۔ تم نے تمام چوہان اور دیگر ہندوستانی راجاؤں کے سامنے اپنے باپ کی ذلت کی۔ آہ، وہ وقت! جبکہ تم نے سب رجواڑوں کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا اور مجھکو ترجیح دی۔

کیا میں اُن راجاؤں سے زیادہ خوش قسمت تھا؟ کیا تم میری ہی قسمت میں تھیں؟ کیا اُن میں سے کوئی ایسا خوش قسمت نہ تھا جیسا کہ میں۔

سنجوگتا۔ اوہ۔ وہ دن! کیسی خطرناک گھڑی تھی۔ مگر غیر متوقع اور مسرت آمیز تھی۔ جس کا افتتاح ایک شاندار جشن سے ہوا اور انتہا ایک خطرناک لڑائی سے۔ اوہ کس مہربانی سے میری قسمت نے مجھے اُن خطروں اور مصیبتوں سے چھڑایا۔ جو عنقریب میری آرزوؤں اور تمناؤں پر پانی پھیرنے والے تھے۔

پرتھوی راج۔ یہ تمہاری راجپوتانہ اور رانی پن کی دلیری اور مستعدی تھی جس نے اُس دن بچایا۔ ایک مستعد ذلیل شدہ بہادر اور ایک سچے آدمی کو تقدیر کیونکر روک سکتی ہے۔ جو اپنے آرزوؤں بھرے دامن مراد کو پورا کرنا چاہتا ہے۔

سنجوگتا۔ اس لئے میں نے آپ سے محبت کی۔ جیسا کہ دوسری عورتیں کیا کرتی ہیں۔ ایک ایسا جانباز عاشق۔ ایک ایسا بے نیاز سورما۔ جس کا گیت تمام شعراء اور مطرب گاتے ہیں۔ مگر کیا۔ میرے سوئمبر کے جشن کے وقت آپ کی تذلیل؟۔ آہ۔ میرا حاسد باپ جو میری امیدوں کو خاک میں ملانے کی خواہش رکھتا ہو!۔ اوہ۔ آپ کی بے عزتی اور وہ بھی میری وجہ سے!۔ اب میں اس خیال کو آپ کے دل سے کس طرح بھلاؤں۔

پرتھوی راج۔ نہیں۔ پیاری نہیں۔ تمہارا اس میں کچھ دخل نہیں ہے بلکہ یہ دشمنی اور عداوت کا سلسلہ کچھ اور ہی ہے۔ اور تمہارا غریب باپ۔ جس نے حسد کے مارے میری مورت بنوا کر دروازے پر رکھوائی۔ وہ ذلت نہیں تھی بلکہ معمولی تضحیک تھی۔

اُس موقع پر مجھے کسی بات کا خیال نہ تھا۔ بجز اس کے کہ میں چپ چاپ بیٹھا اپنے خیال میں منہمک تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ دیکھئے بجلی کس طرف گرتی ہے۔ آہ۔ وہ سماں مجھکو اچھی طرح یاد ہے جبکہ میں ایک مطرب کے بھیس میں وہاں تمہاری حرکتیں اور انتخاب کا منظر چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہا تھا۔

سنجوگتا۔ کاش مجھے وہاں آپ کی موجودگی کا علم ہوتا تو مجھے اتنی مصیبتیں سہنا نہ پڑتیں پھر بھی میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ آپ کی عدم موجودگی میں کیسے آپ کا انتخاب لاجواب کیا۔ وہ مقام ایسا تھا جہاں آپ کا نام لینا بھی ناگوار تھا۔

پرتھوی راج۔ وہ تمہارے شہرہ آفاق حُسن کی پہلی جھلک تھی۔ اور جب تم دربار میں آئیں تو دور ہی سے تمہارے پازیب کی آواز سنکر تمام درباری خاموش ہو گئے تھے اور محل کے دروازہ پر ٹکٹکی لگائے ہوئے تھے۔ اور جب سامنے ہوئیں تو تمام لوگ سکتہ کے عالم میں تم کو گھورنے لگے تھے۔

سنجوگتا۔ شائد اُس وقت میرے پاؤں نے پر لگائے تھے تاکہ اُڑکر تمہاری مورت کے جو دروازہ پر رکھی ہوئی تھی گلے میں ہار ڈال سکوں۔

پرتھوی راج۔ مگر تمہاری یہ جرات دوسرے برابر والے راجاؤں کے سامنے تمہارے باپ کی بے عزتی کا باعث ہوئی۔

سنجوگتا۔ میں اپنی تمناؤں کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے سے کبھی شادی نہ کرتی۔ میں یا تو خوشی کے ساتھ اپنے باپ کے گھر میں مقید رہتی یا موت کو ترجیح دیتی۔ مگر پراتما کسی کی آس نہیں توڑتا۔

پرتھوی راج۔ جب سے کہ ان حاسدوں کو شکست ہوئی ہے اس وقت سے ہم دونوں کی کس عمدگی اور خوشی و خرمی سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ گویا ہم دونوں نے خوشی اور امن کا جام پی لیا ہے۔

سنجوگتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس جام نے ہمارے آقا کی تمام جنگجو خصلتوں کو بھلا نہ دیا ہو اور اس طرح کی عیش پسندی سے راجپوتانہ جوش اور اولوالعزمی مدہم نہ پڑ گئی ہو۔ اور پہلے کی سی حالت نہیں رہی ہو!

پرتھوی راج۔ نہیں نہیں۔ تم اطمینان رکھو میری فوج پہلے سے زیادہ وفادار اور

طاقتور ہے۔ علاوہ ازیں دوسری ریاستوں نے بھی ہر طرح سے مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔
سنجوگتا۔ یقین ہے کہ تمام بہادر سپاہی میدان جنگ میں اپنی پوری شجاعت اور مردانگی دکھائینگے۔

پرتھوی راج۔ ہاں ہاں۔ یقیناً ایسا ہی کریں گے۔ میں نے ایک خط مسلمانوں کے سردار کو لکھا ہے کہ گذشتہ واقعات کو یاد کریں کہ کس بُری طرح شکست فاش کھائی تھی۔ اور بہتر ہوگا کہ بلاخوف وخطر صحیح وسلامت اپنے حدود میں داخل ہو جائیں۔

سنجوگتا۔ کیا وہاں سے کوئی جواب آیا۔؟

(ایک قاصد آتا ہے)

قاصد۔ مہاراج (حضور) سپہ سالار غزنی کے پاس سے ایک پیام وصول ہوا ہے۔

پرتھوی راج۔ ..... کیا جواب آیا... بولو۔

قاصد۔ مہاراج۔ آج کل شہاب الدین اعظم غزنی کی فوجوں کا سپہ سالار ہے۔ اور وہ مکار۔ قنوج کا راجہ بھی ہمارے خلاف مسلمانوں کے ساتھ مل گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان صلاح کے لئے رضامند ہیں اور متامل ہیں تا آنکہ غزنی ہدایت صلح پر غور کرے اور اپنے احکام صادر کرے۔

پرتھوی راج۔ (سر ہلاکر) یہ چالاکی! کی گئی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا ہے۔

سنجوگتا۔ یہ مصلحت آمیز جواب ہے۔ اس میں بھید ضرور ہے پھر بھی ہم کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔

پرتھوی راج۔ ہاں۔ رانی کا کہنا سچ ہے۔ اچھا خیر۔ آج چل کر شب خون مارنا چاہیئے۔ ان الفاظوں میں مکاری اور دغابازی پوشیدہ ہے۔

سنجوگتا۔ ہاں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اب راجپوت جان نثاروں کی آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ ہر ایک کا منزل مقصود موت ہے۔ انسان کی زندگی کا کیا بھروسہ ہے!

میرے پیارے شوہر میرا خیال نہ کرو۔ ہم دونوں کے جدا ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ پیارے شوہر۔ تمہاری بڑی بڑی سُرخ اور چمکدار آنکھیں فتح کی متلاشی ہیں۔ گر فتح اگر پرماتما نے چاہا تمہارے زیر قدم ہوگی۔

پرتھوی راج۔ پیاری سنجوگتا۔ ہمت کرو اور مجھے خوشی سے اجازت دو تاکہ میرا راستہ خوشی سے طے ہو۔

(پرتھوی راج سنجوگتا سے بغلگیر ہوتا ہے۔ اور نہایت حسرت بھری آہ کھینچ کر گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتا ہے)

سنجوگتا۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ میں اپنے پیارے شوہر کو اس بوگنی پور (دہلی) میں نہ دیکھ سکوں گی۔ بلکہ اس کو سوارگا (جنت) میں دیکھوں گی۔

دوسرا سین

سین۔ دوسرے دن شام کو اسی برآمدہ میں سنجوگتا اپنی دایہ سے گفتگو کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سنجوگتا۔ (اداسی کی حالت میں) آہ۔! وہ غمگین دن جس۔ وزمیں نے اپنی محبت کا ہار اس کے گلے میں ڈالا تھا۔ ڈر ہے کہ وہی اس کے گلے کی زنجیر نہ ہو۔ اور اس کو شکست کی طرف کھینچے۔ افسوس میں یہ کیا کر بیٹھی جب سے کہ میں نے اپنے باپ کے خلاف گیا ہے اس وقت سے خوف لگا ہوا ہے کہ میرا شوہر اس کے حسد اور غصہ کا نشانہ نہ بنے۔ اسی غرض سے میرا باپ مسلمانوں سے ملا جلا ہے۔ تاکہ اگر میرا شوہر مرافعت کرے تو وہ اپنے بھڑکتے ہوئے حسد کے شعلے پرتھوی راج پہ گرائے۔

دایہ۔ بیٹی خاموش رہو۔ اپنے دل کو کیوں اداس کر رہی ہو۔! کیا تم نہیں جانتی کہ پرتھوی راج کی زندگی پر دیوتاؤں کا سایہ ہے۔ اس کا ہر ایک ہاتھ چھ چھ آدمیوں کا کام کر سکتا ہے ..... اچھا مہارانی اور کیا خبر ہے۔

سنجوگتا۔ صبح کو یہ خبر ملی تھی کہ میرا باپ مسلمانوں سے مل کر جنگ کر رہا ہے۔ اور ان کی ہر طرح سے کمک کرنے پر آمادہ ہے۔ چند مسلمان بھیس بدل کر راجپوتوں کے خیموں میں گھس گئے تھے۔ مگر چند بہادروں نے دیکھ پایا اور انہیں تیر کا نشانہ بنا دیا۔ سلطان محمود تو برابر لڑائی کر رہا ہے۔ صورت حال نازک ہے۔ راجپوت صف آرائی میں کچھ رخنہ پڑ گیا ہے۔ سلطان بھی کچھ خاموش ہے۔ مسلمان کچھ دور پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

مگر یہ فریب ہے۔

دایہ۔ مگر ہمارے مہاراج بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ اُن کے فریبوں سے بخوبی واقف ہیں۔ کیوں نہ ہو وہ ایک نڈر شہسوار ہیں۔ جن کے سامنے لڑائی کا میدان ایک معمولی بازی گاہ ہے۔ وہ راجپوت بہادروں اور سورماؤں کے سرتاج ہیں۔ وہ کبھی سلمانو کے فریب اور دھوکے میں نہیں آسکتے۔

سنجوگتا۔ ہاں سب کچھ صحیح ہے مگر میں یہ نہیں سمجھتی کہ مجھے کیوں اور کس بات کا خوف ہو رہا ہے۔ ایک نامعلوم خوف نے میرے دل پر ایسا قبضہ کر لیا ہے کہ میرا دل دھڑک رہا ہے۔ پرماتما خیر کرے۔

دایہ۔ مہارانی کیا تم وہی مہارانی سنجوگتا نہیں ہو جس نے اپنے باپ کے سامنے ایسی دلیری دکھائی تھی۔!۔ کہ اب شکست ہونے کے احتمال سے پست ہمت ہو رہی ہو۔

سنجوگتا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن یہ ذلت اور بے عزتی کی جھلک معلوم ہوتی ہے۔ ..... نہیں۔!۔۔۔ نہیں۔!۔ اب میں نہیں رہوں گی۔!۔ لو۔!۔ ہاں۔!۔ میں اب پھر رانی ہوں!۔

(قاصد آتا ہے) محل کے باہر شور سنکر رانی چونکتا ہوتی ہے۔

قاصد۔ مہارانی ایک قاصد کرنال کے میدان سے آیا ہے۔

سنجوگتا۔ (آہستہ سے) میں اُس کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

قاصد۔ اور وہ زخموں سے چور چور اور نڈھال ہیں۔

سنجوگتا۔ میں ایک سپاہی کی عورت ہوں!۔ اندر لاؤ۔

دایہ۔ نہیں۔ رانی کی نظروں سے دور رکھو۔ ورنہ .....

سنجوگتا۔ کیا کہا؟ ..... پھر کہو۔؟

قاصد۔ مہارانی خبر بہت بری ہے۔ آپ اُس کو برداشت نہ کر سکینگی۔

سنجوگتا۔ کیا میں نہیں سن سکتی؟۔ اچھا کیا خبر ہے۔ جلد سناؤ میرا دل دھڑکتا ہے ..... جلد ....

قاصد۔ مہارانی کیا کہوں۔!۔ راجپوتوں نے مسلمانوں کا خوب مردانہ وار مقابلہ کیا۔ نہایت جان توڑ لڑائی ہوئی مگر دشمن کی امداد کافی اور زبردست تھی۔ اگرچہ کہ

پہلے ہی حملہ میں ہمارے بہادروں نے مسلمانوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔ مگر جب حیلہ سازی کی لڑائی ختم ہوئی۔ تو مسلمانوں نے ایک جان ہو کر ایسا حملہ کیا کہ بازی لے گئے۔ اور .....

سنجوگتا۔ بس! بس! اب اس معرکہ کا خاکہ میرے سامنے مت کھینچو۔ میں سب جانتی ہوں۔ شائد بھاری جھول وار طاقتور گھوڑے اور فوجی ہاتھی میدان سے بھاگ نہ سکے۔ مگر..... جلدی کہو..... کیا راجہ جی بچ کر نکل گئے؟۔

قاصد۔ مہاراجہ کے زخم تو خفیف تھے۔ اُن کا گھوڑا مر بھی گیا تو وہ پیدل لڑتے رہے۔ مگر چند ساتھیوں کے ہمراہ فرار ہو کر ایک گنے کے کھیت میں جا چھپے مگر... ... آہ!..... کوئی اس واقعہ کو کیسے بیان کرے۔؟

سنجوگتا۔ اوہ۔ بیان کرو..... ہچکچاؤ مت۔ میں اس کو سن سکتی ہوں۔ (سنجوگتا اپنا سر ایک لمحہ کے لئے نیچے کرتی ہے اور ایکدم ہمت کے ساتھ سر اُٹھاتی ہے۔)

(سرد آہ بھر کر) ہاں۔ میں پہلے ہی سے جانتی تھی کہ وہ اب دوبارہ اس محل میں قدم نہ رکھینگے۔ مگر ہم دونوں اُس پار ملینگے۔

قاصد۔ (سر جھکائے ہوئے) مہاراجہ (مہاراجہ کی لاش) محل کے باہر اپنے آخری رسوم کا انتظار کر رہے ہیں۔

سنجوگتا۔ آہ۔ یہ انجام ہے!۔ نہیں! کس کو خبر ہے!۔ شاید یہ ابتدا ہو!۔ اچھا مجھے بھی تیاری کرنا ضرور ہے۔ تاکہ میں بھی سبقت لیجاؤں۔ آہ۔! جو دنیا میں شان سے رہتے ہیں وہ شان ہی سے مرتے ہیں..... مجھے بھی جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ فاتح کے ہاتھ میری ذلت ہو۔ چلو۔ میں تیار ہوں۔

(رانی آہستہ آہستہ چتا کی طرف قدم بڑھاتی ہے گویا خواب میں ہے)

ہٹو!۔ ہٹو!۔ مہارانی کے لئے راستہ چھوڑو۔!۔

پرتھوی راج کی دلہن اپنے شوہر سے ملنے جا رہی ہے۔

(ترجمہ)

اعتماد

(از جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

سوراجیہ سوپان" نامی روزنامہ کے مدیر اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنے نام کی ڈاک دیکھ رہے تھے اسی وقت چپراسی نے اُن کو ایک کارڈ لاکر دیا۔ کارڈ کو دیکھ کر ایڈیٹر نے کہا۔ "انہیں بھیجو" چپراسی چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد ایک کھدر پوش جوان کمرے میں داخل ہوا۔ ایڈیٹر کو دیکھ کر اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر "بندے" کہا۔ ایڈیٹر مسکرا کر بولے۔ "آیئے مشکل جی آپ کب تشریف لائے ؟

جوان کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کل شام کو آیا تھا"۔

ایڈیٹر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ "اچھا ! ٹھہرے کہاں ؟"

"ایک دھرم سالہ میں ٹھہر گیا ہوں"

"یہ کیوں، یوں ہی کیوں نہ چلے آئے ؟"

"بات یہ ہے کہ کل وقت بہت ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا دفتر بند ہو گیا ہوگا"۔

"دفتر بند ہو گیا تھا، تو کیا کھل نہیں سکتا تھا ؟"

"ہاں کھل تو سکتا تھا۔ مگر میں نے سوچا کیوں تکلیف دوں"۔

"تکلیف کی کونسی بات تھی خیر ! اب آپ یہاں آجائے۔ یہاں دو کمرے بالکل خالی پڑے ہیں۔ آپ انہیں میں ڈیرہ جمائے"۔

"اچھی بات ہے"

"تو اسباب کب لاؤ گے ؟"

"آج کسی وقت لے آونگا۔ آپ کہاں رہتے ہیں ؟"

"میں بھی قریب ہی رہتا ہوں۔ یہاں سے پانچ منٹ کا راستہ ہے"۔

"تب تو بڑا اچھا ہے"۔

"اور کوئی بات ہے ؟"

"بس اور کون بات ہے۔ کل سے کام شروع کرو نگا"

"کل سے شروع کرنا چاہیئے پرسوں سے۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ دو ایک دن آرام کرو"

"آرام تو کرتا ہی تھا۔ آرام سے طبیعت اکتا گئی ہے۔ کام کرنے کو جی چاہتا ہے"

"ایڈیٹر ہنس کر بولے۔ "یہ بات ہے؟ اچھا تو جب سے خواہش ہو۔ تب سے شروع کرو"

"کل ہی سے کرونگا"

"کل ہی سے سہی"

شکل جی اسی دن شام کے وقت سی، آئی، ڈی انسپکٹر کے پاس پہنچے۔ انسپکٹر نے انہیں تنہائی میں لے جاکر پوچھا "آپ کب آئے؟"

شکل جی نے کہا "میں کل آیا تھا"

"میرا خط آپ کو مل گیا تھا؟ انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اسی کے بموجب میں نے یہاں آنا ٹھان لیا"

"اچھا تو یہاں آپ کو کیا کرنا ہوگا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں"

"جی ہاں، اس میں سے پہلا کام تو میں پورا کر چکا ہوں"

"کونسا"

"میں نے "سورا جیہ سوپان" میں شریک مدیر کی جگہ حاصل کرلی"

"اچھا! شاباش۔ تب پھر دوسری باتیں آسان ہو جائینگی"

"جی ہاں"

"میں ایک بار پھر سمجھا دوں۔ آپ ایڈیٹر پر اپنی نظر رکھئے۔ ان کے خیالات کیسے ہیں۔ اُن کے پاس کون کون آدمی آتے ہیں۔ ان کی خط و کتابت کن سے ہوتی ہے اور کس بارے میں ہوتی ہے۔ اس کی خبر رکھئے گا۔ ایڈیٹر جب کبھی باہر جائیں تو اس بات کا پتہ لگا کر کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اُس کی اطلاع فوراً مجھے یا میرے نمائندگار کو۔ جو اس وقت یہاں موجود ہوں دیجئے۔ ان کے علاوہ اور جو کچھ آپ اپنی عقل اور سمجھ سے کر سکیں وہ کیجئے گا"

"بہت اچھا"

"ایک بات کا خیال رکھیگا۔ اپنا بھید کسی شخص کو بھی چاہے وہ آپ کا کتنا ہی گہرا دوست کیوں نہ ہو کبھی مت دیجئے گا۔ سی، آئی، ڈی محکمہ کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے افسروں

اور مددگاروں کے علاوہ دوسرے کسی شخص کو کبھی اپنا بھید نہ دے چاہے وہ اپنا دوست ہو یا رشتہ دار"

"یہ باتیں میں سمجھتا ہوں۔"

"سمجھنے کو تو بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔ پر ان کے موافق کام نہیں کرتے۔ بہتیرے تو اتنے گدھے ہوتے ہیں کہ اپنے کو سی، ائی، ڈی کا آدمی ظاہر کرتے ہیں۔ اس کام میں کامیابی اسی وقت ہوتی ہے جب کسی کو آپ کے اصلی منشا اور ارادوں کا پتہ نہ چلے۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا"

"تو بس۔ اب میں بے فکر ہوں۔ آپ جب کوئی ضروری بات ہو۔ جیسے کوئی نیا آدمی ایڈیٹر کے پاس آوے اور اس پر آپ کو شبہ ظاہر ہو یا کوئی ایسا خط ملے، جس میں کوئی شک کی بات ہو تو اس کی اطلاع میرے دفتر میں دیجئے گا"

"بہت اچھا"

شکل جی چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انسپکٹر نے کھڑے ہو کر کہا۔ "یہ تو شاید آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس شہر میں آپ کا مددگار کوئی نہیں ہے اور میں اور میرے مددگار آپ کے افسر ہیں"

"یہاں کی مقامی سی، ائی، ڈی۔"

انسپکٹر شکل جی کا جملہ پورا ہونے کے قبل ہی بول اٹھا۔ "یہاں کی مقامی سی ائی ڈی سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے لئے آپ اتنے ہی اجنبی ہیں جتنا کہ ایک معمولی آدمی کے لئے۔ آپ صرف یہ دو باتیں یاد رکھیں ایک تو یہ کہ آپ یہاں اکیلے ہیں۔ آپ کا کوئی مدد کرنے والا نہیں ہے اور میں اور میرا مددگار آپ کے افسر ہیں۔ یہ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ اپنا راز اپنے مددگار اور افسروں کو چھوڑ کر کسی پر ظاہر نہ کیجئے۔ تو اس سے کیا نتیجہ نکلا؟

"یہی کہ آپ اور آپ کے مددگار کے علاوہ یہاں اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے۔ جس پر میں اپنا منشا اور اپنی نیت ظاہر کروں"

"ٹھیک! اب آپ اپنا کام شروع کریں"

(۲)

شکل جی کو "سوراجیہ سویا" میں کام کرتے ہوئے تین مہینے گزر گئے ہیں۔ اخبار کے

ایڈیٹر شکل جی سے نہایت ہی محبت کرنے لگے ہیں۔ شام کے وقت کام سے فراغت پاکر شکل جی اکثر ایڈیٹر صاحب کے گھر پہنچ جاتے اور اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے چھوٹے بچے ان سے ہل گئے ہیں۔ شکل جی ان کو اکثر کھلایا کرتے ہیں۔ ایک دن شام کے وقت شکل جی ایڈیٹر کے مکان پر پہنچے۔ انہوں نے ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں پہنچ کر آواز دی۔

"شانتی کیا کر رہی ہے؟" ان کے آواز دیتے ہی ایک پنج سالہ لڑکی گھر میں سے دوڑی آئی اور چچا چچا کہہ کر اُن سے لپٹ گئی۔ شکل جی نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور بولے۔

"کیا کر رہی تھی؟"

لڑکی نے کہا۔ "کچھ نہیں بیٹھی تھی"

"کھانا کھا لیا؟"

"ہاں"

"ابا کیا کر رہے ہیں؟"

"نہا رہے ہیں"

شکل جی لڑکی کو گود میں لئے باہر آ گئے۔ کمرے کے سامنے کچھ تھوڑی سی کھلی زمین تھی۔ وہیں خوب پانی چھڑکا ہوا تھا اور تین چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں شکل جی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ لڑکی تھوڑی دیر کے بعد اندر چلی گئی۔ لڑکی کے اندر جانے کے پانچ منٹ بعد ایڈیٹر صاحب باہر آئے اور بولے۔ "کہئے شکل جی کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ایسے ہی چلا آیا"

"بھوجن کر چکے؟"

"جی ہاں"

"نہ کیا ہو تو یہاں تیار ہے۔ کر لو"

"نہیں میں کھا پی کر آیا ہوں"

"اچھا تو پھر بیٹھو میں بھوجن کر کے ابھی آتا ہوں"

"ہاں آپ بھوجن کر آئیے میں بیٹھا ہوں"

ایڈیٹر صاحب چلے گئے۔ بیس منٹ کے بعد ایڈیٹر صاحب باہر آئے اور شکل جی کے پاس کرسی پر بیٹھ گئے۔ نوکر نے پان دئے۔ پان کھا کر ایڈیٹر صاحب پیٹ پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے بولے۔ "آج شام کی ڈاک سے مجھے ایک خط ملا ہے اُس خط کے مطابق کل شام کو تین چار دن کے لئے باہر جاؤں گا۔"

ٹکٹکل جی ڈھیلے ڈھیلے بیٹھے تھے۔ ایڈیٹر صاحب کی بات سُن کر چوکنے ہو گئے اُنہوں نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔ "کہاں جائیں گے؟"

"بنارس جاؤں گا"

"کچھ کام ہے؟"

"ہاں وہاں میرے ایک رشتہ دار ہیں۔ اُن کے یہاں شادی ہے"

"بچے بھی جائیں گے"

"نہیں بچوں کو لے جانا جھوٹ ہے گرمی بہت پڑ رہی ہے۔ اکیلے ہی جاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے ہو آئیے"

"لیڈر (افتتاحیہ) اور شذرات آپ کو لکھنے پڑیں گے"

"لکھ لوں گا"

"دوسرے سب کام تو ایڈیٹر لوگ کر ہی لیں گے"

"آپ بے فکر رہیں سب ہو جائے گا"

"مجھے زیادہ سے زیادہ چار دن لگیں گے۔ جس میں ایک دن کے لئے یعنی پرسوں کے لئے تو میں لیڈر دے ہی جاؤں گا اور ممکن ہو تو شذرات بھی لکھ دوں گا۔ باقی تین دن آپ کو سب لکھنا پڑے گا"

"کوئی بات نہیں شذرات تو اکثر میں ہی لکھتا ہوں۔ رہ گیا صرف لیڈر۔ سو تین دن کی تو بات ہی ہے۔ ہاں مقالے اتنے اچھے نہ ہوں گے جتنے آپ کے ہوتے ہیں"

"نہیں آپ بھی اچھا لکھتے ہیں۔ آپ نے ابھی تک دو لیڈر لکھے۔ دونوں اچھے تھے"

"اجی ابھی مجھے لکھنا وکھنا آتا ہی کہاں ہے۔ ہاں آپ کی خدمت میں کچھ دن رہنے کا عمدہ موقع ملا۔ تو کچھ سیکھ جاؤنگا۔ کل کس ٹرین سے جائیے گا؟"

"رات میں دس بجے کے لگ بھگ ایک ٹرین جاتی ہے اسی سے جاؤں گا"

"آپ کے رشتہ دار وہاں کس محلے میں رہتے ہیں؟"

"ٹھٹھری بازار میں رہتے ہیں۔ کیوں؟"

"میں بھی کچھ دن بنارس میں رہا ہوں۔ میں نے خیال کیا شائد میں انہیں جانتا ہوں"
"وہ کوئی مشہور آدمی تو ہیں نہیں۔ معمولی آدمی ہیں برتنوں کی دوکان کرتے ہیں"
"برتن والے تو کئی میرے شناسا ہیں۔ اُن کا نام کیا ہے؟"
ایڈیٹر صاحب نے نام بتا دیا۔ شکل جی کچھ لمحہ تک سوچ کر بولے۔ "انہیں میں نہیں جانتا"
اس کے بعد تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی بات چیت کر کے شکل جی بولے "اچھا تو اب جاتا ہوں ٹہلتا ہوا دفتر چلا جاؤں گا"
"اچھی بات ہے جاؤ۔ میں بھی اب اوپر چھت پر جا کر لیٹتا ہوں آٹھ تو بجے ہوں گے؟"
شکل جی اپنی جیبی گھڑی دیکھ کر بولے۔ "ہاں آٹھ بج کے دس منٹ ہوئے ہیں"
وہاں سے چل کر شکل جی سیدھے خفیہ پولس انسپکٹر کے پاس پہنچے۔ انہیں دیکھ کر انسپکٹر نے پوچھا "کہئے کیا خبر ہے؟"
"خبر یہ ہے کہ کل ایڈیٹر صاحب بنارس جائیں گے۔ دس بجے رات کی گاڑی سے"
"کس کام سے جا رہے ہیں؟"
"ان کا بیان تو ہے کہ کوئی شادی ہے۔ اُس میں جا رہے ہیں"
"کہاں ٹھہریں گے؟"
شکل جی نے پورا پتہ دیا۔ انسپکٹر نے کچھ دیر چپ رہ کر کہا۔ "تین مہینے آپ کو ہو گئے آپ نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہ بتائی۔ جس سے کچھ کام نکلتا"
"کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہوتی تو بتاتا"
"ہوئی کیوں نہیں ہوگی۔ پر معلوم ہوتا ہے آپ کو پتہ نہیں چلتا"
"یہ تو ممکن ہے۔ میں دفتر ہی میں رات دن رہتا ہوں۔ ہر ایک آدمی کو دیکھتا رہتا ہوں جتنے خط آتے ہیں۔ انہیں بھی پڑھتا ہوں۔ صرف ایڈیٹر کی ذاتی ڈاک مجھے پڑھنے کو نہیں ملتی"
"وہی تو خاص چیز ہے" انسپکٹر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔
"وہ تو مجھے دیکھنے کو مل ہی نہیں سکتی"
"ضرورت اسے ہی دیکھنے کی ہے۔ نرے ایڈیٹر کے دوست احباب میں کیا دھرا ہے"
"دیکھئے سعی کروں گا"
"اس سررشتہ میں آپ کی ترقی تب ہی ہو سکتی ہے جب آپ کوئی کام کر کے دکھائیں گے"

"کوشش تو میں ایسی ہی کر رہا ہوں"

"آپ کو تین مہینے کی اور مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اتنے عرصے میں آپ نے کوئی کام نہیں کیا تو پھر آپ کو یہاں رکھنا فضول ہوگا۔ سمجھے؟"

"ہاں سمجھ گیا۔ کوشش کروں گا"

"اچھی بات ہے جائیے"

(۳)

ایڈیٹر صاحب کے بنارس جانے کے دو دن بعد تشکل جی مہاراج پھر انسپکٹر کے پاس پہنچے انسپکٹر انہیں دیکھ کر کچھ تعجب کے لہجہ میں پوچھا "کہئے کوئی نئی بات؟"

تشکل جی نے "سوراج سوپان" کا تازہ نمبر اُن کے سامنے رکھ دیا اور کہا "اس کا لیڈر پڑھ جائیے"

انسپکٹر نے لیڈر پڑھا۔ لیڈر پڑھ چکنے کے بعد اُس نے کہا "مقالہ تو بہت ہی سخت ہے۔ اس کے سبب تو ایڈیٹر یقینی پھنس جائیں گے"

"تو بس ٹھیک ہے۔ اسی لئے تو لکھا گیا ہے"

"کس نے لکھا ہے؟"

"میں نے"

"اچھا!"

"جی ہاں! اس دن آپ نے کہا تھا کہ کچھ کام کر کے دکھلاؤ۔ سو فی الحال مجھے یہی سوجھا۔ ایڈیٹر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ آجکل میں ہی لکھتا ہوں۔ میں نے سوچا یہ اچھا موقع ہے"

انسپکٹر نے ذرا مسکرا کر کہا "خوب! لیکن اس سے نتیجہ؟"

تشکل جی نے سوچا تھا کہ انسپکٹر اُن کی اس کارگزاری پر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن جب اُس نے مذکورۂ بالا سوال اٹھایا تو تشکل جی کا چہرہ اتر گیا۔ انہوں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "نتیجہ؟"

"ہاں اور کیا اس سے اس کے علاوہ اور کیا ہوگا کہ ایڈیٹر کو سال دو سال کی سزا ہو جائے گی بس!"

"اور آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"خالی ایڈیٹر کو جیل ہی جانے سے ہماری کارگزاری ثابت نہیں ہوتی۔ ہم تو یہ جانتے تھے کہ ہمیں اُن کے اُن ساتھیوں اور دوست احباب کا پتہ لگتا۔ جن کے خیالات حکومت کے خلاف ہیں۔ ایڈیٹر کے جیل چلے جانے سے یہ بات نہ ہوگی۔"

شکل جی بکے بکے ہو کر انسپکٹر کا منہ تاکنے لگے۔ انسپکٹر نے کہا: "اب آپ میرا مطلب سمجھے؟"

شکل جی اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔ "جی!"

کچھ لمحہ تک سوچ کر انسپکٹر نے کہا۔ "خیر" اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ لیکن اب بھی آپ کے لئے بہت وقت ہے اس مقالے کے بارے میں ایڈیٹر کو سزا ہونے میں تین چار مہینے لگ جائیں گے۔ ممکن ہے اس سے زیادہ بھی لگ جائے۔ اس لئے آپ اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں"

شکل جی کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے دانت نکال کر کہا: "ہاں یہ بات تو ہے۔ ابھی کافی وقت ہے"

ایڈیٹر صاحب نے سوراجیہ سوپان کا نمبر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "مقالہ تو بہت شاندار رہا لیکن کچھ باتیں تو اس میں ایسی آ گئی ہیں۔ جن پر اگر سرکار چاہے تو مقدمہ چلا سکتی ہے"

شکل جی نے کہا۔ "چلا سکتی ہے تو چلائے۔ میں اس بات سے ذرا بھی خائف نہیں ہوتا میں تو ہر وقت جیل جانے کے لئے تیار ہوں"

ایڈیٹر نے ہنس کر کہا۔ "لیکن اس معاملے میں تمہیں نہیں مجھے جیل جانا پڑے گا"

"کیوں؟"

شکل جی نے زیادہ تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ اخبار کا ایڈیٹر۔ ناشر۔ طابع سب کچھ میں ہی ہوں"

"لیکن مقالہ تو میں نے لکھا ہے"

"تو اس سے کیا ہوا۔ اوّل تو اس میں تمہارا نام نہیں ہے۔ دوسرے اس کا جواب دہ تو میں ہی ہوں"

شکل جی نے سر جھکا لیا اور بہت سست ہو گئے۔ ایڈیٹر نے شکل جی کی حوصلہ افزائی کرنے کے خیال سے کہا۔ "کوئی زیادہ فکر کی بات نہیں ہے جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا"

شکل جی روتی صورت بنا کر بولے۔ "اگر آپ پر کچھ آنچ آئی تب تو مجھے بڑا ہی افسوس ہوگا"

"افسوس ہونے کی کونسی بات ہے بہت ہوگا سال دو سال کی سزا ہو جائے گی۔ تو کاٹ آوں گا جب اوکھلی میں سر دیا۔ تو موسل کا کیا ڈر؟"

"اجی آپ مجھے آگے کر دیجئے گا۔ میں صاف صاف کہ دوں گا کہ مقالہ میں نے لکھا ہے"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے تو اس سے میں بچ نہ سکوں گا اور اگر بچ بھی سکتا۔ تب بھی میں ایسا نہیں کرتا۔ ہمارا یہ قاعدہ نہیں ہے۔ اور ہمارا کیا۔ کسی اچھے ایڈیٹر کا بھی ایسا قاعدہ نہیں ہو سکتا"

"تب تو بڑا برا ہوا"

"کچھ برا نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا سب اچھا ہوا"

اوپر سے کہنے کو تو ایڈیٹر صاحب نے کہ دیا، لیکن دل میں وہ شکل جی کی اس نالائق حرکت پر بہت ہی کڑھے، لیکن اپنا غصہ انہوں نے اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ کہیں شکل جی انہیں خائف اور ڈرپوک نہ سمجھے۔ اسی وقت ایڈیٹر صاحب کے ایک دوست آگئے انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "کل کے نمبر میں تو بڑے زور کا افتتاحیہ لکھ مارا"

ایڈیٹر صاحب ذرا مسکرا کر بولے "آپ کو پسند آیا؟"

دوست موصوف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "مجھے ہی کیا سب ہی کو پسند آیا۔ آپ کو پتہ ہے یا نہیں کل ہرکاروں نے دگنے دام پر نمبر بیچے ہیں"

ایڈیٹر صاحب کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ ارے تعریف کے باغ باغ ہو کر بولے۔ "اچھا!"

"جی مقالہ بھی تو غضب کا لکھا ہے۔ میں نے تو اسے تین چار بار پڑھا۔ خوب لکھا ہے واہ وا!"

ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ "وہ مقالہ شکل جی کا لکھا ہوا تھا"

گو یہ کہتے ہوئے اڈیٹر صاحب کو تھوڑا افسوس ہوا، لیکن وہ اتنے تنگدل بھی نہیں تھے کہ شکل جی کو دھتا بتا کر ساری شہرت خود لوٹ لیتے۔ دوست موصوف شکل جی کی طرف دیکھ کر بولے "اچھا" تب تو اور بھی کمال کی بات ہے۔ شکل جی آپ تو چھپے رستم نکلے"

شکل جی دانت نکال کر بولے۔ "اجی میں کیا ہوں؟ یہ سب ایڈیٹر صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے" "ہاں بھئی ان کی تعلیم ایسی ویسی تھوڑی ہی ہو سکتی ہے اس وقت آپ کی ٹکر کا ایڈیٹر

ہندی میں اور رہے کون؟"

ایڈیٹر صاحب نے دل میں سوچا۔ "چلو حقیقی شہرت تو ہمیں کو حاصل ہے" اس خیال نے ایڈیٹر صاحب کے دل کی پوشیدہ فیاضی کو تماشا کر دیا اس لئے انہوں نے کہا۔ "تعلیم پانے کے لئے شاگرد میں اہلیت بھی تو ہونی چاہئے۔ شکل جی میں اہلیت ہے اس لئے وہ جلد سیکھ گئے۔ بہت سے تو ایسے ہوتے ہیں کہ برسوں سیکھنے پر بھی انہیں ایک جملہ لکھنا نہیں آتا۔"

دوست نے غور و تامل سے کہا "یہی بات ہے جس وقت استاد اور شاگرد دونوں قابل ہوتے ہیں تب ہی کچھ ہوتا ہے!"

(۴)

اوپر کے واقعہ کو ہوئے دو مہینے گزر گئے۔ شکل جی کے مقالہ کا چرچا آٹھ دس دن رہا اس کے بعد رفتہ رفتہ لوگ اسے بھول گئے۔ ایک دن علی الصباح پولیس نے ایڈیٹر صاحب کا گھر اور 'سوراجیہ سوپان' کا دفتر گھیر لیا۔ دونو مقامات کی تلاشی لینے کے بعد پولیس ایڈیٹر صاحب کو گرفتار کر کے لے گئی۔ الزام وہی۔ اخبار میں باغیانہ مضمون لکھنے کا۔ لگایا گیا۔ ایڈیٹر صاحب اسی دن ضمانت پر رہا کئے گئے اچھے۔ وقت پر اُن کا مقدمہ شروع ہوا۔ حکم سنائے جانے کے چار دن پیشتر ایڈیٹر صاحب نے شکل جی سے کہا "شکل جی میں تو اب جیل جا رہا ہوں"

شکل جی نے سراسیمگی کا اظہار کر کے بولے "کیا یقینی ہے؟"

"بالکل"

"یہ آپ نے کیسے جانا؟"

"ارے بھائی یہ تو ظاہر بات ہے جیسی کہ افتاد ہے۔ اس کے دیکھتے ہوئے تو بچنا محال ہی ہے۔ آگے خدا کی مرضی ہے۔ ہاں تو میری عدم موجودگی میں اخبار کا سارا بار آپ ہی پر رہیگا"

شکل جی حیرت زدہ ہو کر بولے۔ "مجھ پر رہے گا؟"

"ہاں آپ پر رہیگا مجھے اور کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جس پر میں پورا بھروسہ کر سکوں"

شکل جی بت بنے بیٹھے ایڈیٹر صاحب کا منہ تاکتے رہے۔ ایڈیٹر صاحب کہتے گئے "زیادہ سے زیادہ دو برس کی سزا ہوگی۔ دو برس تک سب آپ کو ہی کرنا ہوگا۔ اگر کوئی قابل

مددگار مل جائے تو اُسے رکھ لیجئے گا۔ سین مدیر دو ہیں ہی۔ کام چلتا رہے گا۔ اور ایک مہربانی کیجئے گا۔ جب تک میں رہا ہوکر نہ آؤں تب تک کوئی مقالہ ایسا نہ لکھئے گا جو سرکار کی نظر میں آفت برپا کرے۔ کیوں کہ اگر آپ بھی جیل میں پہنچ گئے۔ تو یہاں کا سب کام چوپٹ ہو جائیگا۔ اور گھر کی دیکھ بھال بھی آپ ہی کیجئے۔ ویسے تو میں نے اپنے ایک رشتہ دار کو لکھ دیا ہے۔ وہ کل پرسوں تک آجائیں گے۔ لیکن نگرانی آپ کی ہی رہے گی۔ وہ فقط گھر کا انتظام سنبھالے رہیں گے۔" شکل جی خاموش بیٹھے رہے۔

ایڈیٹر صاحب نے کہا۔ "آپ تو گم صم بیٹھے ہیں کچھ 'ہاں نہیں' تو کہئے۔"

شکل جی بولے۔ 'ہاں نہیں' کیا کہوں مجھے جب یہ خیال آتا ہے کہ صرف میرے باعث آپ پر یہ مصیبت نازل ہوئی"

"اس کا خیال آپ بالکل چھوڑ دیجئے۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ اس میں آدمی کا ایک پاؤں جیل خانہ میں ہی رہتا ہے۔ آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ کے مقالے سے اخبار کو فائدہ ہی پہنچا جب سے وہ مقالہ نکلا ہے تب سے خریداروں کی تعداد بڑھ گئی ہے"

"مجھے تو بڑا افسوس ہے۔"

"آپ کا افسوس بیکار ہے۔ ہم لوگوں کا تو یہ کام ہی ہے۔ کل میں آپ کو ایڈیٹر، طابع اور ناشر بنانے کے لئے ڈکلیریشن دلوا دونگا۔ بس پھر میں بے فکر ہو جاؤں گا"

شکل جی کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اس وحشت ناک خبر کے بعد شکل جی انسپکٹر صاحب سے ملے اور انہوں نے سب واقعہ اُسے سنایا۔

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ کبھی بھی اس جھنجھٹ میں نہ پڑئے گا ورنہ آپ سی، آئی، ڈی محکمہ سے علیحدہ کر دئے جائیں گے"

"لیکن اگر میں اس وقت قبول نہ کروں گا تو اخبار کے بند ہو جانے کا اندیشہ ہے"

"بڑی عمدہ بات ہے ہم تو یہ چاہتے ہی ہیں کہ اخبار بند ہو جائے"

"لیکن کل ایڈیٹر صاحب میرے نام سے ڈکلیریشن دینے والے ہیں"

"آپ صاف طور پر انکار کر دیجئے"

"میں جس مصیبت میں ہوں اس کو دیکھتے ہوئے تو بہت دشوار ہے"

"مصیبت کچھ نہیں آپ یہ کام مت کیجئے گا۔ نہ ہو۔ کچھ بہانہ کر کے ٹل جائیے"

"کہاں ٹل جاؤں؟"

"کہیں باہر چلے جائیے"

"شکل جی بولے اچھا کوشش کروں گا"

انسپکٹر نے ذرا کڑک کر کہا "کوشش کے کیا معنی! ہم لوگ ایسا لفظ سننے کے کم عادی ہیں یہ کہئے کہ ایسا ہی ہوگا"

انسپکٹر کا یہ کہنا شکل جی کو برا لگا۔ انہوں نے کہا: "اس طرح ایک دم سے بھاگ جانے سے لوگ مجھے کیا کہیں گے اور ایڈیٹر صاحب کیا سمجھیں گے؟"

"اف اوہ! آپ تو بڑے بزرگ معلوم ہوتے ہیں! ایسا ہی تھا تو آپ نے مقالہ لکھ کر انہیں بھیجا ہی کیوں؟ میں نے تو آپ سے مقالہ لکھنے کے لئے کہا نہیں تھا" انسپکٹر نے بڑی سادگی سے مسکراتے ہوئے کہا

شکل جی کچھ جواب نہ دے سکے۔ انہوں نے اپنا سر جھکا لیا۔

انسپکٹر پھر بولے "اس محکمہ میں مروت و شرافت کام نہیں دیتی۔ اس میں تو بس جو آپ سے کہا جائے اسے آنکھ بند کر کے کیجئے۔ تب ہی آپ اس میں ٹک سکیں گے اور ترقی کر سکیں گے"

شکل جی نے سوچ کر کہا "اچھی بات ہے"

شکل جی انسپکٹر کے پاس سے چلے آئے۔ رات میں بڑی دیر تک پلنگ پر پڑے پڑے شکل جی اس معاملے کی نسبت غور کرتے رہے۔ ایک جانب اُس کو ایڈیٹر صاحب کی سادگی، اپنے اوپر اُن کی محبت اور اعتماد کا خیال آتا تو دوسری طرف انسپکٹر کی بیرحمی، خودغرضی اور بے مروتی کا دھیان۔ شکل جی نے سوچا "انسپکٹر اور ایڈیٹر صاحب میں سے سب سے کونسا مالک بہتر ہے۔ ایک تو ہم پر اتنا اعتماد اور محبت کرتا ہے کہ اگرچہ ہمارے باعث ہی وہ جیل جا رہا ہے تاہم وہ سب کچھ ہمیں سونپ جا رہا ہے۔ دوسری جانب ایسا مالک ہے جو پرلے درجے کا خودغرض ہے جو کوشش کا لفظ کہنے پر ملوکھے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ جس کی گفتگو حکومت اور دھمکی سے بھری رہتی ہے۔ جو ہم پر پوری طرح اعتماد نہیں کرتا، جو ذرا سی غفلت ہونے پر ہمارا دشمن بن سکتا ہے"

دوسرے دن شکل جی سے ایڈیٹر صاحب بولے: "آج تمہاری جانب سے کلیکٹر

داخل ہو جانا چاہئے"

شکل جی نے کہا "اچھی بات ہے"

اسی دن ڈیکلریشن داخل کر دیا گیا۔ ڈیکلریشن منظور ہونے کے تیسرے دن حکم سنایا گیا۔ ایڈیٹر صاحب کو ڈیڑھ سال کی سزا اور دو سو روپیہ جرمانہ ہوا۔ ایڈیٹر صاحب کے جیل چلے جانے کے بعد شکل جی نے "سودا جیہ سوپان" کو بڑی قابلیت کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ ڈیکلریشن منظور ہونے کے ایک دن پہلے شکل جی انسپکٹر سے ملے تھے تب سے وہ اس سے نہیں ملے۔ ایک دن راستے میں اس سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ انسپکٹر نے مسکرا کر سادگی سے کہا "اب تو آپ پورے دیش بھگت بن گئے؟"

"جی ہاں آپ اپنا مطلب کہئے"

"میرا مطلب؟ وہ بھی آپ کو جلد معلوم ہو جائے گا۔ افسوس صرف اتنا ہے کہ ایک دن آپ کو بھی جیل کی ہوا کھانی پڑے گی"

"اس کے لئے تو میں خود تیاری کر رہا ہوں۔ صرف ایڈیٹر صاحب کے آنے کی دیر ہے"

"اچھا!" انسپکٹر نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ کو شک بھی ہے کیا؟ آخر آپ کی باتوں میں آ کر میں نے جو پاپ کیا ہے مجھے اس کا کفارہ بھی تو ادا کرنا ہے۔ بغیر جیل گئے کفارہ ادا ہو گا نہیں"

"اچھا جیل جانے کے لئے کیا کیجئے گا؟"

"کچھ نہیں۔ جیسا ایک مقالہ پہلے ایڈیٹر صاحب کو پھانسنے کے لئے لکھا تھا ویسا ہی ایک پھر لکھ دونگا۔ اور ایڈیٹر صاحب کے رہا ہونے کے ٹھیک دو مہینے پہلے لکھونگا"

"اگر آپ ہمارا کام کرتے رہتے تو یہ نوبت کاہے کو آتی؟ اس وقت چین کرتے ہوتے"

"بھگوان اس چین سے بچائے۔ اس چین سے یہ بے چینی کہیں اچھی ہے" اتنا کہکر شکل جی چل دئے۔ انسپکٹر ہونٹ چباتا ہوا ان کی طرف تاکتا رہ گیا۔ (مادھری)

میر کی ایک اور تصنیف

از

جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔اے (لکھنؤ یونیورسٹی)

اُردو انشاپردازی کے صدر مجلس اور ادبی و لسانی تحقیق کے خضر طریقت حضرت آزاد مغفور نے اپنی غیر فانی کتاب آبِ حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہے جو تنگ نگاہوں میں سما نہیں سکتا۔ اور ان کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ ان کے اکثر بیانوں کا من گڑھت افسانوں میں شمار کر لیا جائے۔ کوتاہ نظری اور تنگ ظرفی نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جس نے آزاد پر جا بے جا اعتراض کر دینا اپنی وضع میں داخل کر لیا ہے۔

لیکن دور بیں نگاہیں دیکھتی ہیں کہ یہ حالت بہت دنوں تک قائم رہنے والی نہیں ہے۔ ادبی تحقیق کا ذوق اب ہمارے دلوں میں گھر کر رہا ہے۔ اور اپنے ادبی دفینوں کی تلاش میں خاک چھاننے کی دھن پیدا ہو چلی ہے۔ یہ ذوق ذرا اور پختہ اور یہ دھن کچھ اور پکی ہوئے اور تحقیق کے راستوں کی مصیبتوں اور خطروں کا احساس عام طور پر ہونے لگے تو یہ عارضی "آزاد بیزاری" بے شبہ "آزاد پرستی" میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت بھی ادبی تحقیق میں آزاد ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ ان سے اختلاف کرنا محقق ہونے کی سند سمجھا جاتا ہے۔

آزاد کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی یا پھیلائی جا رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دسترس سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہے اس کو آزاد کا گڑھا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں۔ لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں اُن کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھیرتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ آزاد تحقیق کو افسانے سے زیادہ دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ انشاپردازی کا یہ کمال اگر کسی اور کے حصہ میں نہ آیا ہو تو آزاد سے نہیں فطرت سے لڑنا چاہئے۔ آزاد کی تحقیق اور انشاپردازی پر مفصل بحث کرنے کا یہ محل

نہیں ہے لیکن ع دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے۔

میر تقی میر کے بارے میں آزاد کی بہت سی مفروضہ غلط بیانیاں دکھائی جا چکی ہیں۔ انہیں کی تصانیف میں آزاد نے رسالہ فیض میر کو بھی شمار کیا ہے۔ جس وقت تک یہ رسالہ دنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا اس وقت تک وہ آزاد کی تصنیف کیا ہوا افسانہ تھا۔ آج یہ رسالہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے[1]۔ اب دیکھئے وہی افسانہ ایک حقیقت بن گیا۔ اسی طرح ادبی تحقیق جس قدر بڑھتی جائے گی آزاد کے افسانے حقیقت بنتے جائینگے۔

آزاد نے ہم کو بہت سی راہیں پہلے پہل دکھائی ہیں اور بہت سی کہانیاں پہلے پہل سنائی ہیں۔ اگرچہ بہت سی باتیں آزاد نے ایسی کتابوں سے لی ہیں جو طاق نسیاں کا نقش و نگار ہو گئیں یا جن کا ایک آدھ بوسیدہ کرم خوردہ نسخہ دنیا کے کسی گوشے میں پڑا ہوا ہے۔ تاہم چونکہ اُن کو منظر عام پر لانے کا سہرا حضرت آزاد ہی کے سر ہے لہذا ان باتوں کے علم کیلئے بھی ہم آزاد ہی کے منت گزار ہیں۔ فیض میر کا نام بھی انہیں کی بدولت ہم تک پہونچا[2]۔ مگر آزاد نے اس رسالے کا فقط نام ہی لکھا ہے۔ غالباً یہ رسالہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا۔ ورنہ وہ اس کے موضوع وغیرہ کا کچھ ضرور ذکر کرتے۔

فیض میر کے ذکر سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ البتہ محسن نے میر کی تصنیفوں کی فہرست ان لفظوں میں دی ہے:۔

"چھ دیوان ہندی مع قصائد و مثنوی۔ ایک دیوان فارسی۔ ایک تذکرہ۔ ایک رسالہ فیض میر کے نام سے یادگار ہے[3]"

مولف تذکرہ کے قلم کی لغزش ہو یا کاتب کی اصلاح۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میر فیض وہی رسالہ مراد ہے جس کا صحیح نام آزاد نے فیض میر بتایا ہے۔

ایک زمانہ ہوا کہ اودھ کے شاہی کتب خانوں کی فہرست میں میں نے ذکر میر کا نام دیکھا[4]۔ حضرت میر کی خود نوشتہ سوانح عمری کی زیارت کے لئے دل بے چین ہو گیا۔ میں ان دنوں قدیم اور کمیاب کتابوں کی تلاش میں لکھنو کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ میری آنکھیں ذکر میر کو ڈھونڈتی تھیں۔ لیکن اس کا پتہ کہیں نہ لگتا تھا۔ طلب صادق کی کشش دیکھئے کہ ایک مدت کے بعد میر کی غیر مطبوعہ اور نہایت کم یاب تصنیفوں کا ایک مجموعہ ہاتھ آگیا

---

[1] رسالہ فیض میر زیر طبع ہے۔ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ [2] آب حیات صفحہ ۲۰۰ سطر ۱۰ ذکر میر صفحہ ۲۶
[3] فہرست کتب خانہائے اودھ مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر صفحہ ۶۶۷ سطر ۶

اس مجموعے میں ذکر میر بھی تھی۔ میر کا فارسی دیوان بھی تھا۔ اور رسالۂ فیض میر بھی تھا۔ اس گنج بادآور کے ملتے ہی مجھے خیال ہوا کہ جس گلدستہ سے میں نے اپنی آنکھیں روشن کی ہیں اس سے ارباب ذوق کی نگاہوں کی بھی ضیافت کروں۔ ذکر میر کی اشاعت طے ہوئی۔ کاتب تلاش کیا گیا۔ مقدمہ لکھنے کا سامان ہونے لگا۔ یہانتک کہ کتاب کی نقل بھی ختم کے قریب پہونچی۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت کی سعادت میری قسمت میں نہ تھی۔ یکایک رسالۂ اردو نے خبر دی کہ انجمن ترقی اردو عنقریب ذکر میر کو شائع کرنے والی ہے[1]۔ غرض کہ میری یہ محنت رائگاں ہوئی اور دل کی ایک امنگ بجھ کر رہ گئی۔ مگر میر کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ کسی کام کو شروع تو میں نے کیا لیکن ختم کسی اور نے کر دیا۔ بہر حال ذکر میر شائع ہو گئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو قلم اردو نظم کے میدان میں کوثر اور سلسبیل بہاتا تھا۔ وہ فارسی نثر میں بھی کیا کیا گلکاریاں کرتا ہے۔ نکات الشعرا نے میر کی فارسی انشا پردازی کی سند میں جو خط پیش کیا تھا اس پر ذکر میر نے ایک اور للکار دی۔

نکات الشعرا اور ذکر میر دو آئینے ہیں کہ میر کی سوانح نگاری کے جوہر دکھاتے ہیں اگر میر کے قلم کی رفتار تصوف اور الٰہیات کی دشوار گزار منزلوں میں دیکھنا ہو تو فیض میر پڑھئے

فیض میر ایک مختصر رسالہ ہے۔ مصنف نے نہایت فقہ و لغت کے بعد لکھا ہے:۔

"سیکویہ فقیر حقیر میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسر من ذوق خواندن ترسل پیدا کردہ بود۔ لذا حکایات خمسہ متضمن فوائد بیار را باندک فرصت نگاشتم مراعات رسم ادنمودہ نام نسخہ فیض میر گذاشتم"

یہ عبارت بتاتی ہے کہ میر نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی کے لئے لکھا اور انہیں کے نام کی رعایت سے اس کا نام فیض میر رکھا۔ میر صاحب! سبحان اللہ! سبحان اللہ! آپ کے ذوق لطیف اور حسن تلاش کی داد کون دے سکتا ہے؟ کتاب کس نے لکھی۔ کس کے لئے لکھی۔ اور کس موضوع پر لکھی۔ مذاق سلیم ان سب باتوں پر نظر کرتا ہے اور اس نام کے مزے لیتا ہے۔

میر کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ رسالۂ فیض میر میں پانچ حکائتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن یہاں حکایت سے مراد نہ بادشاہوں اور وزیروں

---

[1] رسالۂ اردو روایت اپریل ۱۹۳۶ء

کے قصے ہیں نہ دیووں اور پریوں کی کہانیاں۔ ان حکایتوں میں میر نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی نہیں آنکھوں سے دیکھی باتیں ہیں۔ یہ واقعات ہوں یا میر کی خوش عقادی کے کرشمے۔ بہر حال ان کی روشنی میں میر کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے۔ اور واضح ہو جاتا ہے کہ شاعروں کے پیر[1] حضرت میر ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی خدمت کو اپنی عزت اور ان کی دلجوئی کو فرض انسانیت سمجھتے تھے۔ ان کو خدا رسیدہ جانتے اور صاحب کرامات مانتے تھے۔ تصوف اور الٰہیات کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُن کو غور سے سنتے تھے اور سمجھتے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے جسکی تربیت میر علی متقی اور میر امان اللہ[2] کی گود میں ہوئی ہو اُس کی طبیعت کا اندازا در کیا ہوتا۔

میر کی شاعری کو بخوبی سمجھنا ہو تو خود میر کو سمجھئے اور میر کو سمجھنا ہو تو ذکر میر اور فیض میر پڑھئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے کلام کی تہ کو پہونچنے کے لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ذکر میر اگر میر کے ماحول کا صحیح نقشہ ہے تو فیض میر اُن کی سیرت کی سچی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے صوفیوں کا انداز طبیعت۔ پرواز خیال۔ اور طرز کلام بھی خوب سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے عشق حقیقی کے معاملات اور تصوف کے خیالات جو ہماری شاعری کو زینت دیتے ہیں اُن کے ذہن نشین کرنے میں بھی اس رسالے سے بہت مدد ملے گی۔

میر کی معاشرت۔ حالات زندگی اور تعلقات خاندانی کے بارے میں اس رسالے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ میر کے یہاں ایک غلام اور ایک بوڑھی خادمہ تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے لئے لطشت و آفتابہ استعمال کرتے تھے۔ شہسواری جانتے تھے۔ مگر گھر میں گھوڑا نہ تھا۔ اکبرآباد کو چھوڑ کر دہلی میں رہنا شاق تھا۔ ان کے ایک بیٹے فیض علی تھے اور ایک عزیز محمد حسین کلیم تھے جو اسحاق خاں شہید کے چھوٹے بھائی مرزا محمد علی کے یہاں پچاس روپے ماہوار پر نوکر تھے۔

میر کو فارسی زبان پر جو عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت تھی وہ ان لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جنھوں نے میر کی خود نوشتہ سوانح عمری، ذکر میر اور اُن کا تذکرہ نکات الشعرا

[1] میر خود کہتے ہیں ع۔ گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں۔ [2] ذکر میر صفحہ ۲۰

دیکھا ہے۔ میر کے ہمعصر بھی اُن کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے میر حسن نے اِن کی نظم کے ساتھ نثر کی بھی تعریف کی ہے:۔

"چراغ نثر ش روشن و ساحت نظمش گلشن"[1]

میر بالعموم مقفےٰ عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیہ کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بے ساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ شاذ کہیں کہیں کچھ تصنع پیدا ہو گیا ہو لیکن زیادہ تر عبارت کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ ہم قافیہ فقروں اور جملوں کی قید سے عبارت میں اکثر یہ نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر فقرے اور جملے کے بعد جو دوسرا جوابی فقرہ یا جملہ آتا ہے اس میں کبھی پہلے فقرے یا جملے کے مفہوم کی بیجا تکرار ہوتی ہے اور کبھی بے ضرورت لفظوں کی بھرتی ہوتی ہے۔ اس سے عبارت میں تصنع۔ طوالت۔ اور سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن میر کے یہاں یہ نقص نہیں ہے۔ ان کے یہاں جوابی فقرے اور جملے بھی چست ہوتے ہیں اور اپنا مفہوم علیحدہ رکھتے ہیں اس کے علاوہ جس عبارت میں بڑے بڑے جملوں کے آخر میں قافیہ لایا جاتا ہے۔ وہ اکثر بے لطف معلوم ہوتی ہے لیکن میر کے یہاں چھوٹے چھوٹے جملوں بلکہ دو لفظی اور سہ لفظی فقروں کے بعد قافیہ آتا ہے تو عجب بہار دکھاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو:۔

"پسر او را خوں بگیرد۔ خود ش بخواری بمیرد۔ ناگہاں آتش در افتد۔ رسم باش و بود بر افتد۔ از سن آثار نماند۔ اینجا دیار نماند۔ آبادی غیرت وادی شود۔ مار بہ عصا را ہ رود۔ مردماں تباہ۔ خانہا سیاہ۔ ازیں سر تا بہ آں سر ویرانہ۔ ایں با ہم نشستہا افسانہ۔ مجلہ آراستہ۔ اینجا تو نبود"

"آں سرمایۂ جانہا کہ مقصود دلہاست آئینہ در پیش دارد۔ و سرے با خویش گرم تماشائے خود ست۔ و جوئے سرا پائے خود۔ اگر بر آسمان سفتم روی بے پرواست۔ و در خاک شوی ہماں گرم استغنا۔ بنگری او رنگہا دار۔ و ساز و حدتش آہنگہا۔ شفق یا دمی دہد از رنگ آتش۔ گل بیگوید کل بجا لش"

"تو میدی از برائے چہ مقصود ہمکنارست۔ دل تنگ چرا نشستہ کہ عالم ہمہ یارست۔ برخیز و سیاحت کن۔ خوش باش و فراغت کن۔ برخاستم ہمراہ شدم۔ اگاہے بود آگاہ شدم"

"خدا طرفہ خود آراست۔ غریب دلبر خود نماست۔ گرد در اہش قیامت انگیزد۔ و طرز خوشش بلا ریزد۔ کار او ہیچ بفہم در نیاید۔ دانش اعتراف بعجز می نماید۔ حیران کار خود مند۔ و شیفتہ قدت پسند۔ او سرگرم کار۔ فکر در آثار۔ آگاہ ناآگاہ۔ دلیل گمراہ۔ او را کہ فہم۔ ایں جا ہمہ وہم"

---

[1] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۷۵

میر اپنی نثر میں عام طور پر قافیے کا التزام کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ قافیے کی تلاش میں مطلب کی راہ بھول جائیں اور نہ یہی ہے کہ بغیر قافیہ کے قدم آگے نہ بڑھائیں ایسے جملے اور فقرے بکثرت ہیں جن کے جوابی جملے اور فقرے نہیں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں دور تک نثر عاری لکھتے چلے گئے ہیں مثلاً:۔

"باآنکہ محو یاد الٰہی می بود اما ربط در تتبع شعر و شاعری داشت۔ یکے دم صبح مرا خواست۔ چوں حاضر شدم گفت کہ حفقان بشدت دارم۔ واشدے نیشود۔ شعرہائے عاشقانہ بخوانں کہ زار بگریم۔ اتفاقاً ایں شعر از زبان من برآمد ؎

مبر پیش دل نوشکیب من تاش ۔ کہ از برائے تپیدن بہانہ می طلبد

دست بر دل نہاد و غش کرد۔ مردماں بر دو دستش برداشتہ۔ اندروں خانہ بردند۔ از اں بعد بیروں نیامد۔ دو سہ روز حال عجیب داشت۔ گاہے غش و گاہے افاقت۔ آخر در گذشتہ خدائے کریمش بیامرزاد۔"

توصیفی فقروں کے بنانے میں میر کو بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ جب کسی کے اوصاف بیان کرنے پر آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے فقرے پے در پے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"اسد دیوانہ۔ ساکن ویرانہ۔ سالک مجذوب۔ درویش خوب۔ رند بوریا پوش۔ چوں بحر در جوش۔ مردے بود کامل۔ ہمہ تن دست و دل۔ بالا بلند۔ وقت پسند۔ گرم جوش۔ سراپا ہوش۔ چسپاں اختلاط۔ خوش ارتباط۔ وضع مربوط۔ حال مضبوط۔ دل با یار دست در کار۔ قائم اللیل صائم النہار۔ ..... رو از دنیا بر تافتہ۔ عارف قرار یافتہ۔ ..... چادر بر دوش۔ بایک ستر پوش۔ پا بے کفش سر عریاں۔ گاہے خنداں گاہے گریاں۔"

"دلیل راہ عرفاں۔ میاں شاہ بر ہاں۔ دست از دنیا بر داشتہ۔ قدم براہ فنا گذاشتہ۔ آوارۂ بمنزل رسیدہ۔ بہ گلیم سیہ سر در کشیدہ۔ سفید گود بر ہنہ تن۔ باسمنی دریک پیرہن۔"

میر کو فلسفۂ الٰہیات کے مسائل سے دلچسپی تو تھی ہی وہ ان کو بڑی خوبی سے بیان بھی کر سکتے تھے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے:۔

"لذت دریافتن چیزے مایم است۔ والم دریافتن چیزے منافی آں۔ ہر قوت را از قوت

مدرکات لذت والم است بحسب آں قوت۔ چنانکہ لذت باصرہ در دیدن محبوب و لذت سامعہ در سماع آواز خوب۔ چندانکہ مدرک عظیم تر لذت قوی تر۔ و گراز ضداد است۔ رنج والم زیادہ است۔ چوں صحیح مدرک شریف تر از ذات وصفات واجب الوجود نیست پس صحیح لذت لذیذ تر۔ از معرفت او نباشد۔ و قوتہائے جسمانی با بدن می روند یعنی از فنائے آں باطل می شوند۔ قوت عقلی کہ لذت والم را می داند با نفس ناطقہ باقی میماند۔ ادراک نفس متعلق بہ بدن قاصر و مجرد در مشاہدۂ جمال او ناظر"

"در اثبات بعث و حشر دلائل بسیار است۔ اما عود نفس بہماں بدن دشوار است۔ مثلاً آدمی مرد و خاکش ہمہ خورد۔ و پس از روزگار طویل اجزائے ارضی بہ نبات مستحیل نبات غذائے حیوان شد و حیوان غذائے انسان۔ اگر ہمہ بر حشر بر گمارند بکدام صورت باز آرند معہذا نفوس مفارقہ را غایت نیست و ابدان را مادہ را نہایت۔ اگر حشر کنند و قسمت مواد کنند نفوس از مواد البتہ بیشتر آیند۔ . . . . . حقیقت جان آدم قدیم است بذات خویشتن۔ و گفتگوئے قالب در اینجا بر قالب زدن۔ گماں مبر کہ یعنی مرگ نیستی جاں عزیز است۔ ایں انقطاع تصرف آواز قالب ناچیز است۔ یعنی بعث و حشر آں باشد کہ جان را قالب ہماں باشد۔ قالب مرکبے بیش نیست از بدل آں چہ زیان است رو دل باسوار است۔ سوار خود ہماں است"

بہشت و دوزخ کہ قالب در آں شریک است متعارف است حاصل یکے حور و قصور و انہار و اشجار۔ حاصل دیگرے زہر و زقوم و مار و مار۔ اما بہشت و دوزخ روحانی یعنی لذت و الم جانی حاصل آں دریافت معقولات و مشاہدۂ آں ماہ تمام۔ حاصل ایں شرم و خجالت و خلل و آلام۔ حکما میگویند کہ نفس را بعد موت لذت عظیمے است کہ لب بتوصیف او نتواں کشاد۔ یا الم ایسے است کہ شرح آں نتواں داد۔ اشارت بہیں دو حال است نفوس کاملہ را لذت دوام ناقصہ را رنج و الم مدام"

میر کے قبضے میں فارسی لفظوں اور محاوروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اور اُن کے استعمال پر اُن کو جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس کے ثبوت میں کوئی مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کتاب کا ہر صفحہ اس پر شہادت دے رہا ہے۔

فیض میر کا زمانہ تصنیف نہیں معلوم ہو سکا۔ اتنا پتا تو چلتا ہے کہ میر نے یہ رسالہ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد۔ میر محمد حسین کلیم کی زندگی میں اور میاں سعید خاں کے انتقال کے بعد لکھا ہے۔ لیکن کلیم اور سعید خاں کے انتقال کی تاریخ بھی معلوم نہیں ورنہ اس رسالہ کی تصنیف کا زمانہ معین کرنے میں کچھ مدد ملتی۔

غزل

از

جناب صفی اورنگ آبادی (حیدرآباد)

خیال بھی دل بیمار کا ذرا نہ ہوا — خوش آمدید! کہاں تھے بہت زمانہ ہوا؟

وہ واقعات کسے یاد اک زمانہ ہوا — کسی نے کیا نہ کیا اور ہم پہ کیا نہ ہوا

جواب شکوہ بھی کیا خوب میں قرار دیتے — یہ میرا وہم ہے؟ تو تو کبھی خفا نہ ہوا

نہ جانے ہوتی ہے پھر اور عاجزی کیسی — یہ سر کبھی ترے قدموں سے تو جدا نہ ہوا

کیا جب آنے کا اقرار آپ بھول گئے — یہ ایک وعدہ تو شاید کبھی وفا نہ ہوا

وہ سب کے واسطے اچھا ہو میرے حق میں برا — ہزار شکر! کہ جو کچھ ہوا برا نہ ہوا

زمانہ آپ کو عاشق نواز کہتا ہے — یہ سچ بھی ہو تو کبھی ہم کو کچھ عطا نہ ہوا

مجھے کیا ہی اچٹتی نگاہ نے گھائل — مبارک آپ کا یہ تیر بھی خطا نہ ہوا

جواب اگر نہیں دیتے تو زہر دیدیتے — بڑے ہو کے بھی تو دل آپ کا بڑا نہ ہوا

زمانہ دوسرا دن دوسرے ہوئے تو ہوئے — وہ دوسرے نہ ہوئے میں تو دوسرا نہ ہوا

غم فراق بھی تھی کس مزے کی چیز کہ ہائے — کبھی زباں سے ترا شکر یہ ادا نہ ہوا

ستم کرے بھی تو سمجھوں کہ یہ ستم ہی نہیں — خفا ہو بھی تو جانوں کہ تو خفا نہ ہوا؟

وہ اب نہ آئے تو جانو کہ موت ہی آئی — ہمیں پہنچ گئے نالہ اگر رسا نہ ہوا

جناب دل! یہ لب و لہجہ اور وہ سجدے؟ — خطا معاف! خوشامد ہوئی گناہ نہ ہوا!

وہ خود ملیں تو بتا۔ کیا جواب دوں اے دل! — یہ عذر لنگ ہے کہ کوئی بھی رہ نما نہ ہوا؟
وہ کیا کہیں گے جو اقبال ہی نہ ہو مجھ کو — وہ کیا کریں گے جو میں قائل خطا نہ ہوا؟
کسی کا درد محبت اگر تھا کم مایہ — تو ٹھیر ٹھیر کے پھر کیوں ذرا روانہ ہوا
فراق دوست سے بھی جان بچ گئی افسوس! — یہ زہر بھی تو مرے درد کی دوا نہ ہوا
وہ خوش ہے یہ کہ کبھی اس نے مجھ کو خوش نہ رکھا — بھلا ہو اس کا کہ اس سے مرا بھلا نہ ہوا
ہم ان کے سامنے جب جو ہوئے رو دیئے گے — اگر وہاں سے اک حرف بھی ادا نہ ہوا
ترے سوال کا اب کیا جواب دوں ناصح! — یہ کب کی بات ہے۔ ملت ہوئی! زمانہ ہوا!!
زمانہ دیکھ نہ لے چشم دل سے کیا دیکھوں — اس آنکھ کو تو پلک کا بھی اسرا نہ ہوا

خدا سے دولتِ دنیا صفی میں کیا مانگوں
غضب ہوا جو مرا کام بے دعا نہ ہوا

سرمایہ داروں کے لیے زرین موقع

ملک میں علم و ادب کی خدمت کے لئے ملک والوں کے فائدہ ہی کے لئے ملک ہی کے مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر تجارتی کاروبار چلانے کی غرض سے انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ محدود کی بنیاد ڈالی گئی اور انجمن ہائے امداد باہمی ملک سرکار عالی کی تحت رجسٹری کرائی گئی ہے۔
انجمن کا کاروبار تین شعبوں پر منقسم ہے:-
(۱) تجارت کتب (۲) اشاعت کتب (۳) طباعت۔ اس انجمن کو اتحادی طور پر کام کرتے ہوئے چوتھا سال ہے۔ تین سال سے اپنے حصہ داروں کو سالانہ (۱۰) فیصدی نفع علاوہ زکوٰۃ کے تقسیم کر رہی ہے۔ انجمن کا مجوزہ سرمایہ ایک لاکھ روپے کے (۱۰۰۰) حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک حصہ کی قیمت ایک سو روپیہ ہے اور ہر حصہ کی آدائی (۲۰) اقساط میں۔ اجرا شدہ سرمایہ پچاس ہزار روپے۔ قیمت فروخت شدہ حصص۔ انتیس ہزار روپیہ شرکت کے فارم اور قواعد وضوابط کے لئے ذیل کے پتہ پر درخواستیں آنی چاہئیں۔

منتظم انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ محدود سٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

فن تقریر

از

(جناب غلام الطرصاحب عثمانیہ کالج)

تقریر و تحریر دونوں کا نقطہ ابتدار یہ ہے کہ پہلے مضمون کی تشریح کر دی جائے۔ کیونکہ اس طرح سامعین یا ناظرین مقرر یا انشا پرداز کے مقصد سے واقف ہو جاتے ہیں اور پھر بعد میں وہ جو کچھ کہتا یا لکھتا ہے اس کے سمجھنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ سمجھ لیجئے کہ تقریر و تحریر کا یہی ایک گر ہے۔ اسی بنا پر میں بھی پہلے اصل مضمون کی تشریح مناسب سمجھتا ہوں۔

"فن تقریر" میں دو لفظ ہیں۔ فن اور تقریر۔ فن کی اصطلاح گو عام ہے مگر غلطی سے اُسے علم کا مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔ علم صرف جاننا سکھاتا ہے اور فن کرنا۔ ایک شخص علم موسیقی کا ماہر ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ گا بھی سکتا ہو مگر جب فن موسیقی کا ماہر کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ بہترین گانے والا ہے۔ غرض فن کا عملیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔

اب تقریر کو لیجئے۔ دنیا میں تبادلہ خیالات کے دو ذرائع عام ہیں۔ تقریر و تحریر۔ ان میں وجود کے لحاظ سے تقریر کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

جب "فن تقریر" کہا جائے تو اس سے یہ مراد لینی چاہئے کہ ایک یا چند آدمیوں نے بیٹھ کر گفتگو کے چند اصول یا قواعد بنا لئے اور اُسے فن کا جامہ پہنا دیا۔ وہ زمانہ بھی تھا جب نہ گفتگو کی ضرورت تھی نہ اس کا وجود۔ جیسے جیسے آدم و حوّا کے سادہ لوح بچے کائنات کی رنگینیوں سے متاثر ہوتے گئے دنیا کے اسرار پنہاں ایک ایک کر کے ان پر عیاں ہوتے گئے، ان میں اجتماعیت کی روح دوڑتی گئی۔ انہیں نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ انہیں اظہار مطالب کی ضرورت ہوئی۔ پہلے پہلے اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ پھر زبان ٹوٹی۔ انسان اور زمانہ کے ساتھ گفتار نے بھی ارتقائی

منازل طے کیے تا ایں کہ آج اُس نے فن کا جامہ پہن لیا۔ اب ہم اُسے ترسیل خیالات کا صرف سادہ ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ اعلیٰ شئے سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُسے حاصل کرنے کی خاص طور پر کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش کے مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ یہ کوشش کیوں کی جاتی ہے؟ اس کا جواب انشاء اللہ آگے دیا جائیگا۔

پہلے میں ایک اچھی تقریر کے اجزاء ضروری بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

ایک کامیاب تقریر کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ سامعین کے معیار علم کے مطابق ہو۔ نہ تو اُن کی دماغی سطح سے بلند ہو نہ پست۔ اگر ایسا نہ ہو تو گو آپ اپنے دماغ کے جواہر پارے ہی اُن کے سامنے کیوں نہ پیش کریں لیکن اگر سامعین کے دماغ انکی کسوٹی نہیں ہیں تو وہ آپ کے جواہر ریزوں کو معمولی شیشے کے ٹکڑوں سے زیادہ وقعت نہیں دینگے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مقرر کو تا بحدِ امکان سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مصروف رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کا نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ اپنی تقریر کے تہیج کو دوسرے خارجی تہیجات سے زیادہ شدید اور دلچسپ بنائے۔ مثلاً تقریر میں موسیقیت پیدا کرنے کی کوشش کرلے۔ موسیقیت سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ وہ راگ میں تقریر کرے۔ بلکہ اُس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح موسیقی کے سُروں میں تناسب اور پورے گانے میں ایک خاص طرح کا ربط ہوتا ہے یہی حال تقریر کا بھی ہونا چاہیئے یعنی الفاظ میں برجستگی ہو۔ تقریر میں تسلسل اور تناسب ہو کہ جب تقریر ختم ہو تو سامعین اس طرح چونکیں جیسے راگ ختم ہونے پر انتہائی محویت سے چونکتے ہیں۔ جس طرح ایک اچھا گانا سنکر معمولی سے معمولی آدمیوں کے قلوب بھی رقص کرنے لگتے ہیں اسی طرح بہترین تقریر کی خصوصیت ہونی چاہیئے اس سے سامعین محظوظ بلکہ متکیف ہو جائیں۔

تقریر میں تمام امور سلسلہ وار اور اپنی اپنی جگہ پر بیان کیے جائیں ورنہ تقریر کی حالت ویسی ہی ہوگی جیسی اس نظم کی جس میں اشعار کے مصرعے تبدیل کر کے بے موقع مصروں کے ساتھ جوڑ دیے گئے ہوں۔

تیسری بات یہ ہے کہ تقریر کرنے سے پہلے مقرر کو سامعین کی ذہنی حالت کا اندازہ لگا لینا چاہیئے اور یہ بھی معلوم کر لینا چاہیئے کہ اُن کے خیالات کا بہاؤ کدھر ہے۔ تھوڑی دور تک اُن کے ساتھ جانا چاہیئے اور پھر اُن کو اس طرح موڑ کر اپنے راستے پر لگا لینا چاہیئے۔

کہ انہیں کوئی اجنبیت نہ محسوس ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو مقرر اور سامعین کے خیالات میں تصادم ہو جائے گا اور ایسی تقریر سے سامعین کو وہی تکلیف ہوگی جو انتہائی تیزی سے دوڑتی ہوئی کو یکایک رک جانے سے ہوتی ہے۔ اس نکتہ کو وہ لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے شکسپیر کے ڈرامہ "جولیس سیزر" میں مارک انتونی کی وہ تقریر پڑھی ہے جو اُس نے سیزر کے جنازہ پر کی۔

ایک اور بات قابل لحاظ یہ ہے کہ تقریر کو زمانہ کے مطابق سانچوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یعنی زمانہ کا جو عام میلان ہو اپنی تقریر کو اسی میلان کا رنگ دیکر پیش کرنی چاہیئے۔ مثلاً آجکل زمانہ کے خیالات سائنٹفک اور فلسفیانہ ہیں۔ صرف دعوؤں سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ دیکھنے والے دعوے کے ساتھ دلائل بھی طلب کرتے ہیں۔ تاہم مذہب جسے استدلال سے اصولاً کوئی سروکار نہیں وہ بھی آجکل استدلال کا جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ہمارا جمالی میلان بھی زمانہ سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے تقریر کو جمیل بنانے کے لئے زمانہ کے ظرف میں ڈھال کر پیش کرنا چاہیئے۔

تقریر میں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ جس مقصد کو پیش نظر رکھکر ہم تقریر کر رہے ہیں اس سے نہ ہٹیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ جاتا ہو کعبہ کو اور رخ کریں ترکستان کا۔

تقریر کو دقیق بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ جہاں تک ممکن ہو ہر بات سادہ طریقہ پر پیش کی جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سامعین کو ایسا معلوم ہوتا کہ جو کچھ مقرر کہہ رہا ہے سب انہیں کے خیالات ہیں ایسی کو۔ مرزا غالب نے شاعرانہ انداز میں خوب نظاہر کیا ہے ؎

دیکھا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ مقرر و سامعین کے خیالات میں توافق ہو۔

ایک سب سے گہری بات اور بھی کہنی ہے۔ تقریر میں صنعت نہ ہو بلکہ حقیقت ہو۔ آپ تقریر کرتے وقت زائد از ضرورت جوش نہ دکھائیے کہ جو شئے زیادہ زور سے بجتی ہے وہ اکثر اندر سے خالی ہوتی ہے۔ آپ کے الفاظ میں صداقت ہو۔ زبان آپ کے دل کی حقیقی ترجمان ہو تو آپ جو کچھ گھٹلے وہ کانوں کے ذریعہ رس رس کر سامعین کے دل میں اترتا جائیگا۔ اور آپ دیکھ لینگے کہ سارا مجمع آپ کا ہم نوا ہے یہ اور ان کے علاوہ بہت سی شرائط بیان کی جاسکتی ہیں مگر اب میں شرائط سے ہٹکر اثرات کا کچھ ذکر

کروں گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ اظہار مطالب کے دو ذرائع ہیں تقریر اور تحریر۔ اگرچہ دونو موثر ہیں مگر تحریر کے اثرات تقریر کے اثرات سے لگا نہیں کھا سکتے۔ تقریر صرف آنکھوں نہیں بلکہ کانوں کے ذریعہ بھی انسان کے دماغ پر اثر کرتی ہے۔ اور مقرر بے جان کاغذ نہیں بلکہ ایک ذی روح ہستی ہوتا ہے جس کی شخصیت کا بھی اثر پڑتا ہے اب غور کیجئے کہ تقریر کیا ہے؟ الفاظ کا بالترتیب مجموعہ۔ الفاظ کیا ہیں حروف کا مجموعہ۔ حروف میں ظاہرہ کوئی جان نظر نہیں آتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بیجان الفاظ اپنے اندر وہ قوت پنہاں رکھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتی۔ آپ کسی کے ساتھ محبت کی دو باتیں کہہ دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ یہ چند الفاظ اس پر کیا اثر کرتے ہیں۔ آپ کسی مجمع کو گالی دے دیجئے اور دیکھئے کہ صرف بے جان الفاظ کا یہ چھوٹا سا جملہ اُن میں کیا ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک اچھا گانے والا انسان تو انسان جانوروں پر بھی اس طرح چھا جاتا ہے کہ جب تک اس کے راگ زندہ رہتے ہیں تمام سننے والے بے جان بت کی طرح ساکت۔ اسی طرح مقرر انسانی دماغ پر چھا جاتا ہے بشرطیکہ تقریر اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ کی جائے۔ ایک حقیقی اور صداقت سے بھرے ہوئے مقرر میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ وہ مجمع کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔ صداقت بھری آواز کبھی خالی نہیں جاتی۔

پھر یہی نہیں الفاظ کے مافوق الفطرت اثرات بھی بتائے جاتے ہیں مثلاً جادو، عملیات وغیرہ۔ یہ صرف الفاظ ہیں جن کی ایک خاص ترتیب دینے سے ان میں خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ خیال کیجئے کہ جب الفاظ کے ایسے مجموعے کا بالواسطہ یہ اثر ہوتا ہے کہ عامل معمولی کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے تو کیا ایک مناسب تقریر جو براہ راست سامعین کے دل و دماغ پر اثر کرتی ہے ان کو مقرر کی شخصیت کا تابع نہیں بنا سکتی؟ یقیناً بنا سکتی ہے پیغمبر آخر الزماں اپنے پُر جوش اور صداقت سے بھرے ہوئے الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں تو اُن کا جانی دشمن بھی ان کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔

ایک یورپین سیاح اپنا ایک واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بازیگر تماشہ دکھلا رہا تھا۔ سیاح کو صرف یہ معلوم ہوا کہ وہ کھڑا ہوا کچھ باتیں کر رہا ہے۔ مگر

اُس کے ایک ساتھی نے جو اس بازیگر کی زبان سے واقف تھا بہت سے شعبدے دیکھے آخر میں سیاح نے نتیجہ کے طور پر لکھا ہے کہ اُس نے کانوں کے ذریعہ مجمع کے دماغ پر اس قدر قابو حاصل کرلیا تھا کہ جو کچھ وہ کہتا تھا سامعین وہی دیکھتے تھے۔ غرض اسی طرح کی تقریر کے صدہا اثرات بیان کئے جاسکتے ہیں مگر اب میں اثرات کی بحث ختم کرکے یہ بتاؤں گا کہ یہ اثرات کیوں کر پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ دنیا میں ہر شئے کی ایک ابتدا اور اس کی اپنی ایک تکمیل ہے جس کی طرف وہ قدرتاً بڑھتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی اشیاء اپنے سے اعلیٰ ہستیوں کے ذرائع بن جاتی ہیں مگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی تکمیل کا وہی ذریعہ تھا۔ انسان کا ایک نصب العین ہے۔ انسان اس کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے لئے جو جو ذرائع کارآمد ہوتے ہیں کام میں لاتا ہے۔ تقریر چونکہ اسے بام ترقی کی طرف اُڑنے میں مدد دیتی ہے اس لئے وہ اُس سے پوری طرح مستفید ہونا چاہتا ہے اور اس طرح خود تقریر باوجود ایک معمولی سا ذریعہ ہونے کے اپنی تکمیل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ چنانچہ آپ خود دیکھ لیجئے کہ اولاد آدم کے بے ڈول بولوں اور بے تکی آوازوں نے آج کیا صورت اختیار کرلی ہے اور کس طرح ایک فن کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان تو اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھکر حاصل کرتا ہے مگر یہ خود اپنی تکمیل کی طرف بڑھتی جارہی ہے مگر یہ نہ سمجھو کہ تقریر اپنے انتہا درجہ پر پہونچ گئی ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگِ تاک است

ادبی دنیا کو خوشخبری

منشی دُرگا سہائی جہاں آبادی کا کلام موسوم بہ خمکدہ جس میں قریباً بہترین (۱۵۰) صفحات میں نظم و نثر میں صاحب کلام کی تصویر کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ مشتاقین جلدی فرمائیں کیونکہ تھوڑی تعداد ہونے کی وجہ سے کتاب دستیاب نہ ہوسکے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- (۱) مکتبۂ ابراہیمیہ آکٹرائی روڈ حیدرآباد دکن۔
" " (۲) کتب خانہ سید عبدالقادر صاحب تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن۔
" " (۳) قاضی محمد غوث محلہ مغل پورہ عقب احاطہ زبردست خان بہادر حیدرآباد دکن۔

دُھیا سہاگن

(از جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی)

تمہیں یاد ہوں کہ نہ ہو وہ دن — نہ تھا سو لہ سال کا یہ سن — نہیں چین تھا نہیں چین من — تھا فراق میرا بڑا کٹھن
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

مرا بھرتے رہتے تھے دم سدا — تمہیں رات دن مرا دھیان تھا — وہ تمہارے دل میں تھی بیری جا — تمہیں جان سے بھی تھی میں سوا
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

میں جو روٹھتی تھی مناتے تھے — گلے اپنے مجھکو لگاتے تھے — مرے دل کو تم نہ دکھاتے تھے — سبھی ناز میرے اُٹھاتے تھے
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

میں تمہاری آنکھوں کا نور تھی — میں تمہارے دل کا سرور تھی — میں تمہاری نظروں پہ حور تھی — میں تمہاری جان ضرور تھی
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

مرے حسن سے گیا دل جو بھر — کہیں لڑ گئی تو نہیں نظر — سب اس کا تم کہو صاف تر — مری بات سچ یہ نہیں اگر
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

مرے دل سے سکھ مرا جائے گا — میں ہونگی رنج میں مبتلا — نہ رہینگے عیش کے دن سدا — نہ یہ سان تھا، نہ گمان تھا
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

نہ دکھاتے تھے کبھی شوخیاں — نہ مزاج میں تھیں یہ گوریاں — یہ تھی بات بات پہ دھمکیاں — وہ تمہاری کیا ہوئیں نوریاں
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

ہے بلا جو چاہ یہ جانتی — تو نہ دیتی تم کو میں دل کبھی — بلی خاک میں مری زندگی — ہے یہ دلبری کہ ستمگری
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

کروں کیوں نہ آہیں میں بھر بھری — مری جان چوکھوں میں مر گئی — نہیں آس اب مرے جینے کی — مجھے مار ڈالے گی بے رخی
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

کوئی تم سا ہوگا نہ بے وفا — مجھے تم نے دل سے بھلا دیا — یہ بتا دو فخر مجھے ذرا — یہی پھل ہے میری وفاؤں کا
وہ زمانہ چاہ کا کیا ہوا — نہیں مجھ پہ اگلی سی کیوں دیا

بادۂ دکن

میر غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی

(۵ و ۶)

نمبر (۴) میں مہاراجہ چندولال والے قصیدے میں ایک حد تک شبہ پیدا ہو گیا تھا، دیوان میں ایک "رنگین" غزل نکل آئی ہے جس میں صاف "چندو لال راجہ" لکھا ہے۔ غزل کی تقریب "ہولی" کی عید ہو گی، مضامین کی رنگ رلیاں قابل دید ہیں، زمین شعر سے لے کر مطلع آسمان تک بنگارنگی ہی ہے۔

غزل

نہ تنہا جوش گل سے گلشن و گلزار رنگیں ہے — فضائے دشت و دامن کہسار رنگیں ہے
ہوئی ہے رنگ کی اس رنگ طغیانی زمانے میں — کہ سقف بام سے لے تا در و دیوار رنگیں ہے
در و دیوار پر ہی کچھ نہیں موقوف رنگینی — کرے مد نظر اپنی جہاں تک کار رنگیں ہے
عجب راحت فزا ہے دور چندو لال راجہ کا — کہ گھر گھر عیش ہے اور کوچہ و بازار رنگیں ہے
کروں کس رنگ سے تعریف بزم خاص کی اس کی — کہ جوں گلزار سب دربار کا دربار رنگیں ہے
ہوا ہی رنگ سے یہ رنگ اب شیخ و برہمن کا — کہ تار سبحہ سے تا رشتۂ زنار رنگیں ہے
خم و خمخانہ گیں، شیشہ رنگیں، بادہ گلرنگ رنگیں — سئے گلرنگ رنگیں۔ ساغر سرشار رنگیں ہے
سخن کے شور رنگیں کا اثر یہ ہے کہ مطرب کا — وہاں رنگیں، زباں رنگیں، گلوگفتار رنگیں ہے

بھرا ہے رنگ سے تا لحوں نے مضمون و معانی میں
زمین شعر رنگیں، صفحۂ اشعار رنگیں ہے

بادۂ دکن کے اس نمبر میں سخن کی سخن سنجیوں کا یہ آخری دور ہے۔ ان کا دیوان کتبخانہ آصفیہ (۱۸۰) میں ہے۔ تقطیع (رائل) ایک سو تراسوے اوراق (ناتمام) چودہ سطری مسطر، خط صاف نستعلیق شکستہ کاغذ دیسی ابتدا میں (۵۸) صفحات پر قصائد، حمد، نعت، منقبت، مدح امرا، وغیرہ ——— (۵۹) ورق سے (۱۵۳) تک

ردیف وار غزلیات، (۱۵۴) سے رباعیات، تاریخات، مخمسات ـــــ دیوان کی ابتدا قصاید ہیں بعض اوراق کے کونے ترش گئے ہیں جن کی وجہ سے اکثر آدھے آدھے مصرعے ناقابل قرأت ہیں۔ پہلے صفحے پر "دیوان غلام مصطفیٰ سخن باشندۂ حیدرآباد" لکھا ہے۔

الف:- قصائد کی تفصیل

(۱) قصیدہ در منقبت حضرت علیؓ - (۷۰ شعر)

(انتخاب)

کیا کرے تحریر کوئی شوکت و شان علیؓ ـــــ شرق سے لے غرب تک جاری ہے فرمان علیؓ
بندۂ احسان ہیں با شندگان شش جہت ـــــ عام ہے عالم میں کیا فیض مزار ولیٔ علی
وصف قرب و منزلت کی ریز باں قابل نہیں ـــــ ہے حدیث "لحمک لحمی" ہی ثنا خوان علی
کس کا منہ ہے اے سخن! جو مدح ایسے کی کرے ـــــ اولیا تا انبیا سب ہیں ثنا خوان علی

(۲) (۶۷ شعر)

مقدار اے فرمایہ نہ ہو ارباب جوہر کا ـــــ کہ ہے محسود شعر تر ہمارا گوہر تر کا
نوشت معنیٔ باریک ممکن ہی نہو جب تک ـــــ رگ اندیشۂ نازک خیال تار سطر کا
عبارت میں لطافت ہے معانی میں صفا ایسی ـــــ کہ جس کے رو برو دُردی کرے ہے صاف کو شرکا
اثر معنی سے یوں پیدا معانی یوں عبارت سے ـــــ فرح جیوں نشأۂ شیشہ سے جلوہ آتش کا
اثر پیدا ہی کرتا ہے سخن منہ سے جہاں نکلا ـــــ عرض کا عرض کرنا جوہر ذاتی ہے جوہر کا
نگارستان معنی وہ تسلی بخش ہے شاید ـــــ زلیخا بھول ہی جاوے مزا کاخ صقر کا
لکھوں وہ مطلع ثانی کہ دل سنتے ہی روشن ہو ـــــ زحل کردہ پیدا ہو اگر خورشید انور کا

بجا ہے گر سخن عازم ہو فتح ہفت کشور کا
کہ جوش معنی و مضمون رکھے ہے حکم لشکر کا

جہاں گیری کرے نظم سخن یوں کر نہ اب کہیے ـــــ کہ ہو تاج کس شاہنشہ خورشید فر کا
ہنر ہر پیشۂ یزداں کفیل کار دانش جاں ـــــ کہ جس کو ہم اخی وہم صفی کہیے پیمبر کا
سمیٔ خالق اکبر جہاں بان جہاں پرور ـــــ ہمہ لطف و کرم گستر، دو سیدہ روز محشر کا
بہار گلشن عرفاں چراغ خانۂ ایماں ـــــ ضیائے دیدۂ ایقاں پدر شبیر و شبر کا
ہمہ دانش، ہمہ بینش، ہمہ عقل و ہمہ فطرت ـــــ کہ اُستاد ادب آموز ہی ناموس اکبر کا

نہ ہے عدل و زہے انصاف ایام بہاراں میں — لہو اک قطرہ کم ہوئے اگر مجنوں برضطر کا
موافق امر عالی کے یقیں ہے ہر کہ گلشن میں — رگِ گل سے کرے مژگانِ بلبل کام نشتر کا
دعا پر ختم کر بس اے سخن! یہ کون باتیں ہیں — رہے پیاس اور تر نظر ساقی کوثر کا

موافق کو جہتیا ہو مے حب علی خم خم
مخالف کو میسر چشمہ چشمہ آب خنجر کا

ب:-

قصیدۂ شادی کیوان جاہ :- (۵۲ شعر)

ہے ترے لطف عام سے برخاہ — اک جہاں اے جہانیاں کی پناہ
سر فدم کر کے اپنا آتے ہیں — در کو تیرے سمجھ کے باب اللہ
نقش پا کا نشاں نہیں پاتا — در پہ تیرے سوائے نقش جباہ

گر صدا پر، پرند کی شب بد — تیر پھینکے تو اے ارسطو جاہ
ڈر سے پیکان تیر کے تیرے — یہ کبود فلک خدا آگاہ
متردد ہوا اس قدر کہ وہیں — چنگ سے چھوٹ جائے بیضۂ ماہ
رشک سے صدجشن کیقبادی ہے — شادیٔ دل کشائے کیواں جاہ
شادیانوں کا شور ماہی سے — دفعتہً ہی پہنچ گیا تا ماہ

ساز عشرت سوائے عالم کو — ہے صدائے دگر صدائے چاہ
دیکھ وہ روشنی وہ مہندی ہے — ہے یقیں یہ ہی بس بلا اشباہ
ورق نقرہ و طلا سے ہیں — خوان مہندی کے رشک مہر و ماہ

بر اتا کا وہ رقص مہر افزا — وہ ادائیں فسوں معاذ اللہ
وہ گتیں دل فریب وہ ٹھوکر — وہ تغافل وہ عاشقانہ نگاہ
ایک، سو شاعران سحر بیاں — قطعۂ تہنیت لیے ہمراہ
اُمرا بہر نذر ایک طرف — ایک سو صف بصف ستادہ سپاہ

اے سخن! یہاں سے لکھ دعائیہ — کر یہ طول کلام کو، کوتاہ
یا الٰہی بحرمت احمد — اور بحق علی ولی اللہ
دوست اس کے ہمیشہ شاد رہیں — اور دشمن رہیں بحال تباہ

ج :-

در مدح عالی جاہ (احمد علی خاں) (۱۱ شعر)

ترے بحر کرم سے بہرہ ور گر ابر نیساں ہو — صدف تو کیا کہ ہر خوشہ میں پیدا دُر غلطاں ہو
نشاں خلق و آثار کرم باطن سے ظاہر ہیں — ترا اسم مبارک کیوں نہ پھر احمد علی خاں ہو
عجب کیا اس شجاعت پر اگر تیرے تصرف میں — دکن سے ہند تک اور زہ بہ تے تا صفاہاں ہو
بحق ہشت و چہار و ہر چہ دہ معصوم دینا میں — خوشی ہو، خرمی ہو، تو ہو اور عیش فراواں ہو
موافق سے ترے یارب زمانہ بھی موافق ہو
مخالف سے مخالف گردش گردون گرداں ہو

د :-

قصاید مدحیہ اعظم الامرا، ارسطو جاہ۔

(۱) (۳۷ شعر)

کیا کہوں آپ ہے رنگ گل لالہ کی مثل — آتش طور بھڑکتی ہے بہر دشت و جبل
رنگ ہے رنگ چمن پر کہ تماشہ کے لئے — شاہد نکہت گل آئے ہے پردہ سے نکل
قوت نامیہ یہ اور رہے عہد ایسے کا — بار و رکیوں نہ خلائق کا ہو پھر نخل امل
یعنی نواب فلک قدر امیر اعظم — جس کی ہمت کا جہاں میں ہے کچھ قدر و محل
غائبانہ سخن ابلہ طرازی تا کے؟ — روبرو اس کے تو یہ مطلع روشن لے چل
ہو سکے کیوں کہ مفصل تری وصف مجمل
افضل الناس تجھے کہتے ہیں افضل افضل

(۲) (۸۷ شعر)

سرور و عیش کا گھر گھر ہے ان دنوں چرچا — ہزار رنگ . . . . . .
کہ جس کا اسم مبارک ہے اب شیر الملک — کہاں زبان کو ایسے کی مدح کا یارا
خیال خام نے لایا کدھر معاذ اللہ! — کہاں میں ہیچ مداں اور وہ اعظم الامرا
وزیر شاہ دکن طرح سلطنت تیرا
کرم سرشت ازل صنع نوال و سخا

(۳) (۴۸ شعر)

اے سزاوار علم و فضل و کمال — جاں دہ معنیٔ خیال و مثال
کیوں نہ کہتے تجھے ارسطو جاہ — اے سزاوار مسند اجلال
چاہتا ہوں میں اس قصیدہ کا — یہ صلہ تجھ سے اے فلک اجلال
عزت و خلعت گراں قیمت — اور سواری کو اسپ برق مثال
اس میں پھر جو تری ہو مرضیٔ خاص — یہ بھی لازم نہیں ہے قابل مقال

دوست تیرے ہمیشہ شاد رہیں
اور دشمن سدا رہیں پامال

(۴) (۶۷ شعر)

زیر عرش اے پیشوا جان سخن — ہے نہاں گنج شائگان سخن
اے سخن! تا بہ کے غزل گوئی؟ — تا کجا شرح این و آن سخن
مدح اس کی ہے فرض عین تجھے — ہے جو ممدوح صاحبان سخن
مدح غائب بھی گرچہ دل کش ہے — پر بھلا کب تک اے زبان سخن
باریاب حضور ہو یہاں سے — نذر لے کر تو ارمغان سخن

اے مددگار و مستعان سخن
کارفرما و کامران . . . سخن

ہے بعید از ادب تجھے کہتے — گر ارسطو سے نکتہ دان سخن
اب صلہ میں سخن قصیدہ کے — چاہتا ہے اے قدردان سخن
ایک تو یہ کہ . . . . . عزت ہو — اے خداوند مہربان سخن
دوسرا یہ کہ یہ قصیدہ بھی — ہو ملقب بہ "استان سخن"
تا رہے شعر و شاعری قائم — تا زباں زد رہے بیان سخن

یا الٰہی رہے بہ جنبش و طرب
ذات ممدوح صاحبان سخن

ھ :- قصیدۂ مدحیہ بجناب سیف الملک[1] (۲۰ شعر)

منبع احسان ہے تیری ذات والا جناب — آستاں بوسی سے ہوتا ہے ترا عالم کامیاب

---

[1] نواب سیف الملک حافظ محمد یوسف خاں بہادر ریاست ٹونک کے مدار المہام تھے ۱۲

کیوں نکٹ جاوے حدود سنتے ہی تیرے نام کو مشتہر نواب سیف الملک ہے تیرا خطاب
چاہتا ہے تجھ سے اتنا ہی سخن آے ذوالکرام مشتہر رہوے ترے بندوں میں ہمراہ کلب
جب تلک گردوں رہے پادار ہر میدان میں
پختن رکھیں تجھے فیروزمند و فتح یاب

۹:- بمدح نواب شاہ یار الملک۔ (۴۸ شعر)

تر و تازہ ہے اس قدر گلشن ہے بہار ارم چمن بہ چمن
یعنی نواب شاہ یار الملک واقف رمزہائے ہر یک فن۔
جب تلک نور و نار تو ام ہیں اور جمال و جلال جلوہ فگن
نور میں غرق ہوں ترے مخلص
غرق ظلمت رہیں ترے دشمن

۱۰۔ قصیدہ :- (۵۰ شعر)

(۱) کفِ گل زر سے بھر دیا تو نے دُر سے مشتِ صدف کیا حلو
لطف تیرا ہے بس کہ جاں پرور اور اخلاق و حلم ہے دل جو
یہ تیرا عدل ہے کہ رکھتے ہیں آشتی یک دگر سگ و آہو
زلفِ معشوق ہے تری تحریر اور تقریر ہے بہ از جادو
کیوں نہ کہیئے تجھے نظام الدین باعث انتظام دیں ہے تو
عہد میں تیرے فیض سے اب تو چور بھی ہے برائے خود ساہو
یہی شاعر خیال کرتا ہے ہے یہ بے شک زمیں کا خال رو
اور کیا تجھ سے اے سخن پرور! چاہیئے اس قصیدہ کا جلدو
بس ہے مداح کو یہی تیرے عزت روزگار و آب رو
جائے زر کے بٹے یہ ہاتھوں سے
لعل خوش آب و دانۂ لولو

(۲) قصیدہ :- (۶۰ شعر)

کس قدر ہے غرور پر خود بیں اُف رے ناز و اَف رے تمکیں
دیکھتا ہی نہیں سوائے فلک سرکشی سے کبھی بروئے زمیں

نہ لعل ؟

نمک زخم دل ہے عاشق کا نازنیں کا تبسم نمکیں
ظالم ایسا کہ خون دل کے سوا نہ کرے دست و پا کبھو رنگیں
الغرض اُس کے ظلم سے نالاں کوئی ایسا بشر نہیں کہ نہیں
ہاں! مگر ایک ہے سخن محفوظ کہ ہے اُس کا ممدوح عدل گریں
ظلم ہوتے سُنا نہیں ہم نے عہد میں جس کے آج تک تو کہیں
خلف الصدق مرتضیٰ ہے وہ کہ ریاضت سے ہیں نمود آئیں
روحۂ گلشن علیؑ ہے گا باغ احمد کا ہے گل رنگیں
اے سخن! چل حضور میں یہاں سے مدح غائب سرور بخش نہیں
کیوں نہ شاغل ہو تو مدام کہے مستفید جناب فخر الدیں
ہے وہ بے شک فرید گنج شکر اور تو بالیقین نظام الدیں
فکر روزی سے دور میں تیرے نہیں آتا نظر کوئی غمگیں
پالکی میں سوار دیکھ تجھے یہی ہوتا ہے بے گمان یقیں
یعنی محراب میں برائے دعا ظاہر اہے امام صدر نشیں
یا الٰہی یہ دولت و اقبال رہے پادار تا قیام زمیں
اور تجھے یہ ثواب سنّی روزہ دین و دنیا میں ہو تمدد سعیں
جشن عید سعید بابرکات سیمنت ہو بحرمت یٰسیں

چاہیے حاضران مجلس بھی
دل سے اک بار سب کہیں آمیں

(۳) قصیدہ :- (۲۵ شعر)

عجز سے بس کہ سرفرو ہے قلم کیا کرے مدح اہلِ حال رقم
کیوں کہ ایسے کا ہو ثنا گستر جو پیمبر کے ہو قدم بقدم
نام نامی زبان پر . . . لانا بے وضو کے نہیں گناہ سے کم
شاہ درویش[۱] قادری یعنی ہے بلاریب ہم سر اد ہم

۱۔ ابن شاہ ولی اللہ، حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی اولاد سے ہیں، کیمیا اور علم تصوف اپنے والد ہی سے حاصل کیا۔ زہد و تقویٰ میں مشہور ہمیشہ گوشۂ تنہائی میں رہتے، صرف بایں عصر و مغرب ملاقات میں آتے اور حاجت مند بہرہ یاب ہوتے، تصوف کے کئی رسائل و کئی مجموعے لکھے ہیں، آخر جمادی الاول ۱۱۲۵ھ میں وصال ہوا۔ بوہری گلی (حیدرآباد) کے متصل آسودۂ خاک ہیں۔ فون نمبر ۲۱۰۱۱

فی الحقیقت ہے مرتبہ اس کا — شبلیؒ و بایزیدؒ سے تو ام
حاصل اس گفت گو سے ہے یہ مجھے — ایک پنت اور کاج دو باہم
چاہتا ہوں کہ مدح رہبر میں — صفت راہ رو بھی ہو مے ضم
راہ رو سے مراد ہے مجھ کو — ذات تہنیت النسا بیگم
ہے وہ مخدومہ رابعہ ثانی — اور ہے ہم فضیلت مریم
پاس عصمت ہے اس قدر اس کو — اپنے سایہ سے بھی کرے ہے رم
آئینے سے بھی احتراز کرے — تا نہو چشم عکس بھی محرم
زوجۂ خاص رستم دوراں — زال ہے جس کے روبرو رستم
عمر اس کی ہزار سالہ ہو — اور زائل ہو اس سے درد و الم

فارغ البال اس کے دوست رہیں
اور دشمن ہوں مبتلائے غم

متفرق

الف :-

زہے جناب عجب کیا ہے مدح میں اسکی — زبان ناطقہ ہوئے برنگ لال گرہ
برائے قطعۂ دلچسپ و مصرع تاریخ — ہوا مزاج یہ جس دم مرا بخیال گرہ

کہا پکار کے دل نے بجان و دل "وہیں"
"ہزار سال مبارک رہے یہ سال گرہ" ۱۲۰۹ھ

ب :-

نوید دل کش جشن فرح بخش — ہوئی جب سامعہ افروز عالم
سخن تو بھی برائے نذر نواب — رقم کر قطعۂ دلچسپ و محکم
نشاط افزا ہوا ایسی ہی عبارت — کہ تا ممدوح ہو دل شاد و خرم

لکھا سنتے ہی سال فرحت افزا
خدایا جشن بسم اللہ جسیم جم ۱۲۲۲

ج :- نامہ منظوم :- (۶۵ شعر)

ے حضرت آصف و آنالی غفران مآب۔

اے بادِ بہار برق رفتار — اے ہمدمِ عاشقِ دل افگار
اے نامہ برِ نیاز منداں — اے حاملِ خطِ مستنداں

گلرو کو میرا سلام کہنا — اور اتنا ہی بس پیام کہنا
جس روز سے تو صنم جدا ہے — شاہد احوال کا خدا ہے
بھاتا ہی نہیں پلنگ مجھ کو — شیشہ بھی ہوا ہے سنگ مجھ کو
وہ نیند میں آہ مار اُٹھنا — لے نام ترا پکار اُٹھنا
ہم سایہ کو خواب سے جگانا — افسانۂ درد و غم سُنانا
نالوں ہی سے اپنے کام لینا — سونا نہ کسی کو سونے دینا
پڑھنا کوئی شعر یا کرخالی — تا دل ہو کسی طرح سے خالی
تس پر یہ ستم بہار آئی — بلبل کی غضب پکار آئی
صحرا بھی چمن سے کم نہیں ہے — پر حیف کہ تو بہم نہیں ہے
گل نظروں میں خار سا لگے ہے — بلبل کی صدا پہ دل جلے ہے
کوئل کی صدا بھی بے نمک ہے — کانوں میں تو اپنے دھنک ہے
نہروں کی روانی دیکھ جانی — ہو جائے ہے دل تو پانی پانی
گلزار ہو یا بہار ہوئے — اور سیر ہو شکار ہوئے
مائل ہی نہیں کسو طرف دل — اپنے ہی سے کچھ ہوا ہی غافل
اللہ وہ دن کرے شتابی — ہو وصل سے تیرے کامیابی
دوری کے یہ دن شتاب جاویں — وہ راتیں وصال کی پھر آویں
پھر سات ترے مزے اُٹھاویں — بدخواہ رقیب کو جلاویں
یہاں قصۂ سخن تمام ہے گا — پیغام بھی اختتام ہے گا

کان اُس کے ذرا تو کھول دینا
یاروں کا سلام بول دینا

۵:- مثنوی زمستاں (۹۳ شعر)

پلا اے ساقی خورشید منظر — مئے دو آتشہ وہ چار ساغر
کہ تا اک جوش میں گرمی بہم ہو — گزند شدت سرما تو کم ہو

کہ از بس گرم ہے بازار سرما ۔۔۔ بزودت ہے متاع بارسرما
ہوا سے جل گیا رنگ زن و مرد ۔۔۔ برستی ہے فلک سے آتش سرد
زمستاں نے اثر ایسا کیا ہے ۔۔۔ کہ موج آب، آب بوریا ہے
ہمیں تو زندگی دشوار سی ہے ۔۔۔ اگر خوش ہے تو قوم پارسی ہے
اگر پیتے ہوئے ٹک ہاتھ تھم جائے ۔۔۔ پیے دو آتشہ کا جام جم جائے
ہوا گلشن کا ہر حوض مدور ۔۔۔ ہوا سے جم کے رشک ماہ انور
غبار شبنم و مہیج زمستاں ۔۔۔ سراپا نور ہے اور نور افشاں
برستی ہے نم شب ریزہ ریزہ ۔۔۔ ذخیرہ برف کا ہے نیزہ نیزہ
موذن کو کہاں یارا تقریر ۔۔۔ کہ ثابت سُنہ سے نکلے لفظ تکبیر
مصلی دست و پا کب دھو سکے ہے ۔۔۔ تیمم ہو سکے تو ہو سکے ہے
کبابی چاہتا ہے غم سے رو دے ۔۔۔ بجائے تکا اپنے تیئں پرو دے
حقیقت طرفہ بھڑ بونجے کی سُنیے ۔۔۔ نخود کی جائے خود چاہے ہی بھُنیے
عجب کیا ہے کہ ہے قدرت خدا کی ۔۔۔ بندھے موٹھ اس ہوا میں ۔۔۔ ہما کی
سغتی گرچہ خود آتش نفس ہے ۔۔۔ غرض اس پر بھی دیپک کی ہوس ہے
قیامت ہے برودت فصل دی میں ۔۔۔ دم نائی گرہ ہوتا ہے نے میں
عجب احوال ہے سرما سے تن کا ۔۔۔ لہو بھی خشک ہے نہر البدن کا
طبیب اس فصل میں جز قرص خورشید ۔۔۔ علاج تپ نہیں کرتے بہ تبرید
بیاں کرتے ہیں از بس نفع گرمی ۔۔۔ کہ ہے گرمی سے اولیٰ دفع گرمی
وبال جان عاشق چشم نم ہے ۔۔۔ کہ ٹھنڈی سانس لینا بھی ستم ہے
پلا ساقی مے گل گوں دوسالہ ۔۔۔ کہ ہے اس فصل میں یہ ازدوشالہ
مزا کچھ ہے تو نوشا نوش میں ہے ۔۔۔ کہ اک خورشید رو آغوش میں ہے
شکایت تا کجا کریے ہوا کی ۔۔۔ گذر ہی جائے ہے ہر بے نوا کی
بحمداللہ کہ عشق آتش نسب ہے ۔۔۔ شرار آہ گرمی کا سبب ہے
وگرنہ زندگی دشوار ہوتی ۔۔۔ ہوا وہ ہے جگر سے پار ہوتی
سخن خاموش ہو جا اور نہ کچھ کہہ ۔۔۔ صنم سے اپنی آنکھیں سینکتا رہ

کہ یہ افسانہ ازبس سرتر ہے
نسیم گفتگو سے دردسر ہے

فارسی

(۱) مثنوی عاشقانہ۔ (۲) قطعہ چشمک و قطعہ دیگر تاریخی (۳) قصیدہ بتقریب قصر وزیر دکن

بنیادش از فلک بجہاں استوار باد — قصر وزیر شاہ زمن پائدار باد
ہر مصرعم دلیل بود بر طراز سال — روشن بہ ماہ راج مسیحا دقار باد

قطعات و رُباعیات

(۱)

تا رفت ز چشم خویش ظل الٰہم چو نی زنگاہ — شد تیرہ جہان دیدہ چو ما ہم۔ در حال پناہ
کردم چو سوال سال وصلش ہاتف غیبی زدہ سن — یارب بجناں بود فریدون جا ہم۔ باعزت و جاہ
۱۲۲۵

(۲)

استاد شفیق[1] من افسوس — از بہر سرائے فانی رفت
روئے دل از کسے نمی بینم — مایۂ لطف و مہربانی رفت
از حلاوت گذشت نظم و نثر — نمک از شعر و شعر خوانی رفت
از جہاں برفتاد قدر کمال — عالم علم نکتہ دانی رفت
سال رحلت رقم نمود سخن
وائے مشاطۂ معانی رفت
۱۲۲۳

(۳)

شد روپوش چو نامدار صاحب[2] — پروردۂ دولت کنار صاحب
اندوہ بہوئے درد گفتم سالش
صد حیف کہ رفت یادگار صاحب
۱۲۲۲

(۴)

---

[1] بھی نزائن شفق و صاحب تخلص اورنگ آبادی جن کے لئے مجلۂ مکتبہ جلد (۲) نمبر (۱ تا ۶) دیکھیے ان کا ایک تذکرہ پنجستان شعرا انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کی جانب سے طبع ہو چکا ہے جس میں وفات کا ذکر ہی نہیں ہے ۱۲ منقل؛

شاعر خوش خیال منشا لال — از پئے سرا چو گشت رواں
سال فوتش رقم نمود سخن — آہ اُستاد زادہ رفت جواں
۱۲۱۹ھ

(۵)

بست تاریخ سفر زیں مرحلہ — والداں صاحب فہم سلیم
زور رقم سال وصال او سخن — آہ بے دریا شدہ دُرِ یتیم
۱۲۰۹ھ

(۶)

ہائے مانک چند حسب الحکم رفت — وائے مانک چند حسب الحکم رفت
چوں بیارد دیدہ ام خوں از جہاں — رائے مانک چند حسب الحکم رفت

(۷)

شد ز دنیائے دوں وحید الدین — آں سوئے آسمانِ ہفت طبق
گفت سال وصال او سالک — گشت مرد وحید عینِ حق
۱۲۳۰ھ

صد شکر کہ با ہزار لطف دل جو — سرگرم نشاط ہے وزیر خوش خو
اے مست مئے طرب! اِدھر ہو لا نذر — رکھتا ہے بسنت کی خبر بھی کچھ تو

(۲)

اے بانی دولت کمال اکبر — رونق افزائے ملک و مال اکبر
حقا کہ جمال عالم آرا تیرا — ہے مظہر جلوۂ جلال اکبر

(۳)

جب تک کہ رہے فلک کی قایم بنیاد — اور اہل زمیں رہیں زمیں پر آباد
باایں ہمہ ملک و مال و جاہ و اجلال — مشغول رہے بعیش بالا پہ شاد

(۴)

اللہ! یہ کس قدر ہے جاہل گم راہ — عارف پہ کرے ہے تہمت کفر پناہ
یہ عقل یہ امتیاز کفر و اسلام — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

(۵)

لہ۔ ممکن ہے کہ یہ تاریخ وفات صاحب کے والد کے متعلق ہو ۱۲۰۹ھ فالتماس ربط دیکھو گلزار آصفیہ ص۵۲

بڑھ بڑھ کے سخن ہاں اس قدر بھی بولو — خاموش رہو نہ عیب اپنے کھولو
پھر رکھیے کسو کی آدمیت پر حرف — پہلے تم آپ آدمی تو ہو لو

(۶)

محسن کی کبھو نہ مدح و توصیف کریں — مفسد کی ہمیشہ دل کی تالیف کریں
ایسے تو دنی ہیں گردنی کے گھر سے — گر بھر بھی گزی ملے تو تعریف کریں

(۷)

بس کہ آفاق میں ہے شور سخن کا میرے — آج پھر لوں ہے ہم زور سخن کا میرے
دست بستہ نہ ملے مجھ سے عدو پھر کیونکر؟ — اوّلِ روز سے ہے چور سخن کا میرے

(۸)

کمال بے حیائی کو کفیل کار سمجھا ہے — یہ نافہموں نے استغنا کو استکبار سمجھا ہے
نصیحت گر عبث تشنیع کرتا ہے کہ عاشق کی — ملامت کو تو عینِ گرمیٔ بازار سمجھا ہے

(۹)

دود جگر کو شعلۂ شفاف شرط ہے — زلفِ سیہ کو تابش مو باف شرط ہے
کرتے ہو اس قدر جو طرف داری رقیب — یارو خدا کے واسطے انصاف شرط ہے

(۱۰)

جس دم کہ ہوا نہال قامت برپا — عاشق پہ ہوئی ہزار آفت برپا
واللہ کہ انتظار محشر نہ رہا — قامت نے ترے کی ہے قیامت برپا

(۱۱)

وہ تم نہیں رہے وہ محبت نہیں رہی — القصہ تم سے چشم مروت نہیں رہی
پوچھو تو اب گھمنڈ ہے کس بات پر نہیں؟ — صورت بھی ایک تھی سو وہ صورت نہیں رہی

(۱۲)

واہ رے عہدِ جوانی کچھ عجب ایام تھے — وہ جوانی عالم سے رم کرتے تھے ہم سے رام تھے
صید محبوباں نہ تھا با وصف منظور نظر — پر اک استغنا فیاضی مت تھا کہ لاکھوں دام تھے

(۱۳)

ناصح کا اثر کیا کہنا مجھ کو — مرغوب رہا ستم کا سہنا مجھ کو

اُمید وفا سے سب سے ہل دل دیکھا آخر نہ ہوا کسو سے لہنا مجھ کو

قصائد وغیرہ کی تفصیل میں وہ قصائد وغیرہ داخل نہیں ہیں جو اُس کے قبل نمونہ کے طور پر انتخاب میں آگئے ہیں۔

قصاید کے دیباچہ سے ممکن ہے کہ یہ رائے قائم کی جائے کہ سخن ایک مدح گو شاعر تھے لیکن وہ خود آداب مدح کے متعلق کہتے ہیں ؎

نسبت اہم ہے خادم و مخدوم میں سخن ممدوح ہو غیور تو مداح کیوں نہ ہو؟

رنگ تغزل اور اس کے ادائے اسلوب کی نسبت اُن کے یہ خیالات پیش نظر رکھیے:۔

سودا بھلا بتا کہ کسی کو بھی یاد ہیں آتے ہیں جو کہ بندش مضمون بھی تجھے

مگر تقلید سودا ہم سے پوری ہو نہیں سکتی جبھی تو آپ فرماتے ہیں ایسا یوں نہیں یوں ہے

بھلا ہم تم غزل کہکر سخن فہموں کو دکھلائیں کہیں تا داد گر ترکیب مرزا یوں نہیں یوں ہے

مضمون کی ہو سب سے بیگانہ وہ اپنا ہے طالب نہیں ہم اُس کے مطلب جو سب کا ہو

سرمشق گر نہ ہوتا وہ برق خرمن صبر شعر سخن میں ہرگز پرچستگی نہ ہوتی

گوئے مضمون و معانی لے گئے میر و سوز وہ جو تھے چالاک ترفن سخن میں ہاتھ کے

مطبوع ہے سخن کا سخن ہر زمین میں گر صاف ہی تو صاف ہی ورنہ خیال ہے

سخن کمال تو یہ ہے کہ غیر مدح کریں وگرنہ عیب ہنر در کو خود ستائی ہے

کہوں گر بلبل باغ دکن ہوں بجا ہے۔ خود ستائی کون سی ہے؟

پوچھیے اُس سے اگر صافی تقریر سخن حضرت درد کا دیوان اُٹھا لیتا ہے۔

اے سخن! اکمل ز ظلمت جان زا و طبع کو گر وہ ہے لخت جگر نور بصیر یہ بھی تو ہے

سخن عروض کی تکرار سے گر خاموش سبب کہاں کا۔ کدھر کا ذکر نکالا ہے

"نے" کا استعمال اکثر قدیم طرز پر کیا گیا ہے۔ بعض مثالیں دیکھیے:۔

عشق میں ان مہوشوں کے ہاتھ ہم نے دھو چکا نام ہے ناموس سے صبر و خرد سے ننگ سے

پھر تو الہ باد بھی قبضہ میں آ چکا وقت ہے کہ ہم نے قلعہ احمد نگر لیے

رہے پہچاننے سے اب تو صورت آشنا اپنے محبت نے نہیں کچھ ناتواں و زار ایسی کی

واہ کچھ اور طرح یہ بھی نکالتے ہم نے یوں ہی بدنام کیے دیکھے نہ بھالے تم نے

سخن کی عام شاعری اور اُن کے انتخاب سخن کے متعلق پہلے نمبر میں نوٹ آگیا ہے۔ مجھے دکھنی شاعروں کے مطالعہ میں اب تک، شیر محمد خاں ایمان کے بعد یہی شاعر، شاعری کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ اگرچہ کہ سخن شفیق اورنگ آبادی کے شاگرد ہیں لیکن صرف شاعری کی حد تک سخن کو "باز اُستاد" کہا جائے تو خلاف واقعہ نہیں، میں نے شفیق کی شاعری کا بھی مطالعہ کیا ہے اور قارئین "مجلۂ مکتبہ" کی نظر سے بھی شفیق کا کلام گزرا ہے۔ رنگ تغزل میں مجھے ان کا صرف ایک شعر یاد رہ سکا ہے ؎

جان! وعدہ پہ تم تو آؤ گے۔ پر مجھے تاب انتظار کہاں

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو شفیق کے اور اچھے شعر بھی یاد ہوں، میں اپنے مذاق پر قارئین کو مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف سخن کے انتخاب سخن کو سخن گستر انہ پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ انتخاب سخن کی نسبت میرے خیال میں جو خیالات مکرر آرہے تھے وہ خود مصنف کی زبان سے سن لیجئے ؎

منتخب ہیں ترے اشعار سخن کیا چنیے جی میں آتا ہے کہ لکھ سارے کے سارے کھیے

(عمر یافعی)

انتخاب کلام

ق

۱ گہے دین آگاہ دنیا چاہتا ہے دل خود کام کیا کیا چاہتا ہے

۵ جسے دل چاہتا ہو دل نشیں ہے دل دیوانہ پھر کیا چاہتا ہے

۲ گہے ناں، گاہ حلوہ چاہتا ہے یہ کافر نفس کیا کیا چاہتا ہے

۳ غذا بہتر سے بہتر ڈھونڈھتا ہے لباس اچھے سے اچھا چاہتا ہے

۴ بہت کچھ چاہتا ہے یہ تو لیکن خدا جانے خدا کیا چاہتا ہے

نفس سینہ میں مارا پھر رہا ہے کسی میں جی ہمارا پھر رہا ہے

کسو کی خاک پھانکا چاہتا ہے فلک جو منہ پسارا پھر رہا ہے

باین بشت خمیدہ دیکھیے نا فلک کیا بے سہارا پھر رہا ہے

تکلف بر طرف اس عصر کے حاتم ہی کہلاتے
سوا فق اپنی ہمت کے خدا دیتا تو دکھلاتے

فقط اک دل میں تیر ہی اثر کرتی نہیں ظالم
وگرنہ وجد عالم کو مری نالوں پہ ہوتا ہے

رخِ زرد اپنا دیکھے۔ دیکھ نقشِ ناخنِ غم کو
کہ زر ہی دیکھتے ہیں دیکھ کر ماہ محرم کو

نظر بر مصلحت چندے تو رفعِ بدگمانی کر
مجھے اپنا نہ جان اے جان! بیگانہ سمجھ مجھ کو

ہم میں برے سراپا! ہاتم نرے برے ہو
بولو نا سب طرح سے تم بھی بھرے پرے ہو

خالی کرو نا دل کو غم سے بھرے ہوئے ہو
ہم بھی مرے ہوئے ہیں تم بھی مرے ہوئے ہو

انسان محوِ صنعِ بے چون ہو تو کیا ہو
حیران کارگاہِ گردوں نہ ہو تو کیا ہو

دیکھا نا تم نے ان کے ناز و ادا۔ بھلا پھر
دل ان پری رخوں کا مفتوں نہ ہو تو کیا ہو

ظاہر میں سخن (سے) وہ دل کھول کے ملتا ہے؟
آغوش تصور میں آوے ہے جو رنجیدہ

ہوا قاصد کا کیا اس میں بھلا کچھ
سنا کچھ ہم سے اور اس سے کہا کچھ

کہا اک دن کسی ہمدم سے اس نے ق
"سخن کا حال بھی تم نے سنا کچھ؟"

کہا "کیوں غیر ہے؟" سنتے ہی اس نے ۲
"سنوں میں بھی تو اس کا ماجرا کچھ"

کہا یہ "اک پری پیکر پہ غش تھا ۳
بقدر حال تھا وہ بھی فدا کچھ۔

کئی دن ہو گئے ہیں گے کہ ہاہم
شکر رنجی ہوئی ہے ظاہرا کچھ؟

آ! چھوڑ دے اے خود بیں! کاشانہ دو آئینہ
دل وہ ہے جسے کہیے ہم خانہ دو آئینہ

فتنوں انداز سے گر ہو۔ ریاں ہیچ خندہ و گریہ
کہ رنج و آفتِ چشم و دہاں ہے خندہ و گریہ

آفرینش اثر رائے صواب فاختہ
مصرعِ سرو بہی ہے انتخاب فاختہ

رشکِ الفت سخت جاں فرسا ہے۔ دیکھا آپنے
پیچ و تاب قمری و بیم اضطراب فاختہ

فاختہ بہی سوختہ قمری کے ہاتھ آئیں
قمری دل باختہ بھی ہے کباب فاختہ

ظرف اور مظروف کی نسبت ضروری ہے سخن
کاش کے ہو سرو مینائے شراب فاختہ

اس پریشاں نظری سے تری ڈرتا ہوں دل
دل مبادا ہدفِ تیرِ ہوائی ہو جائے

بارے کیا لطف ہے پھر کہنے کا ایسے پیارے!
مُنہ سے نکلی ادھر اور بات پرائی ہو جائے

یوں آپ ہی تو مجھ کو نہ چاہے تو نہ چاہے
حاضر ہے عرض بندۂ سرکار تو پھر بھی

جہاں ہے یا کوئی صورت کدہ ہے
جسے دیکھو تو اک حیرت زدہ ہے

تجھے منظور ہو یوں ہی اگر ایماں حاضر ہے
ارے اول دیکھا کیا ہے؟ ہمارا جان حاضر ہے

رقیب و سیہ کو دیکھ لے جس نے نہ دیکھا ہو — ہمارے وقت میں فرعون بے ساماں حاضر ہے
نہیں تو نے ستایا ہم کو گو اے شوخ اپنا ہو — تو پھر رکھ دے نہ سر پر ہاتھ یہ دوراں حاضر ہے
خضب ہے صافیٔ رخ تو شکن پیشانی — اگرچہ فتنہ غائب ہے مگر ہنگام حاضر ہے

ہم دبستان و ہم تماشا اپنے — اٹھ گئے آہ خواجہ تاش اپنے
کیا ہوئے اے صنم خدا جانے — نالہائے جگر خراش اپنے
لگیں سرگوشیاں ہم ہونے — راز دل ہو گئے جو فاش اپنے

اک ذرا بات سمجھ کر کیجے — جرم، اثبات سمجھ کر کیجے
گرچہ تصفیہ ہوا ہے باہم — پر ملاقات سمجھ کر کیجے
صرف بے صرفہ نہ ہو لازم ہے — صرف اوقات سمجھ کر کیجے
باعث فتنہ سبا دا ہوئے — زلف سوغات سمجھ کر کیجے
قافیہ تنگ نظر آتا ہے — فکر ابیات سمجھ کر کیجے
شیخ! کہتا ہے تصور اپنا — صورت ذات سمجھ کر کیجے

ذوق سخن سے واقف اہل دق کچھ ہیں — جو بات ہیں مزا ہے وہ کب نبات میں ہے
یہ اس کا اختیار ہے شب آئے یا نہ آئے — گزرے ہے انتظار سے اب آئے یا نہ آئے
کس لیے داغ دل پوشیدہ مثل لالہ کیا کیجے — عیاں ہے رنگ و سے اپنے ضبط نالہ کیا کیجے
ہمارے غائبانہ کچھ ہوا درد رہ رو کچھ ہے — مزاج یار کیا کہیے کبھو کچھ ہے کبھو کچھ ہے
لیتا ہے کب وہ جان جسے دل پسند ہے — شکل تو ہے یہی کہ وہ شکل پسند ہے
مکدر کب کسی سے وہ بت حراف ملتا ہے — بہ رنگ آئینہ ملتا ہے جس سے صاف ملتا ہے
غنچہ لب اب دن بھی گیا اور رات بھی جاتی ہے — اب تو کھل کر بول کچھ کیا بات بھی جاتی ہے

حلیم طبع کسی پر غضب نہیں ہوتے — اگرچہ ہوتے ہیں پر بے سبب نہیں ہوتے
ادب ضرور ہے ہر چند خورد کو ہر جا — مگر بزرگ بھی کچھ بے ادب نہیں ہوتے

غنچہ سے دہن اس کا دیکھو نا ملا کرتم — سرخی میں کچھ کم ہے، دو رنگ زیادہ ہے
جس وقت مرے دل کی وہ گھات پر آتا ہے — کر غمزہ ہے اپنی سی جن بات پر آتا ہے
دل ہی مرا جائے ہے جس طرح سے گر ہو — افسوس مجھے اپنے من رات پر آتا ہے
بے وجہ ہمارے سے پھر جنگ نکالا ہے — اس شوخ نے دیکھو تو کیا ڈھنگ نکالا ہے

ہو جائے ہے دیوانہ اک بار جو دیکھے ہے — اللہ! بری رونے کیا رنگ نکالا ہے

آستیں گروہ خود پسند بچنے — موج پھر تنکے ایک چند بچنے

پیچ کھا کھا کے مار، مر جاوے — اپنے جامہ کے گروہ بند بچنے

ملاوے کس طرح یہ ہم جا پھر آنکھ قاتل سے — ذا سکی جان ہی نکلی نہ اسکی آرزو دل سے

ہم نے کیا خوب رو نہیں دیکھے۔ — ایسے پر حوصلہ جو نہیں دیکھے

اُس کا کیوں کر بھلا خیال کریں — خواب میں بھی کبھو نہیں دیکھے

چشم گریاں پہ تک نظر کیجے۔ — تم نے گر آب جو نہیں دیکھے

دیکھتے دیکھتے ہی دل کو جُرا لیتا ہے — لائیں کہتا ہوں تو باتوں میں لگا لیتا ہے

اُس نے جھوٹے بھی کبھو پوچھ نہ دیکھا تجھکو — پھر تو ایسے کا سخن نام بھلا لیتا ہے

جوں ہی اُس بت کو سخن جلوہ نمائی سوجھی — دیکھتے ہی بخدا اُس کو خدائی سوجھی

دیدۂ تر سے مرے اشک چلا جاتا ہے — اور وہ شرم سے جوں شمع گلا جاتا ہے

آہ! یوں رات چلے جاتی ہے — ہاتھ سے بات چلے جاتی ہے۔

بارے صد شکر تصور میں ترے — یوں بھی اوقات چلے جاتی ہے۔

ساقیا! اب تو کوئی جام پلا۔ — مفت برسات چلے جاتی ہے۔

حسب فرمائش جانانہ ہنوز — روز سوغات چلے جاتی ہے۔

حرف جو لانے نہ تھے منہ پر وہی آ گئے — بندہ پرور! تم تو اپنی ہی سے فرما گئے

حائل وصل صنم اغیار جیسے ہیں سو ہیں — عاقبت یہ بندہ ہم سے نہ اٹھوا گئے

اتنی مدت میں سخن اُس کو نہ دیکھا آ جنک — گرچہ ہم کو چہ سے اُس کے بارہا آئے گئے

وہ دل آزار پھر آتا ہے خدا خیر کرے — دیکھیے کس کو ستاتا ہے خدا خیر کرے

شام کل کی تو مجھے روتے ہی روتے گزری — آج پھر شام بتاتا ہے خدا خیر کرے

تم نے دیکھی نہ ضد اس کی نہیں جاتا کر کی — اس شب تار میں جاتا ہے خدا خیر کرے

کیا سبب ہے کہ وہ عیار خلاف معمول — گھر مجھے اپنے بلاتا ہے خدا خیر کرے

ظاہر اخبط نے گھیرا ہے اُسے آج سخن — گالیاں صاف سناتا ہے خدا خیر کرے

سُنتے ہی خبر ترے سفر کی — وحشت نے مزاج پر اثر کی

جو بات کہو اُسے کہے ہے۔ — "جانے بھی دو لائے ہو کدھر کی"

کچھ دوس نہیں ہے شمع رو پر ایسی تیسی کریں سحر کی۔
اتنا بھی میاں! اچھا کے ستچل جوٹی ہی تو ناک ہے کمر کی۔
کیا بیٹھے ہو لال لال میرے! کچھ تو کہیے ادھر اُدھر کی؟

اُف ری تری خوشی اللہ ری بیہوشی جب میں تجھے دیکھوں سر شار ہی رہتا ہے

بغل میں ان نونوں تہاہی اپنی خوبرو دیا پری رو! تو اگر دیکھے اُسے دیوانہ ہو جاوے
سخن اس غم سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ آئندہ ترا احوال بھی مجنوں صفت دیوانہ ہو جاوے

تو تو پھرے ہی اپنی فقط چشم تر لیئے پھرتے ہیں آرزو میں بہت اُس کی در لیئے
جی تو یہ چاہتا ہی کہ اُٹھے نہ جا سے اور حرص یوں پھرے ہی ہمیں در بدر لیئے

پھنسایا محبت نے دام بلا میں مجھے در نہ کب آرزو تھی کسو کی
تمہاری ہی چشم سخن گو نے سمجھا کہ کچھ زیر لب گفت و گو تھی کسو کی
عجب عیش تھا وہ کہ مستی میں اکثر گلے سے لپٹنے کی خو تھی کسو کی
خدا جانے پھر اے صنم! کیا ہوا وہ؟ گلی میں تری ہائے ہو تھی کسو کی
نہیں خالی حکمت سے آنکھوں کا بھرنا مگر ان کو فکر وضو تھی کسو کی
سخن آنکھ کھلنے نے بس کھو دیا ہی کہ صورت ابھی روبرو تھی کسو کی

ملامت گر چھیڑ تک زخم جگر پر کہ گونک نکلے خیال یار پر مشکل ہی دل سے یک بیک نکلے
نکالا کام دل تو نے بہت بے کام گا رو کے کسی ناکام کا بھی کام گا ہے آفلک نکلے
فرائش گر کرے حق نمک کو بحر کیا رب بدن سے پھوٹ کر ہا ہی کے دریا کا نمک نکلے
سخن اپنی غلط فہمی تھی جنگو گر سمجھا تھا کمال افسردہ دل نکلے نہایت ہی نمک نکلے

آج بھی ہم سے بناتے ہو اجی یہ باتیں کل ہی کی بات تو ہی ہوش سنبھالو تم نے
واہ وا ہم بھی سلیقے کے مقرر ہیں اب تو نا ذیبا دکے سب سے نرالے تم نے

عرض سوال یارے شایان فقر کب ہے لب پر ہے نوا سے قانون بے نوائی
کرتا ہے تن دہی کب مدعا دل دہی کے چاہے ہی آئینے سے جو فقد رد نمائی
کسی دن ہم تجھے تنہا اگر اے شوخ پا دیں ہمارے جی پہ جو جو کچھ گزرتی ہی سنا دیں گے
برنگ رہ تنظور نظر ہم بھی کبھو ہو گے جلا دیں آپ دیکھیں تو ہمیں کب تک جلا دیں گے
کبھو اطلس کی انگیا ہی کبھو شنگرف کی جامہ تکلف بر طرف سادا ہی بندوبست بہتر ہے

اب تو ہلتے ہو نہ چلتے ہو خدا خیر کرے
کم بہت گھر سے نکلتے ہو خدا خیر کرے

اب تو پہیوں ہی پہ چلتے ہو خدا خیر کرے
دن بدن رنگ بدلتے ہو خدا خیر کرے

نشہ اتنی تو نہیں ہے تمہیں کہیئے کیا ہے؟
کہیں گرتے ہو سنبھلتے ہو خدا خیر کرے

آپ کی سنگ دلی اب وہ کدھر ہے کہیئے؟
موم کی طرح پگھلتے ہو خدا خیر کرے

یہ جو تم وصف خط سبز بیاں کرتے ہو
آج کچھ زہر اگلتے ہو خدا خیر کرے

ہے سخن سے تمہیں اللہ قساوت کتنی؟
قتل کرتے ہو کچلتے ہو خدا خیر کرے

یہاں پری تا بہ حور یکساں ہے
جلوۂ نار و نور یکساں ہے

دل سے دل کو اگر تعلق ہو
یار نزدیک و دور یکساں ہے

چاہیئے دیدۂ حقیقت بیں۔
شعلہ و شمع طور یکساں ہے

یہ وہ سرکار ہے سخن کہ یہاں
کودن و ذی شعور یکساں ہے

صنم کو بہر تحصیل سبق آئینہ بہتر ہے
کہ صد دفتر سے علم اخلاق آموزیہ بہتر ہے

قسم کھاتے ہو کیا اے جان جانے
تمہارا دین اور ایمان جانے

بھلا کچھ اور بھی تم جانتے ہو؟
اجی کیا بس برا ہی مان جانے

نگہ پر تو نگہ رکھتے نہیں ہو؟
تغافل ہی فقط پہچان جانے

یہ ہے الطاف یہ ہی چاہیئے تھا
تمہارا جب سخن احسان جانے

یوسف مصر ہو تو کام نہیں
غیر سے اپنے پاسکے ہوتے

خاک ہو تیرے ہاتھ سے اے عشق! ق یہی تا ہر دیار کے ہوتے
سرمہ ہوتے بہت تو یہ ہوتا ۲ زیب چشم نگار کے ہوتے
پھر تو اکسیر ہی تھے گرد راہ گر کسی خاکسار کے ہوتے

ربط وہ اگلے کم ہوے سو ہوے
تجھ سے بے گانے ہم ہوے سو ہوے

تان جب اس کے کان پڑتی ہے
جان کے تن میں جان پڑتی ہے

نظر سے اپنی بدیا خوب تر صورت گزرتی ہے
تکلف برطرف اپنی بہر صورت گزرتی ہے

ہزاروں صورتیں دل سے اتر جاتی ہیں اک پل میں
نظر سے اپنی صورت گر کی گر صورت گزرتی ہے

یہ حسن و عشق ہے آئینہ ہم ایجاں بیں
گزرتی ہے ادھر بھی جو ادھر صورت گزرتی ہے

بنے ایسے خود آرا سے سخن کس شکل پھر بنے؟
بناتے ہی جسے آٹھوں پہر صورت گزرتی ہے

---

۱۲ اب ذرا نہ لے لیں

کیا فرق کفر و دیں کے ہے ایمان درمیاں ہے — تسبیح تک تو دیکھا زنار درمیاں ہے

نظر آتے ہیں مجھکو برق کے سے ڈھنگ تیور — کہ کم ہو جائے گا ہے اور گاہے دمبدم چمکے

یہی صورت رہی اپنی اگر اک چند دوری میں — تو پھر تم دیکھنا صورت بھی ہم پہچانے جاوے گی

ہمیں غم ہے کہ ہم آخر نظر میں دشمن جاں کی — سبک ہو جائیں گے پر یہ گراں جانی نہ جاوے گی

سفر ہو یا حضر ہو بندہ پرور اپنی محبت ہے — بدشواری ہی جاوے گی بآسانی نہ جاوے گی

زر نہ درویش بے ریا چاہے — من کو مارے جو کیمیا چاہے۔

سخت عقل و جنوں کی بگڑی ہے — ق — ایک کی ایک ضد کیا چاہے۔

وہ یہ چاہے کہ تار تار کروں — ۲ — یہ گریبان کو سیا چاہے۔

خلط مبحث میں اے سخن! ایسے — ۳ — دل تو انصاف ہی کیا چاہے۔

حق تو یہ ہے کہ وہ سہاگن ہے — ۴ — بندہ پرور! جسے پیا چاہے۔

حالت یہ اپنی ضعف سے عبرت فزا بنی — قامت دوتا ہوا کہ وہیں شکل لا بنی

اے سنم اس سے فائدہ بھی کچھ ہوا تجھے؟ — لوٹے ہزار گھر تو یہ عشرت سرا بنی

آسودہ جب ہوا دل بے تاب عیش ہے — سیماب ہے جو ٹھیر گیا کیمیا بنی

ہمارا درد دل مجنوں سے پوچھو ہم سے مت پوچھو — کہ حال عاشق دل باختہ دل دادہ جانے ہے

سبب ہی ہو گرچہ جاں آسا بنائے زندگی — بھر رہی ہے سر میں تب پر بھی ہوائے زندگی

یاد وہ عہد شباب اے دل! کہ بیتیں چند روز — عیش سے آباد تھی عشرت سرائے زندگی

عالم طفلی و پیری سے مجھے ظاہر ہوا — ابتدائے زندگی و انتہائے زندگی

امر ناچاری ہے کیا کیجے کہ ٹالے ہی بنی — آپڑی ہے اب تو سر ہی پر بلائے زندگی

از کفن تا بیرہن دیکھا تو اتنا فرق ہے — یہ برائے مرگ ہے اور وہ برائے زندگی

سانس لیتا ہے جو یہ بیمار دشواری کے ساتھ — ظاہر اتنگی کرے ہے تنگنائے زندگی

ایسی ہی آہستہ چلے جاتی ہے کچھ — گوش زد ہوتی نہیں آواز پائے زندگی

مرگ ہی کی یاد رہ رہ کر مجھے آتی رہی — ہو گیا جب سے گرفتار بلائے زندگی

ہے یہی تنگی نفس کی اور دل کی غنچگی — تازہ مثل گل قبا ہو یہ قبائے زندگی

خضر آسا ہو اگر عمر ابد پھر بھی سخن — یاد رکھیو پھر یہ میرے بروئے زندگی

چمن میں صبح وہ ایسی امنگ سے آئے — کہ گل تمام نظر نیم رنگ سے آئے

وہی بسروہ بت شوخ و شنگ سے آئے
کہ بار عشق ہیں جو نام و ننگ سے آئے

ہوئی نصیب انہیں کو بہار بے رنگی
برنگ بو جو نکل صاف رنگ سے آئے

کیا ارادۂ اشنان جب وہ کافر نے
سبو بھرے ہوئے دریائے گنگ سے آئے

وہ دل نگار کا پھر کیوں نہ کام ہو جاوے
ہلال زخم جو ماہ تمام ہو جاوے

دل گرفتہ کھلے جب تو سر خوشی ہووے
شگفتہ ہو جو یہ غنچہ تو جام ہو جاوے

آفریں کہیئے انہیں پیار رے کہ پیدا ہی کیا
دولت عمر ابد کشتوں نے مر کے ترے

ایک دن بھی رہے دل یا نہ تجھ سے آج تک
گرچہ ہم بندہ ہیں بے دام و درم گھر کے ترے

اس توقع پر کہ پھر بھی تو نظر آوے کہیں
ہو گئے دریوزہ گر مشتاق در در کے ترے

ہم سے اے کشش نہ کر نخوت فروشی اس قدر
تو اگر سر ہے تو ہم بھی تاج ہیں سر کے ترے

بال و پر بلبل کے اے صیاد آوارہ نہ کر
کام ہی آ جائیں شاید بالش پر کے ترے

اے زلیخا! ہاتھ کیا آیا ترے اس مکر سے
قفل آخر جھڑ پڑے کاخ مصور کے ترے

عشوہ و ناز و کرشمہ ایک سو دل ایک سو
یہ تن تنہا ہے اور جم غفیر حسن ہے

کچھ عجب نسبت ہے ان دونوں کی آپس میں سخن!
مہر سے طرح و فا مہ سے ضمیر حسن ہے

کون کہتا ہے کہ آئینہ کنارے رکھیے
پر نظر حال پہ بھی ٹک تو ہمارے رکھیے

دل پر داغ جو ایسا ہی پسند آیا ہے
لیجئے نذر ہے یہ داس تمہارے رکھیے

خیر معلوم ہوا ہم کو ستانے کیا ہو؟
گر پری آپ نے شیشہ میں اتارے رکھیے

قدر دانی نہ کریں پھر بھی یہ مہر داں کی
روبرو چرخ سے لا کر جو ستارے رکھیے

غم میں کہاں کہاں نہ ترے اے صنم پھرے
کوچہ بکوچہ۔ در بدر و خم بخم پھرے

ہم کہیں یہ دوس رکھتے ہو انصاف تو کرو
تم ہم سے پھر گئے کہ بھلا تم سے ہم پھرے؟

اپنی سی گرچہ بیش نہ نوں نے کمی نہ کی
پر۔ ہم کہے بتوں سے نہ ہم سے صنم پھرے

قاصد پھرے غریب پھرے، مہر و مہ پھرے
پر۔ اس طرف نہ زہرہ و ملک علم پھرے

کیا کام اس کو باغ سے طاؤس کی طرح
ہمراہ ہی لیے جو بہار ارم پھرے

کافر ہوا اعتبار ہوا اب جس کو آپ کا
تسلیم مرتبہ تو آپ نے کھا کر قسم پھرے

اب جو چلے ہو شام ہی کو منہ دکھاؤ گے
شب کے جو گم ہوئے تھے سو تم صبح دم پھرے

خلاف وضع جہاں۔ نالہ ساز ایسے
نہیں کرخت ہی ایسے ہم گداز ایسے

نہوں جو در پئے ایذائے عاشق سیکیں — کہاں جہان میں معشوق دل نواز ایسے
طریق باختہ ہوشان عشق مت پوچھو — کہ خال خال ہیں جاں باز و پاک باز ایسے

انداز گو سخن کے ہمدم نہیں سمجھتے — باوصف محرمیت محرم نہیں سمجھتے
وادی پہ اپنی جس دم آتے ہیں چشم گریاں — صد سیل کو بقدر شبنم نہیں سمجھتے
پہنچی ہے بے نیازی اس مرتبہ پر اپنی — حاتم کو اے سخن اہم حاتم نہیں سمجھتے
بدمست جوانی آخر آخر پیری میں ہشیار ہوئے — تھے رات تو خواب غفلت میں دن کو جب بیدار ہوئے

کیوں نہ معذور ہو تائید فلک پر حاسد — سفلہ محض ہے سفلہ کی کمک رکھتا ہے
رتبہ حضرت انسان سے آگاہ بھی ہو؟ — ہے تو آدم پہ تفوق یہ ملک رکھتا ہے
سرکشی سے مری نالہ کی نہیں تم واقف — سر اٹھاتا ہے تو یہ تا بہ فلک رکھتا ہے
گرمی عشق کو گل کھانے نے افسردہ کیا — گرم ہے داغ پہ تاثیر خنک رکھتا ہے
اے سخن افسردہ شیریں ہو اگرچہ شیریں — گریہ فرہاد کا بھی آب و نمک رکھتا ہے

تا چند رخ سے راہ ترے منفعل رہے — زہرہ تری جبیں سے کہاں تک خجل رہے
حسن و وفا کا قحط ہے اتنا جہان میں — عاشق رہے نہ وہ بت پیماں گسل رہے
ہے شرط اتحاد تو یہ چاہیے کہ یار — آشفتہ زلف ہو تو پریشان دل رہے
مسحور ہی صفا سے وہ رخ اس قدر کریں — اتنی جگہ نہیں کہ سخن ایک تل رہے

نہ پوچھو خوش ادائی کون سی ہے — بھلا اس میں برائی کون سی ہے
اگرچہ بے سر و ساماں ہے بندہ — بتوں کے گھر خدائی کون سی ہے
مکدر ہی رہا کرتا ہے اکثر — اسے ہم سے صفائی کون سی ہے
رسائی کی جہاں ہو نارسائی — ہمیں پھر وہاں رسائی کون سی ہے
جسے تو نے جفا سمجھا ہے یہ بھی — وفا ہے بے وفائی کون سی ہے
دکھا جاتے ہیں گاہے خستہ حالی — پھر اس میں خود نمائی کون سی ہے
سخن جو غش ہے اس دہقان بچہ پر — بھلا یہاں میرزائی کون سی ہے

ہمارا جرم اس نے کچھ نہ کچھ ثابت کیا ہوگا — کہ ترک آشنائی شوخ نے اک بار ایسی کی
ہمیں اب ایک دم بھی عمر مشکل ہی گزرنا — تمہارے ہجر نے تو زندگی دشوار ایسی کی
توقع وصل کی پھر بندہ پرور اک کیا ہی تم نے — طلب پر تم نے اک بوسہ کے جب تکرار ایسی کی

وفا مجنوں سے کی لیلیٰ نے جیسی بیش از بیش اپنے سخن سے اپنے تو نے بھی تو آخر دلربا ایسی کی

دیدۂ نرگس شہلا یہ پھبن کیا جانے شوخیٔ چشم سیہ مست ہرن کیا جانے
گل سے محرم جو نہ ہو رخ سے بھلا کیا واقف غنچہ دیکھا نہ ہو جس نے وہ دہن کیا جانے
درد ہمدرد ہی کچھ جانے تو جانے اپنا درد دل ورنہ بت عہد شکن کیا جانے

دور و نزدیک گفت و گو ہی ہے تو جسے ڈھونڈھتا ہے تو ہی ہے
ہم نہ دیکھیں تو نقص بینش ہے ورنہ وہ اپنے روبرو ہی ہے
مست ہیں اور کچھ نہیں رکھتے اپنا سرمایہ اک سبو ہی ہے
مرغ قبلہ نما کی طرح سخن روئے مشتاق ایک سو ہی ہے

اشک سے چشم تر کو آگ لگی گرم پانی سے گھر کو آگ لگی
ہجر کی رات جو نہیں کٹتی کیا بلا اس سحر کو آگ لگی
عیب ہی ہے جہاں تہاں عجب جب تو علم و ہنر کو آگ لگی
دیکھتے ہی وہ شعلہ رو کو سخن تا مدِ نظر کو آگ لگی

جو فقط دل سے آشنا ہوئے وہ بخود گم نہ ہو تو کیا ہوئے
کس بلا میں پھنسا دیا اے دل! کیا کیا ہے ترا برا ہوئے
زخم دل پر اگر سخن تیرے چھڑکیے تو نمک مزا ہوئے

طالب نہیں کہ دولت جم اپنے ہاتھ آئے پر یہ خدا کرے کہ صنم اپنے ہاتھ آئے
ایسے ترے فراغ میں شبنم ہو کب آیا نہ تو ہی ہاتھ نہ ہم اپنے ہاتھ آئے
آئے جو ہاتھ ہاتھ تو بیعت ہی کیجیے سر ہی پہ رکھیے گر وہ قدم اپنے ہاتھ آئے
بس ہے جو رخ پر رخ ہو وہ گلرخ تو پھر ادھر رخ بھی نہ کیجیے جو ارم اپنے ہاتھ آئے

نالہ کو ارتباط ہے دل سے گریہ کو اتحاد چشم سے ہے
مست و مخمور و ساحر و فتنہ فی الحقیقت مراد چشم سے ہے
گرچہ اے شیخ یہ مسلم ہے ق قدر ابرو زیاد چشم سے ہے
ابروے یار سجدہ گاہ بجا (۱۲) پر مجھے اعتقاد چشم سے ہے

کدھر وہ چشم تغافل پناہ پھرتی ہے مژہ کے سایہ میں جس کی نگاہ پھرتی ہے
جناب بادۂ جوشاں نہیں مگر اے دل پری رکھے ہے سر پر کلاہ پھرتی ہے

سخن ہی ظلم رسیدہ نہیں تن تنہا — کہ اک جہان یہاں داد خواہ پھرتی ہے

ترک کی یا ایں ہمہ جود ستداری دوستی — دشمنی جانا اگر تم نے ہماری دوستی

خاک ایسی زود رنجی پر کہ آدھی بات پر — ہو گئی برباد اک مدت کی ساری دوستی

کیوں کیا آزردہ تم نے خاطر عشاق کو — تھی اگر پیارے تمہیں ایسی ہی پیاری دوستی

ایک دن شیریں نے خسرو سے کہا باصد نیاز — کیا یوں ہی ہوتی ہے باہم آئین داری دوستی

ہم تمہیں چاہیں مدام اور تم رہو مشغول غیر — یہ ہماری دوستی ہے وہ تمہاری دوستی

فضولی ہے اگر کہیے کہ ان آنکھوں سے دیکھا ہے — وہ آنکھیں روتی ہیں جن آنکھوں سے دیکھا ہے

خدا جانے کہ بدنظروں نے جن آنکھوں سے دیکھا ہے

خدا عالم ہے حال غیب کا ہم نے سخن اب تک — پری دیکھا ہے آنکھوں سے نہ جن آنکھوں سے دیکھا ہے

فرصت شب وصال کی برق و شرر ہوئی — تھی شام ہی ہنوز کہ پیدا سحر ہوئی

تلخی نزع رشک نے اس کو چکھا دیا — شیریں کے حق میں زہر سے بدتر شکر ہوئی

مست مئے نشاط ہے تو سیر و طیر میں — جانے تری بلا جو مری جان پر ہوئی

اپنی خبر ہو پھر اسے کیوں کر کر راہ میں — جاتی ہوئی خبر بھی نہ خود بے خبر ہوئی

نسبت ہی حسن و عشق میں کچھ اور ہے سخن — ابرو ہوئی جو تیغ تو چھاتی سپر ہوئی

نہ تنہا چشم ہی رمل گراں کا کام کرتی ہے — نگاہ مست ساقی اک جہاں کا کام کرتی ہے

مژہ تنہا تیغ خوں فشاں کا کام کرتی ہے — نگاہ تیز کیا کم ہے سناں کا کام کرتی ہے

زبان بے زبانی صد زباں کا کام کرتی ہے — نگاہ عجز عاشق ترجماں کا کام کرتی ہے

ایک تنہا نہ وفا لوٹ گئی — حسن پر اس کے ادا لوٹ گئی

دیکھ اس مست حیا کو محبوب — اور تو اور حیا لوٹ گئی

خون عاشق پہ ہوا جب مائل — پانو پر اس کے حنا لوٹ گئی

آج بن ٹھن کے وہ بت یوں نکلا — کہ خدائی بخدا لوٹ گئی

مرضی بت جو سوئے جلوہ نمائی آئی — دیکھنے کو بخدا اس کے خدائی آئی

طور سے اپنے وہ خود در آ گزرتا کب ہے — یہ طبیعت ہی تو ہے پھر جدھر آئی آئی

کیا کیا ہم نے کہ آزردہ کیا گل رو کو — کیا بھلی چنگی بھلائی میں برائی آئی

نہ ہوا صاف کبھو ہم سے مکدر ہی رہا — ایسی ہی جی میں وہ بدنظر بے برائی آئی

ادھر بھی کچھ ہنر آتا ہے صبا کو پوچھو — یا یہ غنچہ ہی کی بس عقدہ کشائی آئی
اپنی نیکی سے نہ ہم گزرے بدی تک جب تو — اس بُرے وقت میں کام اپنے بھلائی آئی

خدا ہی خیر کرے کچھ قلق ابھی سے ہے — شروعِ عشق ہے اور سینہ شق ابھی سے ہے
ہنوز اُس لبِ می گوں تلک نہیں پہنچا — کہ جامِ شرم سے پُر از عرق ابھی سے ہے
اگرچہ اول جوشِ جنوں ہے پر سر میں — ہوائے بادیۂ لق و دق ابھی سے ہے
زہے زمانہ کہ لڑکوں کو اس زمانے کے — دوا دوی پئے سدِ رمق ابھی سے ہے
شبِ وصال کہاں ہے سخنؔ؟ تماشا ہے! — ہنوز شام ہے پیدا افق ابھی سے ہے

کبھی اُس خوبرو کے بام و در پہ منظر خوش آتا ہے — اُسی کو خوش کرے ہے جو اُس کو جو منظر خوش آتا ہے
کسو کا ناز خوش آتا نہیں نازک دماغوں کو — خوش آتا ہے تو ناز صاحبِ جوہر خوش آتا ہے

کہے سُنے پہ کسو کے عمل کیا تم نے — ہمارے کام میں آخر خلل کیا تم نے
یہ خوب کام کیا حضرتِ سخنؔ اے واہ — کہ ترکِ صحبتِ اہلِ دول کیا تم نے

کبھو جو مجھ سے خوش ہوتا ہے تو پہرن بھیجتا ہے — کبھو ناخوش جو ہوجاتا ہے تو پہرن لاتا ہے
عجب صورت ہے عاشق کی خیالِ خال میں تیرے — سحر تک شام سے بیٹھا ہوا افیون گھولتا ہے
پئے تسکیں سخنؔ یوں دل پہ اپنے ہاتھ رکھتا ہے — تھپک کر طفلِ بد خو کو کوئی جیسے سُلاتا ہے

بایں عاشق نوازی جانِ جاں! پھر دل کہی کیسی — جو تیری دوستی یہ ہے تو ہوگی دشمنی کیسی؟
کسی کا ذکر تقریباً چلا جاتا ہے رُکنا ہے — زیادہ اس سے ہوگی اور اُس کی مُخبری کیسی
یہ ہم ہی ہیں کہ اب تک روک رکھا ہے نفس اپنے — کرے ہے نفس کا فرخ ہم سے تو سرکشی کیسی
نہ کیسے شیخ کو فرعونِ بے ساماں کہوں تو کیا کہیے؟ — بھری ہے سر میں اُس کے تشنگی کبر و منی کیسی
بھلا پروانۂ دل سوختہ جاں ہو کس صورت — بلائے جان ہے اُس کی یہ شمعِ کشتنی کیسی
نہ سمجھے یوں تو ہٹ دھرمی ہے تیری کی سخنؔ ورنہ — کیا ہے کوہ کن بے ستوں پر جاں کنی کیسی؟

بخود بالیدہ ہوتا ہے جو اتنا آج کھل کھل کے — خدا جانے کہ کیا مجھ کو صبا نے کان میں کل کے
ہوئے آزاد جو خط کے نمو ہوتے وہ کیا جاتے — اسیری کا مزا پوچھو گرفتارِ دل سے کاکل کے
سخن مے کھانہ نیچہ لے گیا اُس زلف مشکیں نے — پہلوانی کی پیچ آخر نہ آئی کام سنبل کے

آپ جو ہم سے لگے مہر و وفا کم کرنے — غیر خوش وقت ہوئے یار لگے غم کرنے
کچھ عجب تم نے کیا ہم سے تغافل آواہ — جب کہ ہم رام ہوئے آپ لگے رم کرنے

دیکھ اُس چہرۂ پرنور کو ارباب نظر — سورۂ نور باخلاص لگے دم کرنے
خیر ہے جان! کہ اک جونہ شکر آئی پر — دوستی ہی کو لگے آپ تو برہم کرنے
نا دہندی پہ کمر آپ نے ایسی باندھا — مرحبا سرکار جو کرتے تھے لگے دم کرنے

کہہ دو جراح سے اتنا کہ خبرداری سے — زخم دل کچھ نظر آتے ہیں مجھے کاری سے
بارہا منع کیا اُس کو جفاکاری سے — لیک گزرا نہ دلآزار دلآزاری سے
کاہے کو ذکر اسیرانِ وفا کرتے ہو — تم تو واقف ہی نہیں ذوق گرفتاری سے
سلسلہ اشک مسلسل کا نہ پوچھو اپنے — بہرہ ور بحر ہے اس سلسلۂ جاری سے
وقت یاری کے نہ کی ایک نے مجھ سے یاری — یہی امید تھی یاروں کی مجھے یاری سے
بخت کچھ ایسے ہی برگشتہ ہوئے ہیں اپنے — کام دل زور سے نکلا نہ سخن زاری سے

تجھے بگاڑ دیا ہم نے راست پوچھو تو — وگرنہ وضع تری یہ تو کج کلاہ نہ تھی
کیا سلوک جو اے ماہ مہرباں تو نے — ہمیں یہ تجھ سے توقع خدا گواہ نہ تھی
غم فراق نے دیکھا نہ کر دیا آخر — اگرچہ حالت دل اس قدر تباہ نہ تھی
کیا جو خوض تو یوسف کی بے گناہی پر — نظر بشرع محبت کم از گناہ نہ تھی
سوائے تیری گلی کے ستم رسیدوں کو — مرا تو یہ ہے کہ ظالم کہیں پناہ نہ تھی
ہوا جو شکوہ سرا تو سخن تغافل کا — ارے وہ عین نگہ تھی تجھے نگاہ نہ تھی

رکھتے حسد سے اس بن بے چوں تجھے مجھے — جلتے ہیں دیکھ لیلیٰ و مجنوں تجھے مجھے
مجبور ہوں اس امر میں اے جان! کیا کروں — ملنے نہ دے جو گردش گردوں تجھے مجھے
عشاق تجھ سے رام ہیں معشوق مجھ سے رام — ہے یاد کچھ عجیب ہی افسوں تجھے مجھے
اک دن کہا عجب صنوبر نے سرو سے — "حق نے دیا ہے کیا قد موزوں تجھے مجھے"
اُس نے کہا کہ "جب کہیں گلشن ہے باغباں" — ایسا نہ ہو نکالدے بیروں تجھے مجھے"

ہے جی میں ایک بار تو کیجئے وفا اُس سے — غیروں سے ملے جو نہ ملا کیجیے اُس سے
اے ہم نفس و احال دل زار ہمارا — اظہار بھلا کچھ تو کیا کیجیے اُس سے
آجائے جو اس وقت سخن عین خوشی ہے — بیٹھے ہوئے پھر شعر سنا کیجیے اُس سے

نرگس مخمور دل کی غم گساری کیا کرے — آپ ہی بیمار ہے بیمار داری کیا کرے
دیکھیے آئندہ اپنی آہ و زاری کیا کرے — عاقبت دل کی ہماری بے قراری کیا کرے

دم شماری تک تو پہنچی نوبت اس مہجور کی — جس کی یہ صورت ہو وہ اختر شماری کیا کرے
ہے دل ناخواستہ اک عمر سے برخاستہ — خواستہ کی پھیر کیئے خواستگاری کیا کرے
غنچۂ دل ہے کہ اپنا غنچۂ تصویر ہے — وا جو یہ ہوتا نہ ہو بادِ بہاری کیا کرے
لطف فرمانے لگا ہے اب تو کچھ کچھ یار بھی — دیکھیئے خوش طالعی آگے ہماری کیا کرے
سخت اُن گزندہ دماغوں نے کیا ہے بے دماغ — عجب کی اُن کے سخن شکوہ گزاری کیا کرے
ہم سے بایں عجز بھر بھی چاہتے ہیں انکسار — خاک ہی جو ہو چکا ہو خاکساری کیا کرے
جب اُس نے کھولنے کو اپنی زلفِ عنبریں یکدم — گرفتاروں نے مثلِ شانہ دانتوں سے زمیں پکڑی

کعبہ نہ جائے یا کہ بکوئے بتاں نجائے — کہیئے سخن کہ جا کہاں اور کہاں نجائے
پاسِ ادب تو یہ ہے کہ پروانہ شمع کی — پروانگی نہ ہو تو سوئے شمع داں نجائے

سوائے دیدۂ دل چشمِ سر کیا کام کرتی ہے — نظر آتا نہ ہو جو وہاں نظر کیا کام کرتی ہے
کرے گی خوں فشانی عاقبت رسوا مجھے تیری — خدا سے ڈر ذرا اے چشمِ تر کیا کام کرتی ہے
پھنسے ہیں دو دو عدم کے درمیاں اب تو سخن دیکھیں — نہیں کیا کام کرتا ہے کمر کیا کام کرتی ہے

ہو گئے آپ تو کچھ قتل پہ طیار ایسے — کوئی جانے کہ یہ سچ مچ ہیں گنہگار ایسے
اک سخن ہی تو نہیں کشتۂ تیغِ ابرو — مار رکھتا ہے صنم روز ہی دو چار ایسے
جس کی کہ آرزو تھی بروقت آن پہنچا — اب انتظار کس کا رنجور کھینچتا ہے

تک تک کر رنجی جو حسن و عشق میں آ جاتا ہے — دل ادھر کھاتا ہے پیچ اور زلف اُدھر بل کھاتا ہے
یار نے عاشق نوازی جب سے کی ہے اختیار — آپ جاتا ہے گا ہے، گہ مجھے بلوائے ہے
آج تک جو حرف سننے میں کبھو آئے نہ تھے — خاک بر الفت کہ یہ الفت تجھے سکھلائے ہے

اے پری طلعت از خود بے گانہ ایسا بھی رہے — دل کے بہلانے کو اک دیوانہ ایسا بھی ہے

پوچھو تو قیس کون ہے فرہاد کون ہے — شاگرد اس میں کون ہے اُستاد کون ہے
آواز دردناک تو کچھ شعلہ ریز ہے — دیکھو تو گرم نالہ و فریاد کون ہے
کہتے ہم تجھ سے کہتے تھے اُس سے — اب تو ہی سچ دل میں کہ یاد کون ہے

طاق دیکھا ہے ہم نے امتحاناً بارہا اے گل! — کہ داغ لالہ اپنے دل کے داغوں سے نہیں ملتے
کہ از جنت نہیں دنیا ہو [illegible] — ہزاروں باغ جن کے خانہ باغوں سے نہیں ملتے
جگر کے داغ دل افروز ہیں اے جاں اپنے — چراغاں [illegible] داغوں سے نہیں ملتے

سخن ہم بندۂ عزت ہیں ان بے اعتناؤں کے — جواب ایں خشک معنی ہی تردماغوں سے نہیں ملتے

خجل ہوتے اگر روئے وفا سے چارہ کیا کہتے — اگر یاری نہ کرتے یار سے ہم۔ یار کیا کہتے؟
نہ ہوتے ہم شریکِ دور تو میخوار کیا کہتے — وگر بدمست ہو جاتے تو یہ ہشیار کیا کہتے؟
تغافل کیش نے اچھا ہوا پوچھا نہیں ہم سے — اگر کہتے تو ہم حالِ دلِ بیمار کیا کہتے۔

سینکڑوں ہی آفتیں ہیں عشق میں گو جی کے لے — راز دل افشا نہ ہو اتنا ہو خطر یہ بھی تو ہے۔
اتحادِ حسن و عشق اتنا تو ہے بایک دگر — گر وہ تڑپے ہے اُدھر بیطاقتی اِدھر بھی تو ہے
گھر ہی جانا فرض ہے کچھ اس اندھیری رات میں — شب کی شب رہ جائے ناجان! گھر یہ بھی تو ہے
اُس طرف سے تو گزرتے ہو تم اکثر پر کبھو — اِس طرف سے بھی گزر یئے رہ گزر یہ بھی تو ہے
تم نے تنہا دلبری ہی کو ہنر جانا مگر — بندہ پرور! دل دہی کرنا ہنر یہ بھی تو ہے

جو تو کہتا ہو زاہد ہم رسا یوں نہیں یوں ہی — غلط فہمی ہے تیری آ۔ ادھر آ۔ یوں نہیں یوں ہے
وہی عاشق ہے جو معشوقِ معشوقانِ عالم ہو — کہ لطفِ عشق بازی جانِ بابا یوں نہیں یوں ہے
ہوا ہو، ابر ہو، دلدار ہو، مطرب ہو، گلشن ہو — کہ خطِ مے کشی اے بادپیما یوں نہیں یوں ہے
پئے رفعِ گماں تم اتنی باتیں کیوں بنائے ہو — خفا ہو جائیے بس ہم نے مانا یوں نہیں یوں ہے

گر دل سے دل کو خفیہ پیوستگی نہ ہوتی — حسن و وفا کی باہم وابستگی نہ ہوتی
لے ہی چلی تھی حرص خانہ خراب دل کو — مانع اگر ہماری وارستگی نہ ہوتی
بے مہریٔ بتاں ہی نافع ہوئی وگرنہ — دارو پذیر اپنی دل خستگی نہ ہوتی

اگر مفسد نہ کہتے حاسد بدظن کو کیا کہتے — وگرنہ فتنہ نہ کہتے ایسے برہم زن کو کیا کہتے
اگر ہالہ نہ کہتے حلقۂ زر کو تو کیا کہتے — ثریا گر نہ کہتے۔ کہتے پھر لٹکن کو کیا کہتے
سراپا پھوک دی اس آتش گل نے تو تن سب کو — اگر دوزخ نہ کہتے۔ کہتے پھر گلشن کو کیا کہتے
بلائے جاں گزا ہی اس سے حق محفوظ ہی رکھے — اگر افعی نہ کہتے تو بھی گیسوئے گرہ فن کو کیا کہتے
کسی سے کیا گلہ یہ بھی سخن قسمت کی خوبی ہے — ہوئے جب دوست ہی دشمن تو پھر دشمن کو کیا کہتے

مہجور جاں بلب کی خورسندگی نہ ہوتی — وہ جانِ جاں نہ ہوتا تو زندگی نہ ہوتی
تقصیر یک سر سو ہوتی نہ گر وفا میں — حاشا کہ آج کے دن شرمندگی نہ ہوتی
گر دندۂ ابد ہم ہوتے تو اپنے ذمہ — شہرِ عدم کی ثابت باشندگی نہ ہوتی
ایسے بھی ہم نہ تھے جو افشائے راز کرتے — بندہ نواز تم سے گر بندگی نہ ہوتی

اُس رخ سے اقتباسِ انوار اگر نہ کرتے — تو مہر و ماہ کی یہ تابندگی نہ ہوتی

صبا جس دم کہ ذکرِ خوبیٔ کاکل نکالے گی — چمن سے ہو کشاں خلقت تجھے سنبل نکالے گی
پیا گر آبِ گل بن کے مرے مژگاں کے چشموں سے — دلِ صد چاک جائے غنچہ شاخِ گل نکالے گی
نہیں قابل ہم اُن نالوں کے جب ہی مقرر ہو جے — طرحِ تازہ کوئی فریاد کی بلبل نکالے گی
فقط اک آبلوں پر منحصر کیا ہے کہ دیکھو گے — ابھی تو یہ تہی پائی بہت سے مل نکالے گی
وہ چشمِ شعبدہ بازِ فنِ استغنا کہ آفت ہے — سبوئے آب سے اہلِ دروغ کے مل نکالے گی

عاشق ہیں ہم تو اپنے بہ مہرِ ان کے — شیریں لبوں کے اور وہ شیریں زبان کے
مردِ خدا نے قہر کیا اپنی جان پر — بیٹھے بٹھائے ناک دی بدلے کمان کے
مرغوب کیوں شراب کو ہو ذکرِ لعلِ نوش — ہیں آپ بھی تو ایک چٹوری زبان کے
کافر ہو مطمئن نہ ہے جو قول و فعل پر — ہے سچ تو یہ کہ جھوٹے ہو ساری جہان کے
کیا پوچھنا پھر آپ کے انصاف و عدل کا — تم بھی تو ہوتے سوتے ہو نوشیرواں کے

نہ یہ سونے کی پتلی ہے نہ چینے کی پتلی ہے — مہ بے مہر سرتا پا مگر کینے کی پتلی ہے
نظر کرتے ہیں کب اہلِ نظر اس زال دنیا پر — نظر میں اُن کی یہ بھی ایک چوبینے کی پتلی ہے
نظر آتی ہے صوتِ صاف ہر ہر عضو سے اُس کے — مگر اُس کا سراپا صرف آئینے کی پتلی ہے

چھپے نیچے سینہ تا اُس کے ہے یہ میں ہاتھ کے — تا کہ اک جان و گر آجائے تن میں ہاتھ کے
حرزِ بازو منظور ہے گر تجھ کو اے جانِ جہاں! — نقشِ دو حرفِ نام بس ہیں نوتن میں ہاتھ کے
پوچھنا کیا اُن بتوں کے دستِ رنگیں کی بہار — گلشنِ جنت دکھاتے ہیں چمن میں ہاتھ کے
یاد ہیں وہ دن کہ جب مہندی لگاتے تھے تجھ کو — یک دگر لیتے تھے بوسہ لڑ کپن میں ہاتھ کے
ایک انگلی کی بھی قیمت ہو نہیں سکتی سخن! — دیں اگر صد پنجۂ مرجان عمن میں ہاتھ کے

یہ سیہ طالع کی خوبی ہے کہ غم خواری کی دل جس کی — طرف ہوتا مجھ سے ہی طرف داری کی دل جس کی
نرالے ہیں جہاں سے رسم کچھ ان سینہ صافوں کے — وہی خاطر رکھے ہے خاطر آزاری کرو ں جس کی
دلوں کا پھیر ہے یہ بھی قسم ہے آپ کے سر کی — وہی دیتا ہے دکھ جو پیچ دستاری کروں جس کی
اثر خدمت گزاری کا تو دیکھا نا یہاں تم نے — پھر ایسا ہے منہ دعا منت داری کروں جس کی
غلط ہے یہ کہ نیکی کا بدل نیکی ہے وہ میری — خرابی پر کمر باندھے ہے سماری کروں جس کی
سخن وہ دور کھینچے ہے نہایت آپ کو مجھ سے — نظر بر خاک ساری نازبرداری کروں جس کی

کمال عجز و غرور اپنا قسم ہو جذبۂ بے دلی کی ہے — کہ سرکشوں سے تو سرکشی ہے فروتنوں سے فروتنی ہے

صنم کی بے نشانی ہی نشاں ہے — نہاں ہے ہم سے وہ جتنا عیاں ہے

نہ فکر دین و ایماں ہے نہ خوف و رستم کا ہے — خدا حافظ کہ دل کچھ بے طرح مائل صنم کا ہے

بہر رنگ سے مقابل ہو یا ماہ کی قدرت ہے — بالله صنم کیا ہے اللہ کی قدرت ہے۔

اٹھاوے کس طرح سر کو وہ ماہ ناز بالیں سے — ہوئے ہیں یک گر چسپیدہ مژگاں خواب سیں سے

خدا ہی کشتی دل کا ہمارے اب نگہباں ہے — دبالے کو فغاں آندھی ہے جوش گریہ طوفاں ہے

جن سے امید تھی وہ لوگ وہ اپنے نہ ہوئے — واسطے جن کے کیا جوگ وہ اپنے نہ ہوئے

تنگل ظالم جو کرے طرح - ہاں طرح کرے — پہلے ہیں طرح کرے بعد جبیں طرح کرے

سرکشی فکر میں ہے فرخ بریں طرح کرے — خاکساری ہے بخود دگم کہ زمیں طرح کرے

مرد کامل ہی کو لایق ہے کرے جو چاہے — کفر بنیاد کرے یا کوئی دیں طرح کرے

فکر عالی سے تیقن ہے سخن کی مجھ کو — آسماں طرح کرے یا وہ زمیں طرح کرے

عشق ہیں جو حسن گلوسوز پہ وہ کیا جانے — شمع کیا چیز ہے پروانہ کسے کہتے ہیں

بستۂ زلف گرہ گیر کرو جب جانے — ایسے دیوانے کو زنجیر کرو جب جانے

آپ کی بندہ نوازی تو مسلم ہے ولے — عفو بے جرم کی تقصیر کرو جب جانے

پاس دلداریٔ اغیار تو کرتے ہو بہت — خاطر عاشق دل گیر کرو جب جانے

دل ہوا گل گل طلوع نشۂ فرہنگ سے — رنگ شیشہ نے کیا پیدا ئے بے رنگ سے

ظاہر ارنجش ہوئی ہے کچھ وہ شوخ و شنگ سے — ان دنوں جو حضرت دل ہیں نہایت تنگ سے

خیر اندیش سمجھتے ہیں تجھے — مرہم ریش سمجھتے ہیں تجھے

ہم تو اے کاوش مژگان سیاہ — بیش از بیش سمجھتے ہیں تجھے

کم سے کم آپ کو تو جاں پہ بہم — بیش از بیش سمجھتے ہیں تجھے

اے سخن! اہل نظر جتنے ہیں۔ — مرد درویش سمجھتے ہیں تجھے

دید سے اک نیم رخ کی کب ہوئی سیر مجھے — تا نہ سر سے پا تک اے جاں دیکھیں تجھے

ہنس فعل تو کیا کروں الطاف تیرے دیکھ کر — رو نہ دوں تو کیا کروں جس دم غضب دیکھوں تجھے

اس لیے پاس ادب نیرا مجھے ملحوظ ہے — مجھ سے ہو سکتا ہے جو میں بے ادب دیکھوں تجھے

بھن [illegible] — سامنے سے آ [illegible]

تنقید و تبصرہ

چمنستان شعرا | مرتبہ مولوی عبدالحق بی۔اے سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد قیمت فی مجلد ۵۶۵

انجمن ترقی اردو نے قدیم کتابوں اور بالخصوص شعرائے اردو کے تذکروں کا جو سلسلہ اشاعت جاری کر رکھا ہے اس میں مثنوی لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کا یہ نایاب تذکرہ ایک مفید اضافہ ہے۔ قدیم اردو شاعری کی نسبت یہی تذکرے موجودہ زمانے کے لئے ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور ان میں اگرچہ تاریخ و تذکرہ کے اعتبار سے شعرا کے تفصیلی حالات، ان کی زندگی کے اہم سنین، ان کی شاعری کی ابتدا اور ترقی وغیرہ پر جیسی چاہئے روشنی نہیں پڑتی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ انہی تذکروں کے مطالعہ اور باہمی مقابلے سے جدید اصولوں پر اردو شاعری کی تاریخ مرتب کی جائے اور مختلف تذکروں کے نامربوط بیانات سے بے جا تعریفوں اور مبالغوں کو نظر انداز کر کے قدیم شعرائے اردو اور ان کی شاعری کی نسبت مربوط و مسلسل معلومات اخذ کی جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن ترقی اردو نے شعرائے اردو کے تذکروں کا اچھا سلسلہ شائع کر دیا ہے۔

چمنستان شعرا ۱۱۷۵ھ میں تالیف ہوا موجودہ تذکروں میں قدیم ترین تذکرہ ہے یہ نکات الشعرا اور تذکرہ فتح علی گردیزی ہیں یہ دونوں ۱۱۶۵ھ کی تالیف ہیں شفیق نے جب ان تذکروں کو دیکھا تو خود اس کو بھی ایک وسیع تذکرہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور ان دونوں تذکروں کو پیش نظر رکھ کر بڑی تلاش و جستجو سے (۲۱۲) شعرا کے حالات فراہم کر کے اپنا تذکرہ ترتیب دیا۔ اس تذکرے کا صرف ایک ہی قلمی نسخہ جو غالباً مولف کا سرقہ ہے کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ آج تک کسی اور نسخہ کا علم نہیں ہوا۔ مولف تذکرہ خود بھی بڑا پرگو شاعر اور مورخ تھا۔ اس نے اس کے علاوہ ایک اور تذکرہ (جو فارسی گو شعرا کا ہی) اور کئی تاریخیں لکھی ہیں۔ اس کو تحقیق حالات اور تاریخی مواد کی فراہمی کا بڑا ذوق تھا اور جہاں تک سمجھا جاتا ہے اس نے چمنستان شعرا کی تالیف میں بڑے تفحص اور دقت نظر

کام لیا ہے۔ میر تقی اور فتح علی گردیزی دونوں کے تذکرے نہایت مجمل ہیں اور اکثر صورتوں میں اُن کی اطلاعات ناقص ہیں۔ دونوں نے اس تحقیق و تجسس سے کام نہیں لیا جو ایک تذکرہ نویس کا فرض ہونا چاہیے۔ دکھنی شاعروں کے متعلق ان دونوں کی معلومات کا واحد ذریعہ سید عبدالولی عزلت کی بیاض اور چند زبانی بیانات ہیں۔ سید عبدالولی گجرات کے باشندے تھے اور ۱۶۵۵ء میں بہ سلسلہ سیاحت دہلی میں وارد تھے۔ دکن کے قدیم شعرا اور بالخصوص گولکنڈہ اور بیجاپور کے سخن طرازوں کا خود انہیں بہت کم علم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میر تقی اور فتح علی گردیزی کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے تذکرے باوجود قدیم ترین ہونے کے قدیم شعرا کی نسبت نہایت ادھوری اور ناقص معلومات رکھتے ہیں چنانچہ شعرا خاصہ ضخیم تذکرہ ہے۔ اس کا مولف خود دکن کا باشندہ ہے اور تلاش مواد میں بڑی جگر کاوی سے کام لیا ہے اس لئے دکنی شاعروں کے متعلق اس میں بہت مواد ملتا ہے۔ شمالی ہند کے بھی ایسے بہت سے شاعر ہیں جو میر تقی اور فتح علی گردیزی کے ہاں نظر انداز کر دے گئے ہیں اور جن کے حالات اور کلام دونوں اس تذکرے میں موجود ہیں۔ یہ تذکرہ اُردو ادبیات کے متعلمین کے لئے نہایت مفید تاریخی دستاویز ہے اور نامناسب نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے امتحان ایم۔اے اور پنجاب کے امتحان انرز ان اُردو میں بجائے نکات الشعرا، گلشن بے خار اور گلشن ہند کی اس کو شریک نصاب کیا جائے اور متعلمین سے خاص خاص شاعروں پر تحقیقات کرائی جائیں۔

مولوی عبدالحق بی۔اے نے اس پر کوئی (۲۴) صفحات کا ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں مختصراً شیفتہ کے حالات زندگی کے علاوہ اس کے کلام اور اُس کی دیگر تصانیف پر نوٹ بھی ہیں۔ شیفتہ کا خاندان اپنی علمی خدمات کے لئے نہایت ممتاز ہے۔ وہ مشہور بلگرامی علامہ غلام علی آزاد کا شاگرد خاص اور تربیت یافتہ تھا بلحاظ شاعری اُس کا مرتبہ خاصا بلند ہے۔ اس کے حالات اور کلام پر خود اُس کی اپنی تصانیف اور دیگر ہم عصروں کے بیانات وغیرہ سے بہت سا مواد فراہم کیا جا سکتا اور ضخیم سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ مرتب تذکرہ نے اہل تحقیق کے فائدے اور تذکرے کی دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لئے بعض شاعروں کے حالات ایک اور تذکرہ تحفۃ الشعرا سے لے کر بطور حاشیہ اس کتاب میں شریک کر دئے ہیں جس سے واقعی یہ تذکرہ زیادہ مفید ہو گیا۔

چونکہ اس تذکرے کا صرف ایک ہی مخطوطہ دنیا میں محفوظ ہے وہ بھی بہت گنجلک اور ناصاف خط میں ہے۔ نیز اس کی نقل لینے میں زیادہ دقت نظر سے کام نہیں لیا گیا اس لئے بعض جگہ مضمون بھی خبط ہو گیا ہے کہیں کہیں نقطے بھی دیتے پڑے ہیں۔ چند طباعت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں سرورق پر مولف تذکرہ کا نام لچھمی نارائن کی بجائے لچھمن نارائن چھپا ہے صفحہ دوم پر اس کا سال ولادت ۱۱۸۵ھ بالکل غلط مندرج ہے کتاب کی تیاری میں بڑی نفاست پسندی سے کام لیا گیا ہے اور جلد بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

خزینۂ تاریخ دفتر بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ قیمت عہ

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے ساتھ ہی مختلف مضامین پر بحث و تمحیص اور تحریر و تقریر کے مواقع نکالے گئے اور طلبائے کالج کی مختلف بزمیں قائم ہوئیں بزم تاریخ بھی ایک ایسی ہی انجمن ہے جس میں شعبۂ تاریخ کے معلمین و متعلمین سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں اور وقتاً فوقتاً مختلف تاریخی موضوعوں پر محققانہ مقالے پڑھے جاتے اور اچھی تقریریں کی جاتی ہیں۔ اراکین بزم کی دلچسپی اور استفادے کے لئے ایسے بیرونی اصحاب سے بھی تقریریں کرائی جاتی ہیں جو تاریخ کے کسی خاص موضوع پر مستند حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی انجمنوں کے قیام سے جامعہ عثمانیہ کی زندگی میں بڑی سرگرمی اور بیداری کی نمایاں نشانیاں نظر آتی ہیں۔ نہایت مسرت کی بات ہے کہ جامعہ کی بزم تاریخ اپنے فرائض وجود کی انجام دہی میں دوسری بزموں پر فوقیت رکھتی ہے اور اس نے حقیقی معنوں میں طلبائے جامعہ میں تاریخی ذوق پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی خزینۂ تاریخ اس کی مساعی کا پہلا ثمرہ ہے جو کتابی صورت میں اہل ذوق کے آگے پیش کیا گیا ہے۔

اس گلدستۂ تاریخی میں سب سے پہلے تعارف کے عنوان سے مولوی ہارون خاں شیروانی ایم۔ اے (اکسن) بیرسٹر ایٹ لا سنیر پروفیسر تاریخ نے جو اس بزم کے بلحاظ عہدہ صدر الم ہیں بزم تاریخ کا تعارف کرایا اور اس کے مفید مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد مختلف مضامین شروع ہوتے ہیں۔ بعض مضمون کالج کے پروفیسروں کے ہیں اور بعض طلبا کے۔ تقریباً ہر ایک مضمون سلیقے سے لکھا گیا ہے اور تحقیق و تلاش تاریخی کے ثمرات سے مالا مال ہے۔ مضامین اسلامی، ہندوستانی، دکنی تاریخوں اور بعض

عام تاریخ و سیاسیات کے متعلق ہیں اس لئے فن تاریخ کی ہر ایک شاخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ افادہ بخش ہوگا۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس بزم کے موجودہ کارکن بھی اپنے پیش رؤں کی طرح سرگرمی کے ساتھ بزم کی ترقی میں حصہ لیکر خزینہ تاریخ کے شماروں میں بے شمار اضافہ کریں گے اور اس عنوان سے جو مفید علمی خدمت جامعہ عثمانیہ نے شروع کی ہے اس کو طویل اور عظیم الشان بنائینگے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی اصلی غایت یہی تھی کہ ملک کے ہونہاروں میں ایسا ہی تحقیقی مذاق پیدا ہو اور موجودہ سرمایہ علمی میں ان کی بدولت وہ اضافہ کثیر ہو جو پچھلے ستر پچھتر برس کی کورانہ اور خلاف اصول طرز تعلیم کی نہ صرف تلافی کر دے بلکہ مستقبل کو بھی خوش آئند بنائے۔

حالات قدسی | از مولوی اقبال حسین خاں بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی (آلہ آباد) ضخامت (۶۸) صفحے قیمت ۵ ؎ پتہ یوسف علی غریب نواز چوک بھوپال سے طلب فرمائیے۔

یہ ایک بزرگ حضرت مخدوم شہزادہ ناصر الدین محمد اسد الرحمٰن قدسی کی سوانحعمری ہے جو آپ کے مرید و عقیدت کیش متبع مولوی اقبال حسین خاں نے اپنے حسن عقیدت سے بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ مرتب کی ہے۔ حضرت قدسی اس وقت بقید حیات ہیں اور طالبان فیض کے لئے آپ کی ذات مرجع بنی ہوئی ہے۔ عقیدت کیش مرید نے اپنے پیر و مرشد کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد آپ کے اخلاق اعادات پر مفصل بحث کی ہے اور آپ کے کردار کی نمایاں صفات فیض صحبت، ایثار، ہمدردی، صبر و توکل، خود داری، بے نیازی و قناعت، سخاوت و شجاعت پر شرح و بسط سے لکھا ہے۔ آخر میں آپ کے اقوال و نصائح بھی نقل کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب جیسی اعلیٰ کردار ہستی کی لائف ہے اس کے مدنظر ناظرین اس سے نہایت عمدہ نصائح حاصل کر سکتے ہیں۔ اور مغرب کے دلدادہ نوجوان کے لئے تلخ گفتار واعظوں اور کافر گر مولویوں کے مواعظ و مواعید سے زیادہ مفید ثمرات اس کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ پڑھنے والا خود بخود فرنگیت سے متنفر ہو کر اسلامی سعید زندگی کا گرویدہ ہو سکتا ہے۔ کتاب کے پہلے چند اوراق مقدمہ کے لئے وقف ہیں جو مولوی حامد سعید (بھوپالی) کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ مقدمہ میں انحطاط مذہب اور عمل سے بے اعتنائی اور قول کے اسلام پر بڑا جوش ہے اور خوب لکھا ہے۔

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکام اور ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کرکے سینکڑوں سرٹیفکٹ عطا کئے زندہ طلسمات ملی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور پیٹنٹ شدہ ہے۔ جس زبردست امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھاتا ہے اس کا ایک ادنیٰ سرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلیگ۔ بخار۔ چیچک۔ ملیریا۔ کھانسی۔ دمہ۔ لو اسیر۔ خارش۔ سانپ۔ بچھو۔ کے زہر اور ہر اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے آزمائیے ایک بار ضرور آزمائیے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے شیشی نمبر (۱) عدد نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۴ ہر ایک درجن کے خریدار کو خرچہ دی۔ پی۔ معاف ہوگا۔

پتہ خط اور تار کا

"زندہ طلسمات حیدرآباد دکن"

وجیبل بام

بیرونی استعمال کی پر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد علیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر درد سول بچھو کے زہر کے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دل میں تین چار وقت مقام مالش کریں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں جو اعصاب لیرس مستان طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کیا جائیگا۔

نوٹ:۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر

جینس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

ہندوستان کی طباعت میں عظیم الشان انقلاب اور یورپ کو مات

مرقعِ چغتائی (یعنی) دیوانِ غالب مصوّر

جس کی پہلی اشاعت کے ۱۰۰ نسخے بحساب فی نسخہ ۱۰۰ روپیہ کلدار فروخت ہو چکے

یہ خاندانِ مرقع اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے نام نامی و اسم گرامی سے باجازت منسوب ہے

مختصر تفصیل

تعارف نامہ از ڈاکٹر سر محمد اقبال — دیباچہ از نقاد مصوری ڈاکٹر کنز (مدراس)

(۱) مکمل متن دیوان غالب نہایت عمدہ طریق سے۔ (۲) مقدمہ سخنہائے گفتنی از مصور (چغتائی) (۳) انتخاب کلام

(۲۱) تصاویر جو چار رنگوں میں بذریعہ بلاک یورپ کے ایک ماہر فن کارخانہ سے تیار کرائی گئی ہیں۔

(۲) تصاویر حضرت چغتائی کی بہترین صناعی کا اعلیٰ نمونہ آؤٹ لائن بلاک کے ذریعہ تیار کرائی گئی ہیں

(۲) تصاویر جناب چغتائی کے پنسلی خاکوں سے بنوائی گئی ہیں۔

(۹) تصاویر عام رنگوں اور باقی ہلکے رنگوں میں تیار ہوئی ہیں۔

کتاب کی جلد نقلی مراکو کے چمڑے سے تیار کرائی گئی ہے جس پر طلائی بیل بوٹے اور کتاب کا نام کندہ ہے۔ چاپائی دیدہ زیب کاغذ پر نہایت نفاست سے چھپی ہے

قیمت ان تمام خوبیوں کے باوجود صرف ۱۲۵ روپیہ عثمانیہ رکھی گئی ہے۔

مکتبہ ابراہیمیہ نے ممالک محروسہ سرکار عالی میں فروخت کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے

(ملنے کا پتہ)

مکتبہ ابراہیمیہ مدار الہامی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

نوٹ۔ مکتبہ کے شوکیس میں کتاب ہر وقت ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے

اس صدی کی

مہتم بالشان اُردو کتاب

اُردو شہ پارے

زیر ادارت

ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری۔ ام آے، پی، ایچ، ڈی (لندن)

اُردو شہ پارے

تین جلدوں میں شائع ہو رہی ہے

جلد اول۔ اُردو کی ابتدا سے ولی کے عہد تک۔ مرتبہ سید غلام محی الدین صاحب قادری، ام آے، پی، ایچ، ڈی، (لندن)

جلد دوم۔ ولی کے عہد سے حالی کے عہد تک۔ مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام، اے

جلد سوم۔ حالی کے عہد سے موجودہ زمانے تک۔ مرتبہ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام۔ اے۔ یل۔ یل۔ بی۔

پہلی جلد وسط نومبر میں شائع ہو رہی ہے

اس میں

(۱) اُردو کی ابتدا سے ولی کے عہد تک کی ادبی تاریخ (۲) اردو ادب کے سنن کا خاکہ (۳) ہر دور کے مصنفین، اُن کے کارناموں اور ان کے مخطوطوں کے متعلق تفصیلی معلومات (۴) اس عہد کے اُردو مصنفین کے بہترین شہ کار، (۵) قدیم متروک اور نامانوس الفاظ کی فرہنگ (۶) سید شاہ راجو علی عادل شاہ ثانی، سلطان عبداللہ قطب شاہ ابوالحسن تاناشاہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابن نوا ہی اور دوسری قدیم معاصرت کی تصویریں شامل ہیں۔

قدیم اردو ادب

اس سے وسیع اور بہتر معلومات کا ملنا دشوار ہے اس کے لئے مصنف نے یورپ کے تمام کتب خانوں کی چھان بین کی۔

کاغذ۔ تقطیع (کراؤن)۔ صفحات (۴۰۰)

نفیس جلد کے ساتھ

کوئی اُردو کتاب اس شان سے آجتک شائع نہیں ہوئی

قیمت چھ روپے بارہ آنے علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ ابراہیمیہ ادارہ ہمی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

*

قاموس الاغلاط

اعلیٰ انتقادِ ادبی کی یہ پہلی کتاب ہے۔ جو آئینہ عربی و فارسی و اردو میں تصنیف ہوئی ہے اس میں ہزارہا ادبی اغلاط کی تصحیح و تنقیح اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق کی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہر لفظ کی لسانی تعریح تجزئی کلام، اعراب و تشکیل، سکون و حرکت کے بعد اس کی اصل و حقیقت۔ مادہ۔ ماخذ اشتقاق تحلیل و ترکیب، اسامی صورت میں تذکیر و تانیث اور واحد و جمع شرح و بسط کے ساتھ بتائی گئی ہے۔

اس لغت میں الفاظ کی اصلیت کے اظہار میں زندہ و مردہ آئینہ عالم۔ خصوصاً سامی و آری زبانوں کے الفاظ کا تقابل تمثیل کیا گیا ہے۔ عربی، فارسی و اردو علم ادب کے وسیع و غائر مطالعہ کے بعد جدید فلالوجی (فلسفہ لغویہ) کے اصول کے موافق علامۃ الدہر مولانا سید مختار احمد ادیب العصر مولانا ذوہین نے مدون کیا ہے۔ یہ لغت اہل فاضل اہل علم، ادبا، شعرا، انشا پرداز، محققین، مصنفین، دبیر، منشی، مضمون نگار و نامہ نگار اصحاب کے لئے نہایت مفید و کارآمد ہے۔ مدارس عالیہ و ثانویہ کے پروفیسر (اساتذہ) متعلمین اور کل تلامذہ کو یہ کتاب حرز جان بنانی چاہیئے۔ غالب، آزاد، ناسخ، امیر، جلال محض چند اصول و کلیات سے واقف تھے۔ لیکن یہ لغت نوادر لسانیات، اصول زبان، مقالات انتقادیہ وغیرہ کا مخزن ہے۔

جمیع عدالت ہائے مرافعہ دیوانی و فوجداری کے حکام، وارا کین، قضاۃ و محکمہ عدالت، اور بیرسٹروں، ایڈوکیٹوں، وکیلوں، ممتاروں کو وغیرہ سب قانون پیشہ اصحاب کو اس کتاب کا پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ مفہوم کا جاننا لازمی ہے۔ اعلیٰ ہذا القیاس دیگر محاکم مال۔ فینانس، سیاسیات۔ اسمو مذہبی، تعمیرات۔ فوج وغیرہ کے دفاتر میں رکھنا لازم ہے۔ کیونکہ ملکی و رسمی (آفیشل) زبان اردو سے بخوبی واقف ہونا ضروری ہے۔

غرض یہ لغت تحریری و تقریری ہزارہا اغلاط سے آگاہ کرکے داخلوں۔ مقرروں۔ خطیبوں۔ وکیلوں۔ بیرسٹروں کو بھی علمی فائدہ پہنچائے گا۔ کیونکہ اس میں ایسے الفاظ کی تصحیح بھی کردی گئی ہے۔ جو فاضل ادبا بھی اپنی تصانیف میں بے دھڑک غلط لکھ گئے ہیں۔ یوں تو عربی، فارسی اور اردو کے بیسیوں لغات ملیں گے۔ لیکن ایک جگہ اصول و قواعد و شواہد سے تصحیح کیا ہوا اغلاط کا کافی و وافر علمی ذخیرہ اسی لغت کو پائیں گے۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے قاموس الاغلاط کے جواہر ریزوں اور الماس پاروں کی قیمت صرف ۵ روپیہ ہی ہے

ملنے کا پتہ ایجنسی امداد باہمی ایسوسی ایشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو ۔۔۔ ی، مصباح الدین ہاشمی صاحب فاضل جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ، قطب شاہی عادل شاہی و آصف جاہی دور میں اُردو نظم و نثر کی حالات اور شعرائے اُردو کا تذکرہ، معہ نمونہ کلام ضخامت ۔ ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت عہ

خیابانِ اُردو مرتبہ جناب محمد عارف صاحب جیدہ آبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابوالسعادات سید غلام محی الدین قادری نور ایم اے، فن تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ مجلد سادہ قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ نور صاحب۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کر کے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سادہ ہے

اُردو کے اسالیبِ بیان مصنفہ نور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت، ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر کے اُردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ نور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیا کے افسانے مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات پر اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی سید حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی (آکسفورڈ) سیس ایم ریٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پراثر تالیف خلاصی کا مضمون نہایت دلچسپ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

ارباب نثر اُردو مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۱۲ر

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم اے، ایس۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی مفصلہ تاریخ ضخامت ۴۴۰ صفحے۔ سائز ۲۰×۳۲/۱۶ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۴۴ر

جواہر کلیات نظیر مرتبہ جناب مولانا ذہین وحید مختار احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد امام مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم ادبی با محاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت عہ

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے آئیں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵ر

خزینہ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ر

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۱ر

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ر

ملنے کا پتہ - انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمہ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن